دست بستہ
بانو قدسیہ

ترتیب

یہ تقریر میں نے دوما پرائز کے موقع پر پڑھی تھی۔ اسے دیباچے کے طور پر پیش کر رہی ہوں تاکہ کچھ وضاحت طلب باتیں آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔

میرے لیے یہ نادر موقع بہم پہنچانے کا انتہائی شکریہ۔ پہلے آپ نے اعزاز سے نوازا۔ پھر اس کے ساتھ گراں قدر انعام بھی مرحمت فرمایا۔ پھر ساتھ ساتھ یہ فورم بھی مہیا کیا جہاں میں اپنے گہرے تشکر کا اظہار کر سکوں۔ ان جج صاحبان کا شکریہ اس چھوٹے سے وقفے میں ممکن نہیں جنہوں نے مجھے اس اعزاز کے قابل گردانا۔

آپ کی توجہ نے جہاں میری اس قدر حوصلہ افزائی کی ہے وہاں میری ذات کو اس کا ایک اور اضافی مخفی فائدہ بھی ہوا ہے جس کا اعتراف میں آج آپ سب کے سامنے کرنا چاہتی ہوں۔ اس انعام نے ایک مختلف قسم کا آئینہ مقابل لا کھڑا کیا جس میں ایک مدت بعد میں نے اپنا اصلی چہرہ دیکھا۔ قدرت کی عجب ستم ظریفی ہے کہ کوئی شخص اپنا چہرہ دیکھ نہیں پاتا۔ وہ ہمیشہ آئینوں کا مرہونِ منت رہتا ہے۔ چاہے ٹھہرے پانیوں میں ہی عکس دیکھے، اسے مَن کو دیکھنے کے لیے تُو کی ضرورت رہتی ہے ــــ محتاج انسان سب سے زیادہ مہربان آئینوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ حسنِ اتفاق سے ایسے آئینے صرف محبت کرنے والوں کے پاس ہوتے ہیں اور وہی فنونِ لطیفہ سے وابستہ ادیبوں، شاعروں، کلاکاروں، آرٹسٹوں، مصوروں کو روشنی کے ہالے عطا کرتے ہیں۔ ڈبّہ پیر کے شخصا کو سونے کے فریم میں گلاب کے ہار پہنانے والے وہ عقیدت مند ہیں جن کی وجہ سے خود پیر صاحب کو بھی اپنے آپ کو کامل سمجھنے میں تکلف نہیں ہوتا۔ بدشکل ایکٹرس کو کیمرے کا لنز کچھ اس طور قبول کرتا ہے کہ اس کی بدصورتی تمام تر حسن میں بدل جاتی ہے اور خود اسے یقین آجاتا ہے کہ وہ دنیا کی خوبصورت ترین تخلیق ہے۔ تالی بجانے والے چھوٹے بونے کو قد آور پہلوان میں بدل سکتے ہیں۔

یہ سب آئینوں کے کرشمے ہیں۔ مشکل اس وقت پڑتی ہے جب اچانک کسی لمحے مرلن منرو کو اپنی اصل صورت کسی مختلف آئینے میں نظر آجاتی ہے۔ میر انشاء اللہ خاں پر

ذات کا عرفاں کھلتا ہے اور پاپا ہمیونگ کی ملاقات ادیب ہمیونگ وے سے ہو جاتی ہے۔

ایک تو انسان کو سنی سنائی تعریف و توصیف سے اپنے شخصا کا قد ناپنے کی عادت پڑ جاتی ہے دوسرے وہ اپنے سائے سے اپنے قد کے اندازے لگاتا ہے۔ ڈھلتی دھوپ میں تو یہ ڈراؤنے سائے لمبے ہوتے ہیں۔ لیکن جب سورج شہرت کے نصف النہار پر ہو تو اپنا سایہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور شہرت یافتہ یہ سمجھ نہیں سکتا کہ اس کے اندر وہ ساری کمزوریاں' خرابیاں' گھٹیا پن اور نقائص موجود ہیں۔ جن سے کل انسانوں کا خمیر اٹھا ہے۔

انسان اپنے پرسونا کے زعم میں اپنے آپ کو کچھ کچھ مافوق الفطرت سمجھ کر سوچنے لگتا ہے کہ شاید اس کا سایہ ہی نہیں ہے اور وہ خوبیوں کا پیکر ہے۔ مجھے بھی اس غیر متوقع سائے سے ملاقات کی امید نہ تھی۔ عجب اتفاق ہے کہ اسی انعام نے جہاں مجھے اصلی آئینہ دکھلایا وہاں ایک لمبا سایہ بھی میرے قدموں سے گریز کرتا دور جا پڑا۔ آپ نے ہی میرے اندر کے چور کو مجھ سے متعارف کرا دیا۔

بہت سال پہلے جب میں پی ٹی وی ایوارڈز سے دستبردار ہوئی تو میری انا کو بہت سہارا ملا۔ میں اپنے پرسونا کے قریب قریب جا پہنچی تھی۔ تب میرا خیال تھا کہ اگر باپ تلوار نہ رکھے تو بیٹے کے ہاتھ سیف آشنا نہیں ہوتے اور آگے چل کر رستم و سہراب کی کہانی ضرور پیش آتی ہے۔ اگر ماں کے سامنے سے آئینہ نہ ہٹے تو بیٹی کے لیے ڈیپریشن کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ جب بوڑھے مشاہیر ہر سال انعاموں کے لوٹ سیل سے عطیات اڑانے لگیں تو اس قوم کے نئے مشاہیر قد آور نہیں رہتے۔ اسی زعم تلے کہ چونکہ مَیں مَیں ہوں' میں ایک بڑا کام کر رہی ہوں نہ صرف میں نے ٹیلیویژن کے ایوارڈز سے کنارہ کشی کی بلکہ آہستہ آہستہ چھوٹی سکرین سے ہی غروب ہو جانے کی کوشش میں لگی رہی۔ لیکن تجزیہ کرنے پر یہ بھید کُھلا کہ اس عمل میں بھی سچائی نہ تھی یہ بھی نفس کا ہی دھوبی پڑا تھا۔

اچانک آپ کے انعام نے مجھے میرے اندر کے حریص چور سے متعارف کر ڈالا۔ اندر سہ پہر کے ڈھلتے سائے کی شکل بھی دکھا دی۔ انسان جیتے جی طمع' حرص' لالچ سے فارغ نہیں ہو سکتا۔ خطرہ ہر لمحہ' ہر مقام پر موجود رہتا ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ میں انعامات لینے' اعزازات وصول کرنے کی منزل سے آگے نکل چکی ہوں اور نہ مجھے انعام کا لالچ ہے نہ مدح کی خواہش۔ آپ کے انعام کی ٹارچ میرے دل کے گودام کو روشن

کر گئی۔ میں نے وہاں وہی سانپ شناخت کیا جو باغ بہشت میں سرسراتا' ترغیب دلاتا' کبھی غائب کبھی حاضر ہو جایا کرتا تھا۔ جو خود خواہش نہیں ہوتا لیکن آرزو کو اکساتا رہتا ہے۔ اس کے بغیر انسانی زوال کی کہانی مکمل نہیں ہوتی۔

مجھ پر آشکارا ہوا کہ ابھی میں بڑی عام سی زندگی میں معمولی طور پر زندہ ہوں۔ مجھے اعزاز پا کر خوشی ہوتی ہے اور میں اتنی بڑی نہیں ہوں جس قدر میرے قارئین نے سمجھ رکھا ہے۔ مجھے تعریف کی خواہش اور اپنے لیے تالی بجنے کا انتظار رہتا ہے—— سب سے بڑا تعجب مجھے یہ ہوا کہ مجھے آپ لوگوں نے یہ شبہ ڈال رکھا تھا کہ میں درویش صفت ہوں لیکن انعام کے ساتھ جو رقم نتھی ہے اس نے یہ پول بھی کھول دیا۔ اس رقم سے جو ڈھارس' خوشی اور حرص جاگی وہ خالص ایک دنیادار کا جذبہ ہے۔ اب معلوم ہوا کہ طمع کا کوّا چونچ بھر آٹا لے کر غائب تو ہو جاتا ہے لیکن تا دیر منڈیر چھوڑتا نہیں۔ حرص کا طوطا تالی بجانے پر اڑتا ضرور ہے لیکن پھر اپنی مرضی اور سانپ کی ترغیب سے لوٹ بھی آتا ہے...... یقین کیجئے کہ ابھی مجھ میں وہ قوت پیدا نہیں ہوئی کہ بازار سے تو گزرے پَر خریدار نہیں تھے۔ اعزاز اور انعام کا شکریہ تو ہے ہی اس نقاب کشائی کے لیے میں آپ کا جتنا بھی شکریہ کروں کم ہے۔ مجھے فرشتے سے انسان بنانے کا اعزاز بھی آپ کا ہے۔

جہاں تک اردو کی خدمت کا سوال ہے تو یقین جانئے یہ بھی ایک مغالطہ ہے۔ میں نے اردو کو کلہاڑا بنا کر اپنے لیے ہی لکڑیاں کاٹی ہیں۔ اس بار امریکہ کے سفر نے مجھ پر یہ راز واضح کیا کہ اردو کی اصل خدمت ملک سے باہر ہو رہی ہے اور شعوری طور پر ہو رہی ہے۔ کینیڈا' امریکہ' دوحا میں جو مشاعرے ہو رہے ہیں اور جس طرح شعراء کی پذیرائی ہو رہی ہے اس سے ہم وطن میں نا آشنا ہیں۔ آپ لوگ مسکرا مسکرا کر دامے' درمے سخنے خدمت کئے جا رہے ہیں۔ وطن میں ہم مارے حسد کے بھول گئے ہیں کہ تسبیح کے دانے کسی ایک دھاگے میں پروئے جاتے ہیں۔

کنوئیں میں اترنے والی ٹنڈیں ایک مال پر چلتی ہیں۔

سائیکل کا پہیہ اپنے مرکز کے گرد گھومتا ہے۔

مانا مختلف زبانوں کا تنوع خوبصورت چیز ہے—— ندی' نالے دریا کا باعث ہوتے ہیں لیکن وطن میں ہم تنوع کے شوق میں صرف خود رائی کے باعث اتنا جھگڑتے ہیں کہ ہم دانہ دانہ بکھرنے سے بھی نہیں گھبراتے۔ آپ لوگ مبارک ہیں جنہوں نے اردو کے

دھاگے کو سنبھال رکھا ہے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے جن کو یہ جذبہ ' سلیقہ اور توفیق ملی ہے۔ میں عرض کر چکی ہوں اردو کی اصل خدمت باہر ہو رہی ہے۔ گھر کے اندر تو ہم لوگ اتنی افراتفری' خود غرضی اور نفسا نفسی میں مبتلا ہیں کہ خدمت تو درکنار ہمیں یہ بھی بھول چکا ہے کہ یہی ایک واحد رابطے کی زبان ہے۔ اس کے بغیر کسی قسم کی ترقی ممکن نہیں۔

عام خیال ہے کہ ادیب زبان کی خدمت کرتا ہے' شاعر زبان صیقل کرتا ہے اس کی نوک پلک سنوارتا ہے' یہ بحث بہت طویل ہو سکتی ہے کہ ناچ اہم ہے یا ناچنے والا —— ہتھیار زیادہ ضروری ہے کہ ہتھیار استعمال میں لانے والا —— زبان اہم ہے کہ زباندان —— غالباً دونوں اپنے اپنے مقام اور وقت پر منفرد اہمیت کے مالک ہیں۔ یہاں میں صرف اپنے معمولی مطالعہ اور اپنے چھوٹے سے نظریئے کی وضاحت کر سکتی ہوں۔ میں نے اردو زبان کی کوئی شعوری خدمت نہیں کی۔ میں نے اسے اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے' اپنی کہانیوں' ڈراموں کو جامہ زیب بنانے' اپنے ناولوں کے تار و پود کو سیدھا کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس استعمال کے دوران بھول چوک بھی ہوئی' زیادتی بھی کی گئی اور سہواً کئی بار غلطیاں بھی سرزد ہوئیں۔ اگر زبان میں کچھ وسعت یا تراش خراش اپنی مطلب براری کے دوران سرزد ہو گئی ہو تو یہ قطعی ایک لاشعوری فعل ہے' شعوری خدمت کا حصہ نہیں۔

اگر آپ مجھے چند لمحے اپنے اس نکتے کی وضاحت کے لیے مرحمت فرمائیں تو میں یہاں تک کہوں گی کہ امریکہ کی بڑائی اس کی سائنس میں نہیں اس کی زبان میں ہے۔ امریکی سے زیادہ اس کی زبان اہم ہے۔ جب تک کوئی زبان اپنے لوگوں کی خدمت کرتی رہتی ہے' اس قوم کا ستارہ سربلند رہتا ہے۔ امریکی لوگوں نے انگریزی کو کچھ اس طور ہتھیایا ہے کہ اب انگلستان میں یہ زبان اجنبی' پسماندہ اور ٹھٹھری ہوئی نظر آتی ہے۔ امریکہ میں گھستے ہی ایک بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہاں رنگ' نسل' علاقہ' رہن سہن سب پر امریکن انگریزی حاوی ہے۔ سیاہ افریقی' خوبصورت اطالوی' شستہ فرانسیسی' نظر چرانے والا ہسپانوی' بھاری بھرکم لمبا سفید فام امریکی شب زادے سب ایک زبان کے تابع اور غلام ہیں۔ بلکہ تمام تارکین وطن جہازوں سے اترتے ہی اس زبان کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ پھر پاکستانی' ہندوستانی' جاپانی' چینی' روسی' سری لنکن اپنی اپنی بولی بولتے نظر نہیں آتے۔ اسی امریکی زبان کے سحر میں جکڑے جاتے ہیں۔ امریکن نہ کسی کا کلچر مسخ کرتا ہے

نہ کسی کے مذہب سے جھگڑا کرتا ہے بس وہ اسے اپنی زبان کا Lasso پھینک کر اجنبی' دوست' دشمن سب کو پکڑ لیتا ہے —— وہ چلتے چلتے Slang تیار کرتا ہے۔ فعل کو اسم اور اسم کو فعل میں بدلتا ہے۔ وہ سڑکوں پر Route لکھتا ہے اور اسے راؤٹ کا تلفظ عطا کرتا ہے اور کسی کو پوچھنے کی جرأت نہیں ہوتی کہ صاحب ہم تو کالونی رہ چکے ہیں۔ انگریز بادشاہ نے تو راؤٹ کا کچھ اور تلفظ دیا تھا —— جو بھی تیتر بٹیر' بھیڑیا گیدڑ' مگرمچھ' ہرن اس کے جنگلوں میں چلتا پھرتا ہے امریکن زبان میں اضافے کرتا رہتا ہے۔ اس پھیلاؤ کے عمل کا تقاضا ہے کہ زبان مزاجوں' ضرورتوں اور اندر کے مطلب کو واضح کرنے والی ہو۔ کچھ عرصہ اجنبی لفظ بازاری رہتے ہیں پھر ڈکشنری کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جاپان نے اپنی زبان کو اتنی وسعت دے رکھی ہے کہ ساری سائنس اس میں سما گئی ہے اور امریکی مانے بغیر معترف ہیں کہ جاپانیوں نے سائنس میں ان پر سبقت حاصل کر لی ہے۔

میں بھی اس بات پر نازاں ہوں کہ اردو کسی طور بھی کسی زبان سے پیچھے نہیں۔ نیویارک کا اردو مرکز ہو' کینیڈا کے مشاعرے ہوں' دوحا کے انعام ہوں۔ اردو کی پنیری جگہ جگہ لگ گئی ہے۔ اس لشکری زبان میں پھیلنے کی وہ قدرت ہے کہ ہر علاقہ' موسم' لوگ اسے قبول کر کے اسے شرف قبولیت بخشتے ہیں اور یہ زبان خاص طور پر انہیں شناخت' سربلندی اور سرفرازی عطا کرتی ہے۔

ابھی حال ہی میں یہ خبر ملی کہ متحدہ امارت میں اردو چینل شروع ہو گیا ہے۔ اب یہاں جو پہل ہوئی ہے اس کی وجہ سے یہ گوئے سبقت بھی ادھر کے لوگ لے گئے۔ اردو کی اس خدمت کا سہرا بھی تارکین وطن کے سر لگے گا۔ عجیب سی بات ہے کہ اردو کبھی آبشار کی طرح نازل ہوتی ہے' کبھی دریا کی طرح بہتی ہے' کبھی چھوٹے ندی نالوں کی طرح گنگناتی ہے کبھی سمندر کی طرح بیکراں ہو جاتی ہے۔ اس زبان میں شاعری تو تھی ہی جانسوز اب مضامین کی رفتار بھی بڑھ رہی ہے۔ جوں جوں سائنسی رجحان بڑھے گا اس کا دامن اور پھیلتا جائے گا۔ اس زبان کا کینوس بھی امریکی انگلش کی طرح وسیع ہے۔ اسے دوسری زبانوں سے حرف اٹھاتے' ان کے معنی بدلتے' معنوں کو اطراف بخشتے دیر نہیں لگتی۔ یہ متروک اور خوابیدہ الفاظ کو ہمیشہ کے لیے ترک نہیں کرتی۔ سوئے الفاظ جگا کر کندھے سے لگا لیتی ہے اور پھر بڑے پریم سے جگا بھی ڈالتی ہے —— ہم سب پر اردو کے بڑے احسانات ہیں۔ یہ کبھی ہاتھ باندھ کر سیوا کرتی ہے'

کبھی ماں جیسی مامتا دکھاتی ہے، کبھی شاہوں کے روپ میں تلوار چلاتی ہے پھر بابوں کی زبان میں ڈھل کر دکھ درد ہرن کرتی ہے۔ کبھی جنگل جنگل، بیلا بیلا میرا بائی بن کر ناچتی پھرتی ہے۔ جس اردو کے اتنے روپ سروپ ہوں میں انا کی ماری ادیب اس کی کیا خدمت کروں گی؟ پتہ تو یہ چلا کہ ہم تو اپنی ہی خدمت کرانے کے لیے آئے تھے کسی اور کی خدمت کرنے کی امید اپنے سے کیا رکھیں؟

میرے دل میں تو خیال رہتا ہے کہ اگر میں انگریزی میں لکھتی تو آج میری رائلٹی Millions میں ہوتی۔ شاید مجھے نوبل پرائز بھی مل جاتا۔ میں تو آرزومند ہوں کہ شاعری کا ڈھب ہی سیکھ لیتی تو گرمیوں کا سارا سیزن بیرون وطن مشاعروں میں گزارتی۔ میرے ذہن کو تو یہ وسوسہ بھی رہتا ہے کہ اگر پنجابی کے صوفی شاعروں کے تتبع میں شاعری کرتی تو شاید میں بھی لافانی ہو جاتی ــــ مجھ جیسا بہروپیہ کیسے یک درگیر اور محکم گیر ہو جانے کا دعویٰ کرے ــــ میرے اندر کی تو حرص ہی مجھے سوائے 'اپنے' کسی کی خدمت کرنے نہیں دیتی۔ پھر اردو کی خدمت کا جھنڈا لے کر کیسے چلوں؟

آج کے بیشتر ادیبوں کا المیہ ہے کہ قارئین نے انہیں اولمپک ٹارچ تو پکڑا دی ہے لیکن ادیب بیچارے اولمپس تک پہنچ نہیں پاتے اور دائرے کا سفر اختیار کر لیتے ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے ادیب صرف آدرشوں کے سہارے جیتے تھے۔ اب ان کے خواب اور مادے کی زندگی دوراہے پر ہے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی کہ ان دو پٹڑیوں پر اپنے ادب کی ریل گاڑی کو کیسے سیدھا رکھیں۔ جو ادیب بقول واصف صاحب عاقبت موسیٰ کی اور زندگی فرعون کی چاہتا ہو اس سے آپ کیا امید رکھ سکتے ہیں؟ تضاد کا مارا ہوا سوسائٹی میں بھی تضاد ہی کی پنیری لگا سکتا ہے۔ یقین جانئے اس سے مشعل برداری کی امید بیکار ہے؟ پھر بھی آپ سے استدعا ہے کہ ہمیں چھوڑیئے گا نہیں ہم لوگ آپ کی واہ واہ کے بغیر کچھ بھی نہیں ہیں۔ عین ممکن ہے یہی اعزاز آگے چل کر ہمیں تضاد سے بھی چھٹکارا دلا دے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ و ناصر

بانو قدسیہ

20/9/2000

داستان سرائے

تدبیرِ لطیف

گودام کے دروازے پر رُک کر ملک احتشام نے کہا...... "آج وہ پھر مجھے ملا تھا" گودام کے اندر چالیس واٹ کے بلب کی روشنی میں وحیدہ ایک پرانے لوٹے کو غور سے دیکھنے میں مشغول تھی۔ قریباً چالیس برس سے پیتل کا لوٹا اس گودام میں رہتا تھا۔ اس کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ ٹونٹی سے پانی کم کم نکلتا تھا اور فرش پر رکھو تو ٹیڑھ میں نظر آتا تھا۔ لوٹے کو اٹھائے وحیدہ دروازے کے پاس آئی۔

"ذرا گیس (Guess) کریں تو...... یہ لوٹا کتنا پرانا ہے......؟

"وہ مجھے لبرٹی میں ملا تھا پھر ہم دونوں باغ میں چلے گئے وہاں بڑی دیر تک وہ پرانی باتیں کرتا رہا......"

"ہم بھلا کونسی نئی باتیں کر سکتے ہیں؟...... اسے دیکھئے کتنا پرانا لوٹا ہے آپ کے خیال میں......" وحیدہ نے کہا۔ ملک احتشام نے لوٹے کو ہاتھ میں لیا دیر تک اسے پھیر پھرا کر دیکھا پھر منہ سے کچھ بولے بغیر اس نے لوٹا تپائی پر رکھ دیا، تپائی پر پڑا لوٹا ہنستا ہوا کاکا سا لگ رہا تھا۔ وحیدہ کو یہ حرکت ترک ادب سے مماثل لگی وہ دونوں ابھی الگ الگ راستوں پر چل رہے تھے۔

"کیا کر رہی ہو تم اس بند گودام میں...... ہیں وحیدہ؟......"

"کچھ نہیں جی...... بس کچھ غیر ضروری اشیاء نکالنا چاہتی تھی...... اب تو اس میں گھُسنے کی جگہ بھی نہیں رہی۔"

"چھانٹی کیسے کرو گی بھلا...... چالیس برس کا کباڑ کیسے نکال پھینکو گی۔"

"ہاں یہی تو مشکل ہے' جس چیز کو پھینکنا چاہتی ہوں وہی بہت ضروری لگتی ہے۔ جی میں تھا یہ لوٹا مائی ہاجراں کو دے دوں۔ پھر خیال آیا کہ یہ لوٹا تو اماں تب لائی تھیں جب خلیل پیدا ہوا تھا......"

"یہی تو سارے بکھیڑے ہیں وحیدہ اپنی زندگی کا کونسا ایکشن ری پلے دیکھیں اور کونسا باہر پھینک دیں......"

"بہتر تو یہی ہے کہ ایک نئے گھر میں شفٹ کر جائیں اور یہ...... یہ پرانا سامان یہیں چھوڑ جائیں۔ سارے کا سارا۔" وہ دونوں کپڑے کپڑے ملتے ہلاتے بیڈ روم کے ساتھ والے لونگ روم میں چلے گئے۔ بات کئے بغیر وہ ایک دوسرے کے آگے پیچھے ڈھیلے ڈھالے پرانے فیشن کے کپڑوں میں ملبوس اس نیم بیٹھک' ہاف ڈائننگ روم' ہاف بیڈ روم میں آکر ٹھہر جاتے تھے۔ بوڑھی بطخ وحیدہ اپنے مخصوص صوفے میں دبک جاتی اور ملک احتشام کین کی گول کرسی میں بیٹھ جاتے۔ کبھی کبھار جب کوئی مہمان ان کی پسندیدہ سیٹوں پر بیٹھ جاتا تو انہیں بہت تکلیف ہوتی اور وہ اپنے ہی گھر میں اکھڑے اکھڑے سے ہو جاتے...... انہیں اپنی جگہوں کی عادت پڑ چکی تھی۔ اپنا تکیہ بستر' کرسی' پلنگ' پلیٹ ان کی عادتیں بن چکی تھیں۔

"آپ ڈاکٹر اکبر سے ملے تھے......؟"

"ہاں......"

"اسے الٹرا ساؤنڈ کا رزلٹ دکھایا......"

"دکھایا......"

"اور ہولٹر ٹیسٹ......"

"بھئی سب کچھ دکھایا تھا' ای سی جی کی رپورٹیں' پی ٹی ٹی کا ٹیسٹ...... ایکس رے......"

"پھر؟......"

"پھر کیا......" ملک احتشام نے اپنی گھگھی سی بڑھیا پر نظر ڈالی۔ ایک زمانہ تھا جب یہ عورت اسے مدھوبالا سے مشابہہ نظر آتی تھی۔ اب غلافی آنکھیں سوجی ہوئی' بُوٹا سا قد خمیدہ' کولہے بھاری' بوئیاں چھٹی ہوئی اور ہاتھ کھردرے تھے۔ لیکن عجیب سی بات تھی ملک احتشام کو یہ نک طوطی' قدرے بھینگی' کبی عورت جوانی میں اتنی اچھی نہ

لگی جس قدر اب لگتی تھی۔ حسن کے رخصت ہوتے ہی معاً ملک افتخار اس کے کردار پر مر مٹے' وحیدہ بیگم اب ملک احتشام کی چھڑی تھی۔ اس کے بغیر انہیں راستہ نہ ملتا۔ وہ اپنا بیلنس قائم نہ رکھ سکتے۔ اگر وحیدہ موجود ہوتی تو ان کی یادداشت واپس آ جاتی' سماعت بھی نارمل رہتی' بھوک بھی لگتی' ذائقے بھی ابھر آتے۔ چلنے میں دقت نہ ہوتی۔ لوگ خود غرض' خوشامدی' ہیر پھیر کرنے والے نہ لگتے۔ وحیدہ ان کے لیے یوں بھی بہت ضروری تھی کہ اس کی کفالت کرتے ہوئے ملک صاحب اپنی اہمیت سے سرشار رہتے' ورنہ اب دنیا انہیں اہمیت دینا تو کیا درخور اعتنا بھی نہ سمجھتی تھی۔ جب کبھی وہ جوانوں میں بیٹھتے تو ان کو لگتا وہ ساری نئی انفارمیشن سے نا آشنا ہیں۔ بوڑھوں میں جگہ ملتی تو نہیں لگتا کہ بوڑھے زنگ آلود' گھن لگے' خیالات پارینہ سے ٹھسے ہوئے۔ جھکی' جھگڑالو' کھنڈرات سے مشابہہ کوئی قصۂ پارینہ تھے...... بوڑھوں کو دیکھ کر انہیں کبھی یقین نہ آیا کہ وہ بھی ان کے ہم شکل اور ہم عمر ہیں۔ انہیں تو اس بات کا بھی یقین نہ تھا کہ پچھلے ہارٹ اٹیک کے بعد اب زندگی کے امکانات کم ہیں۔ ڈاکٹر اکبر انہیں کئی بار کہہ چکا تھا کہ اب مانگے کی زندگی کا اعتبار کیا؟ لیکن اس وقت دونوں پاس پاس بیٹھے تھے۔ دیوار پر ٹنگی شادی کی تصویر کا ان سے کوئی تعلق نہ لگتا تھا۔ اندر ہی اندر کہیں امید پھر بھی ٹمٹماتی تھی۔

"پھر کیا کہا ڈاکٹر نے؟......"

"وہی بات...... جو پہلے کہی تھی......"

"پاگل ہے...... کلینک کو بزنس کی طرح چلا رہا ہے...... اتنے ٹیسٹ ہر بار لکھ دیتا ہے میں آپ کو بتاؤں آپ ڈاکٹر اکبر کو اتنی سنجیدگی سے نہ لیا کریں...... کوئی کسی کی موت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"وحیدہ......" وہ اذان دینے والے مرغے کی طرح چھاتی تان' گردن اکڑا کر بیٹھ گئے۔ وحیدہ کے مجازی خدا تو وہ پہلے دن سے تھے۔ اب اس کا خدا بن جانے پر انہیں زندہ رہنے کا سب سے بڑا جواز مل گیا۔ میرے بغیر اس بڑھیا کا دنیا میں کون ہے؟ اللہ اس کی خاطر مجھے زندگی دے......

"وحیدہ......"

"جی...... میں سن رہی ہوں......"

"آج میں اس سے پھر ملا۔ میں لبرٹی میں دوائیوں کی دکان سے نکل رہا تھا تو میں نے دور سے ایک دھبّہ سا اپنی طرف بڑھتے دیکھا......"

"جی......"

"قریب آیا تو وہی تھا۔ ہاتھ میں گولف کی سٹک' پورا امریکن لگ رہا تھا۔ اونچا لمبا گورا چٹا......جینز اور سپورٹس سوٹ میں ملبوس...... یہ امریکن بھی عجیب چیز ہیں......"

"ہاں جی ان کا ستارہ عروج پر ہے......"

اب ملک احتشام کو وہ شخص بھول گیا جسے وہ گلبرگ میں ملا تھا۔ اسے وحیدہ ایک Audience کی شکل میں مہیا ہو گئی۔ اس کے نظریات کو نوجوان دلچسپی سے نہ سنتے تھے لیکن وحیدہ ہمہ تن گوش اس کی دانش پر سر دھننے کی عادی تھی۔

"میرا خیال ہے ہر انسان......اور ہر قوم کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ محبت اور آزادی کے درمیان جھگڑا ہے۔ جو قومیں یا جو فرد آزادی کا چناؤ کرتے ہیں۔ انہیں محبت کم کم ملتی ہے اور جو لوگ محبت کے حق میں فیصلہ کرتے ہیں وہ آزادی کی نعمت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہی بنیادی فرق ہے مغرب اور مشرق کا...... مغرب والوں نے آزادی کے حق میں ووٹ دے دیا ہے۔ وہاں چھوٹے چھوٹے اپارٹمنٹس میں سولہ سولہ برس کی لڑکیاں آزادی کے ساتھ تنہا رہتی ہیں۔ گھروں میں ملازمین نہیں ہوتے' جوائنٹ فیملی سسٹم ٹوٹ چکا ہے' طلاق کی شرح بڑھ گئی ہے۔ دوستی نایاب۔ رشتے فروعی...... یہ وہاں فرد کا بھی فیصلہ ہے اور قوموں کا بھی...... وہ اپنی آزادی کے لیے تنہائی کا کرب سہتے ہیں۔ لیکن اپنی زندگی کی لگام کسی اور کے ہاتھوں میں نہیں دیتے...... ہم لوگ سب سے زیادہ تنہائی سے خوفزدہ ہیں۔ جوائنٹ فیملی سسٹم' جاگیرداری نظام' بڑے بڑے گھروں میں ملازمین کی یلغار...... ہم اور کچھ نہیں تو کسی نوکر سے ہی بات چیت کر کے اپنی تنہائی کم کر لیتے ہیں...... ادھر بھائی چارہ' پیار محبت بہت ہے وحیدہ...... لیکن آزادی نہیں ہے۔ دوسروں کی دخل اندازی' چغلی غیبت' جھگڑے مقدمے سب کچھ اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ ہمیں دوسروں کی ضرورت ہے۔ ہم تنہائی کے اژدھے سے خوفزدہ ہیں اور وہ سب کچھ کر بیٹھتے ہیں جو کسی اور کی تجویز ہوتی ہے۔ لیکن خود اپنے جہنم یا بہشت کی تشکیل نہیں کر پاتے......"

وحیدہ نے ہولے سے ملک افتخار کا ہاتھ تھپتھپایا......

"سنیئے ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ آپ زیادہ باتیں نہ کریں...... مشتعل نہ ہوں آپ کے لیے اچھا نہیں۔"

"ڈاکٹر اکبر تو آج یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اگر آپ اپنی بیٹی کو ملنے سعودیہ جانا چاہیں تو چلے جائیں میں آپ کو زیادہ مہلت نہیں دے سکتا۔ ٹیسٹ ٹھیک نہیں نکلے......جو چاہیں جلدی جلدی کر لیں۔" وحیدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"بکتا ہے......ڈاکٹری کم بزنس زیادہ۔"

"بکتا تو ہے لیکن اب وقت نہیں ہے وحیدہ......اب میرے جبڑوں میں جب درد ہوتا ہے تو نائیٹروگلیسرین کی گولیوں سے رکتا نہیں...... ٹھیک کہتا ہے زیادہ سے زیادہ تین چار مہینے اور......" وحیدہ نے خوفزدہ ہو کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ملک احتشام کو لاڈ کا یہ طریقہ پسند تھا۔ اب تو ان کی بیٹی کلثوم بھی جب سعودیہ سے آتی اپنے بچوں میں ہی الجھی رہتی' باپ کے پاس بیٹھنے کا کوئی وقت ہی نہ تھا۔ بازاروں کے چکر' رشتے داروں کے ڈنر لنچ' درزی کے دربار کی حاضری میں چھٹی گزر جاتی۔ کلثوم کے پاس وقت ہی نہ ہوتا کہ وہ ماں باپ کے پاس بیٹھ کر ان کی زندگی کے متعلق کچھ جان سکتی۔ بچوں کا باب ختم ہوئے بغیر بند ہو چکا تھا۔ خلیل بیٹا کبھی کبھار فون کر لیتا تھا لیکن برسوں سے اسے پاکستان آنے کی توفیق نہ ہوئی تھی۔

"اگر مجھے کچھ ہو گیا تو یہیں رہنا...... کہیں خلیل یا کلثوم کے پاس نہ چلی جانا......"

"پھر وہی بات......"

"وہ تمہیں بچوں کی گورنس بنا لیں گی...... تمہاری بیٹی اور بہو......دونوں۔"

"ملک صاحب کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ کیسی گورنس؟......اپنے بچوں کا بھی کوئی بوجھ ہوتا ہے بھلا؟"

"کلثوم کی زندگی میں بچوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے وہ اٹھتے بیٹھتے جاگتے سوتے ایک گز سے دنیا ناپتی ہے بچوں کا پیمانہ...... ماں باپ اس کے لیے اضافی چیز ہیں۔"

"ایسا نہیں ہے ملک صاحب۔ زندگی کے تقاضے بدل گئے ہیں۔ ہم نے کلثوم کو مستقبل کے لیے تیار نہیں کیا۔ ہم نے اسے پالا پوسا' کچھ قدریں' کچھ رسم و رواج' کچھ

اللہ رسول کی باتیں سمجھائیں' واجبی بی-اے کرایا اور بیاہ دیا...... ہم نے اسے آج کی ترقی کے بارے میں کچھ نہ سمجھایا نہ اس کی تربیت کی۔"

"تو اور کیا کرتے ہیں ماں باپ......؟" ملک افتخار غصے سے بولے۔

"نہیں نہیں اب زمانہ بدل گیا ہے تقاضے اور ہیں۔ یہ عہد' تقابل' مسابقت' حسد اور دولت کا ہے...... اس میں اگر ماں باپ ڈھیلے پڑ جائیں تو بچے زندگی کے دائرے کو مماس کی طرح چھو کر کہیں کے کہیں جا نکلیں گے...... بیچارے خلیل کو وقت نہیں ملتا مغرب میں زندگی کی رفتار بہت تیز ہے۔ دل کا اچھا ہے۔"

"یہ ماں بول رہی ہے ماں' ٹھیک ہے میری نصیحت ہے میرے مرنے کے بعد بچوں کے گھر نہ رہنا...... یہیں ٹھیک ہے اپنے گھر میں......"

"اچھا جی......"

وہ دونوں چپ ہو گئے۔

پھر ملک احتشام نے اٹھ کر اپنی ہارٹ کی دوائیاں بڑے اہتمام سے گھڑی دیکھ کر پی لیں۔ وحیدہ نے کھڑکی میں سے باہر لان کی طرف دیکھا......

بھلا اس چھ کنال کی کوٹھی میں وہ اکیلی کیسے رہ سکتی ہے؟ اب تو مالی بھی اس کا حکم نہیں مانتا تھا۔ کئی کئی دن ڈرائیووے پر خزاں دیدہ پتوں کا ڈھیر پڑا رہتا نہ مالی کو خیال آتا نہ جمعدارنی کو...... وحیدہ بھی اپنے بلڈ پریشر کے ہاتھوں نہ باورچی خانے کے چکر لگا سکتی نہ باہر کی صفائیاں ہی دیکھ پاتی۔ کبھی کبھی تو اس کے گھٹنے اتنے سوج جاتے کہ کئی دن بستر سے اٹھ کر غسل خانے تک جانا ایک مہم بن جاتا۔

"چھ بیڈ روم کی کوٹھی اب بالکل بیکار سی نظر آتی ہے ملک صاحب...... دیواروں کے کلاک چھتوں کے فانوس' پیتل کا سامان' قالین...... اتنا سامان انسان کیوں اکٹھا کر لیتا ہے۔"

"سامان کے بغیر بھی تو کام نہیں چلتا...... وحیدہ۔"

"ہاں...... سامان کے بغیر بھی تو آدمی جی نہیں سکتا ملک صاحب......"

وہ دونوں بغیر ایک دوسرے کو کچھ بتائے اٹھ کر بیڈ روم میں چلے گئے......

گیلری میں کائی کی سی خوشبو آئی۔

ٹھہرے پانیوں پر جمی کائی کا گھٹا گھٹا سانس......

بیڈ روم میں پہنچ کر ملک لمبے صوفے پر نیم دراز ہو گئے۔

وحیدہ نے بیڈ روم سلیپر پہنے پھر انہیں اتار دیا۔ وہ صوفے پر ملک صاحب کے پاس نہ بیٹھی۔ معاً اسے خیال آیا کہ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ نیند کا وقت ہو چکا تھا لیکن نیند کوسوں دور تھی۔ وہ تکیے پر کہنی ٹیک' ہتھیلی پر سر ٹکا' پلنگ سے پشت لگا' نیم دراز ہو گئی۔ دونوں سونا چاہتے تھے لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

"اب آپ سیر کے لیے بھی نہیں جاتے' پتہ ہے ناں ڈاکٹر اکبر نے ورزش کے لیے کتنی تاکید کی تھی؟"

"بس اس بار اس نے یہ تاکید بھی ختم کر دی وحیدہ۔ دو بائی پاس تو ہو چکے۔ اب کب تک دل ساتھ دے گا؟"

"آج آپ نے کھانے پر کچھ بد پرہیزی کر لی ہے......"

"اب کوئی فرق نہیں پڑتا...... کھانے پینے دو مجھے...... وقت کم ہے میرے پاس......"

"کولیسٹرول بڑھ جائے گا......"

"وحیدہ اب ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا...... اگر کوئی تجویز ہے تو وہ یہ ہے کہ دائمی جدائی کے بعد تمہارے لیے کیا پلاننگ ہو گی......؟ تم کو سہاروں کی عادت پڑ گئی ہے کس کے سہارے جیو گی میرے بعد؟"

"اب آپ اس قدر پلاننگ بھی نہ کریں ملک صاحب...... اللہ مالک ہے۔"

"مالک ضرور ہے لیکن اس نے ہمیں سعی اور جدوجہد کے لیے بھی تلقین کی ہے......" وحیدہ کا خیال تھا کہ جدوجہد' سعی مسلسل انسان کو دوسرے جہاں کے لیے کرنا چاہیے اور اس دنیا کی ترقی اللہ پر چھوڑ دینی چاہیے جو بعض کو بعض پر ترجیح دیتا رہتا ہے اور جس کی منطق کوئی بھی اپنے الا قلیلا علم کے ساتھ سمجھ نہیں سکتا۔

وحیدہ خاموش ہو گئی...... وہ گفتگو کو مناظرے کی شکل دینا نہیں چاہتی تھی۔

ملک صاحب چھوٹی سی بات پر بہت زیادہ مشتعل ہونے کے عادی تھے اور وحیدہ میں اب غصے ور لوگوں کے ساتھ نپٹنے کی جان نہ تھی وہ بلڈ پریشر کے ہاتھوں مجبور تھی۔

"وہ مجھے آج پھر ملا تھا...... اس کی چھٹی کا صرف مہینہ باقی رہ گیا ہے......"

وحیدہ خاموش ہو رہی۔ اس نے تکیے تلے سے تسبیح نکال کر اس پر سورہ اخلاص پڑھنا

شروع کر دیا۔ ایک عرصہ سے اسی ذکر نے ڈھارس بندھا رکھی تھی۔ اس کا ایمان تھا کہ جب تک وہ اپنے اللہ کے حضور گڑگڑاتی رہے گی ملک احتشام کو کچھ نہیں ہو گا۔ ڈاکٹروں کی بخشی ہوئی ناامیدی کے سامنے ایک ہی ڈھال پر اس نے بھروسہ کر رکھا تھا۔ وہ مذہب سے کوسوں دور تھی۔ اسے مسئلے مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ قرآن بھی وہ صرف روزوں میں پڑھتی لیکن جب سے ڈاکٹر اکبر نے اسے دھڑکا دیا تھا اسے تسبیح پھرانے میں ایسی تشفی ملتی گویا اس کے مرحوم اباجی پاس بیٹھ کر ہاتھ تھپتھپا رہے ہوں۔

وحیدہ کے خاموش ہوتے ہی ملک نے ٹائمز رسالہ اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر وہ ایکٹرسوں کے سکینڈل سے متعلقہ خبریں پڑھتا رہا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ جو کچھ وہ پڑھتا ہے ساتھ ساتھ بھولتا بھی جاتا ہے۔ کوئی نام جگہ' واقعہ پورے طور پر رجسٹر نہیں کرتا۔ وہ پڑھی ہوئی خبر کو صحت بیان کے ہمراہ دوبارہ کسی کے آگے دوہرا نہیں سکتا۔ ساری خوبصورت جزئیات اور قابلِ ذکر کڑیاں ذہن سے اتر جاتیں اور کسی کے آگے بیانیہ میں آ...... آ...... کا سہارا لینا پڑتا۔ بار بار یادداشت پر زور ڈال کر سوچنا پڑتا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا؟ اور کیوں کہہ رہا تھا اور جس کا ذکر تھا اس کا نام کیا تھا؟

ملک صاحب نے بظاہر رسالے پر نظریں جمائے رکھیں لیکن دل میں سوچنے لگا کہ شاید یادداشت کی یہ اکھاڑ پچھاڑ اس لیے ہوئی کہ کسی سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ آج سے دس سال پہلے اس گھر میں لوگوں کا ایک تانتا بندھا رہتا تھا۔ اس کی سیاسی زندگی اتنی مصروف تھی کہ ووٹروں' ورکروں' ہم خیال دوستوں' پارٹی کے ہم نواؤں کے ٹولے گھر پر یلغار کرتے رہتے۔ عموماً گھر کا ڈرائیو وے کاروں سے بھر جاتا۔ کبھی کبھی باہر سڑک پر بھی کاریں اتنی زیادہ ہوتیں کہ شبہ ہوتا کہ گھر میں کوئی مرگ ہو گئی ہے۔ جلسہ' جلوس' میٹنگ' بحث مباحثہ میں الجھے ہوئے ہر رنگ اور عمر کے سیاسی دوست جانکار رات گئے تک آتے تھے۔ تحریکیں' مینڈیٹ' نئے بجٹ کا اسارنا' پچھلے کی مین میخ' تجویزیں' ہٹ دھرمیاں' خیالی پلاؤ' حقیقتوں کی نمائشیں جوشیلی تقریروں کا جوڑ توڑ' بند کمروں کی پلاننگ' دھرنے کی تیاریاں' احتجاج کے طریقے...... ملک کی کوٹھی شہد کے چھتے کی طرح بھنبھناتی رہتی...... ملک اس مصروف زندگی میں یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کبھی وہ اس قدر خاموشی کے سپرد ہو جائے گا...... وہ تو ٹرکوں پر سوار' کھلی چھت والی کار میں سے آدھا دھڑ نکال کر دھاڑنے والا شیر تھا۔ سرگودھے کے لوگوں کا ساکتابی

چہرہ' لمبی ناک' ڈھلکی مونچھیں' چوڑا سینہ اور گرج دار آواز ابھی تک لوگوں کو یاد تھی۔ لیکن اب پارٹی کے لوگ رخصت ہو چکے تھے۔ پہلی بار جب امریکہ سے بائی پاس کروا کر وہ لاہور پہنچا تو آدھا میل کا جلوس اسے ایئرپورٹ لینے آیا۔ لیکن دوسری مرتبہ جب ملک لندن سے لوٹا تو ایئرپورٹ پر گنتی کے لوگ تھے۔

دوسرے دن اخبار میں بھی کوئی خبر شائع نہ ہوئی...... اس کا سیاسی کیریئر کچھ دیر مخدوش رہا۔ پھر ڈاکٹروں کے مشورے پر اس نے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا...... بھیڑ چھٹنے لگی۔ جن لوگوں کے لیے اس نے کئی اصول ذبح کیے۔ جن دوستوں کو اوپر لانے میں جوڑ توڑ کی۔ ہولے ہولے اپنی راہوں پر چل دیئے...... اپنی سیاسی پارٹی کے اجلاسوں میں وہ شرکت کرتا تو رہا لیکن لوگ اس کی صحت کے متعلق پوچھ کر خاموش ہو جاتے۔ جب کبھی وہ ووٹنگ میں شرکت کرتا تو پارٹی والے اس کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے کے لیے کبھی نہ آتے...... کچھ دیر عضو معطل کی طرح پارٹی کے ساتھ لٹکے رہنے سے ملک میں عجب قسم کی بے اعتمادی اور احساس کمتری پیدا ہو گیا...... ساری جوانی جن دوستوں کی خاطر رشتہ دار چھوڑ دیئے تھے ان سے آنکھیں چرانے کا وطیرہ اختیار کیا تھا۔ ان رشتہ داروں سے رابطہ بڑھانے کی کوشش کی لیکن وہ پہلے ہی ملک کو بلیک لسٹ کر چکے تھے۔ جوانی میں ان کی آمد کو ملک احتشام تضیع اوقات سمجھتا رہا۔ اب رشتہ داروں نے اسے جھکی ناکام بڈھا سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ اب تو شادی کے کارڈ بھی نہ آتے...... مرگ کی اطلاع اسے شاذ ہی دی جاتی...... یوں سوشل سرکل سے کٹ کر وہ وحیدہ کے ساتھ چپک گیا...... وحیدہ اس کا ہومیوپیتھک علاج تھا۔ جو ہمیشہ Syndrowes کو سمجھ کر کیا جاتا۔ وحیدہ کو یہ معلوم نہ تھا کہ ملک احتشام کس بیماری سے گھل رہے ہیں۔ وہ ان کی بیماری کی کچھ نشانیاں سمجھ کر ان کو مٹانے میں مشغول رہتی۔ بد ہضمی سے بچاتی' ہلکا پھلکا آئل فری کھانا تیار کرتی۔ سوپ یخنی' بوائلڈ سبزیاں سلاد میز پر ضرور ہوتے...... سیر کے لیے اکساتی...... لیکن سب سے زیادہ وہ ملک احتشام کو تشویش' فرسٹریشن' ڈپریشن سے بچانے کی کوشش میں مصروف رہتی' ایک مرتبہ وہ اکیلی ڈاکٹر اکبر کے کلینک گئی۔ حسن اتفاق سے کلینک پر بھیڑ نہ تھی ڈاکٹر کو بھی معالج بننے کا وقت مل گیا۔ اس وقت وہ پیسہ بنانے والی مشین نہ تھا۔

"مجھے یہ بتایئے میں ملک صاحب کی کیسے مدد کروں...... کس طرح ان کی

تکلیف میں میری وجہ سے کمی واقع ہو۔"

پہلے تو ڈاکٹر نے انہیں دل کے مریضوں کا ڈائیٹ چارٹ دیا۔ پھر دیر تک ہلکی پھلکی ورزش کے فوائد بیان کیے۔ نیند اور آرام کی ضرورت پر لیکچر دیا اور آخر میں بولے "بیگم صاحبہ دل اور انجائنا کے مریض کو سب سے زیادہ ذہنی آرام کی ضرورت ہوتی ہے اسے سکون' اطمینان اور خوشی مہیا کرنا اہم ہے۔ بلاوجہ Exeitement یا ناراضگی اور سب سے زیادہ ایسی سچویشن جس میں فرسٹریشن یا ڈپریشن سے مقابلہ ہو ایسے مریض کے لیے مہلک ہو سکتا ہے۔" وحیدہ ڈر گئی...... اسے چھ کنال کی بڑی کوٹھی میں اکیلے رہ جانے کا خوف تھا۔

"آپ کوشش کریں کہ کام ان کی مرضی اور پسند کے مطابق ہوں۔ جو کچھ ملک صاحب چاہیں کر دیں۔ جو مانگیں لا دیں...... میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اگر وہ کوئی غلط فرمائش بھی کریں تو پوری کر دیں تا کہ ملک صاحب کسی قسم کا دباؤ محسوس نہ کریں۔ ایسے مریض کو پالنے کا ایک ہی گُر ہے...... انڈے کو روئی میں رکھیں۔"

وحیدہ نے گھبرا کر ڈاکٹر اکبر کی طرف دیکھا۔

آخر وہ بھی تو مریضہ تھی۔ آرتھرائٹس اور بلڈ پریشر نے اس کا بھرکس نکال دیا تھا۔ چلنے پھرنے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو بلڈ پریشر اتنا زیادہ ہوتا کہ سر چکرانے لگتا۔ آنکھوں میں خون اتر آتا۔

"اب ڈاکٹر صاحب میرے پاس بھی اتنی روئی نہیں ہے کہ احتشام صاحب کو ہر لمحہ لپیٹ کر رکھوں...... ان کا غصہ برداشت کرنے والی میں گھر میں اکیلی ہوں......"

"یہ آپ کی مرضی ہے۔ دل پھیل چکا ہے۔ دل کی دو نالیاں سو فیصد بند ہیں۔ اگلے بائی پاس کی کوئی صورت نہیں...... احتیاط ہی سارا علاج ہے اب تو......"

"میں بھی کیا کروں...... کیسے انہیں خوش رکھوں؟"

"دیکھیے' ملک صاحب سب سے زیادہ آپ پر اعتماد کرتے ہیں۔ اس اعتماد کو کسی طرح مجروح نہ کریں انہیں غلطی سے بھی Conteadiet نہ کریں۔ مرد اس عمر میں آ کر اپنی بیوی کا ہو کر رہ جاتا ہے کچھ بیوقوف نئی شادی کر لیتے ہیں۔ نئی بزنس...... نقل مکانی' نئی نوکری نیا گھر۔ لیکن کوئی نئی چیز پرانے آدمی کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتی۔ بابا گھبرا کر پرانے دوستوں کو آواز دیتا ہے بچھڑے رشتہ داروں کی طرف بھاگتا ہے...... یہ

سنگ میل ضرور ہیں لیکن ماضی کے...... ایک بیوی کام آتی ہے...... وہ بھی اگر بچوں سے فارغ ہو چکی ہو تو...... ورنہ ماضی حال کے کام نہیں آتا...... بڈھے کا کوئی سہارا نہیں...... لٹی ہوئی پتنگ کی طرح بیوی بھی بچوں کے ہاتھ آتی ہے۔ بڈھے کے نہیں......"

"اللہ نہ کرے...... میں بچوں کا ساتھ دوں" وحیدہ بولی۔

"عورت اندر سے مضبوط ہوتی ہے اس کا رشتہ دنیا سے قائم رہتا ہے لیکن مرد کبھی رابطوں کا پاسبان نہیں ہوتا...... بس اس کا ہر رابطہ جزوقتی ہے۔ کام سے بچ بچا کر آنکھیں چرا کر کچھ رابطے پال لیے...... عورت جب بھی کوئی تعلق بناتی ہے بڑے سلیقے سے ہمہ وقت اس کی نگرانی کرتی ہے...... اب آپ ہی ملک احتشام کا واحد سہارا ہیں جو وہ کہیں...... آپ اسے مان لیں...... جھگڑے بحث مباحثے سے گریز کریں۔"

"جھگڑا تو ہم میں پہلے بھی کبھی نہیں ہوا ڈاکٹر صاحب......"

پرانے وقتوں' لوگوں اور واقعات کی باتیں دہراتے بالآخر وہ ایک بجے کے قریب ریچھ کے بچوں کی طرح سو گئے...... نیند بھی عجب بے وفا ثابت ہوئی تھی۔ ساری رات لکن چھپن کھیلتی اور سارا دن اونگھ بن کر آئے چلی جاتی۔ کبھی کرسی پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں' کبھی صوفے پر سر سینے پر ڈھلکتا جاتا...... سردیوں میں دھوپ سینکنے بیٹھتے تو پینک میں چلے جاتے۔ گرمیوں میں پنکھے کی ہوا میں سرت بھول جاتی...... باتیں کرتے کرتے غائب۔ اچانک آنکھ کھل جاتی تو بات کا سرا پکڑنا مشکل...... آ...... آ کر کے شامل ہونے پر نہ شہروں کے نام یاد آتے نہ انسانوں کے...... ساری بات بے معنی اور بے لطف ہو کر رہ جاتی۔ ملازم اس بگڑی یادداشت کا فائدہ اٹھاتے جس ملک احتشام کے آگے بڑے بڑے منسٹر بات کرتے گھبراتے تھے' اب ان سے جمعدارنی بحث میں جیت جاتی۔ گھر کی چیزیں غائب ہونے لگیں تو کسی سے پوچھنا بیکار تھا کہ الٹا آپ کی پیشی لگ جاتی۔ باورچی خانہ تو خیر ایک مسلسل چوری گھاٹ تھا کہ وہاں رکھی ہوئی چیزیں چھو منتر غائب ہو جاتی تھیں لیکن غسل خانے بھی محفوظ نہ تھے۔ صابن' بلیچ' جھاڑو' جھانویں کا ہی بکھیڑا پڑا رہتا۔ گیراج میں سے گھاس کاٹنے والی مشین غائب ہو گئی۔ پوچھتے پوچھتے ملک صاحب خود چور سا محسوس کرنے لگتے۔ ڈرائیور بھی طرفہ تماشا تھا۔ گاڑی سے پہلے ٹول بکس غائب ہوا پھر سائیڈوں والے

شیشے اتار لیے گئے۔ ہائی وے کا سفر درپیش ہوا تو پتہ چلا سٹپنی بھی موجود نہیں۔ ایک وائپر ٹوٹا تو دوسرا ورکشاپ میں کسی نے اتار لیا۔ ڈرائیور کے ساتھ سرد جنگ جاری تھی۔ اول تو ملک صاحب کو کہیں آنا جانا ہی نہ تھا پھر کبھی جو بڈھا بڈھی ڈرائیو پر جانا چاہتے تو پتہ چلتا ڈرائیور چھٹی پر ہے۔ چھٹی کس سے لی کیوں لی؟ کس کو بتا کر گئے...... یہ سب سوال بھی بیکار تھے۔ ڈرائیور کہتا......"

"سر میں آپ کو بتا کر گیا تھا۔ میری سالی کا جیٹھ فوت ہو گیا تھا......"

"کب بتایا تھا تم نے؟"

"سر آپ کافی پی رہے تھے اس وقت...... اخبار آپ کے ہاتھ میں تھا...... گھڑی نے تین بجائے تھے اس وقت۔"

"اخبار تو میں نے اس مہینے بند کرا دیا ہے۔"

"کوئی پچھلا اخبار تھا سر اس وقت آپ نے مجھے ایک خبر بھی پڑھ کر سنائی تھی کہ ہم حکومت کا تختہ الٹ دیں گے۔"

ملک احتشام کی یادداشت جواب دے جاتی...... حکومت کا تختہ تو ہر عہد میں ہی الٹایا جاتا یہ کونسی خبر تھی؟ لیکن ڈرائیور کی یادداشت جوان تھی وہ بازی لے جاتا۔ کئی اور یادداشتیں پیش کر دیتا۔ ملک صرف ٹٹولتا رہ جاتا۔ پرانی پرانی یادیں گھیرا ڈال لیتیں پچھلی رات کا واقعہ ذہن سے سرک جاتا۔

اب تو دو فرلانگ کی سیر بھی ملک احتشام کے لیے دوبھر ہو گئی تھی۔ جگہ جگہ پتھروں پر بیٹھ کر سانس ہموار کرنے کی تگ و دو کرتا رہتا...... جسمانی اور ذہنی تبدیلیوں نے ملک احتشام کو بری طرح خوفزدہ کر دیا تھا۔ رات کے وقت اسے لمبی گیلری میں قدموں کی آوازیں آنے لگتیں۔ دیر تک وہ سوچتا یہ دبے پاؤں چلنے کی آواز کسی روح کی ہے کسی چور کی۔ دروازے اپنی چوکاٹھوں پر چرک چوں چرک چوں کرتے۔ الماریوں میں چابی گھمانے کی آواز آتی۔ نچلی منزل سے اوپر جانے والی سیڑھیوں پر کوئی احتیاط سے چڑھتا اترتا...... نیم اندھیروں میں لگتا پردوں کے پیچھے کوئی ہے؟ تنہائی کا خوف، صحت کے ہاتھوں روز افزوں بڑھتی ہوئی تشویش، بچوں کی بے وفائی اور دوری کا ڈپریشن، آگے کے سفر کی ناہمواری اور ناتیاری کا مرحلہ، گلوبل موسموں کی تبدیلیاں، نوکروں کی دیدہ دلیری، ڈاک میں آنے والے ڈھیروں بل، بڑی کوٹھی کی

مرمت کے مسئلے، آدھی رات کا ٹریفک، کئی فکریں سارا دن اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی رہتی تھیں، ملک احتشام کبھی فکر سے آزاد نہ ہو پاتا۔

لیکن ان ساری فکروں کی سردار وحیدہ تھی۔ ساری عمر ملک احتشام نے بیوی سے محبت کم اور کفالت زیادہ کی تھی۔ اس کی ضرورتوں کو اپنے فرائض میں اولین جگہ دی تھی۔ وحیدہ چادر اور چار دیواری میں محبوس اتنی کمفرٹیبل تھی کہ اس نے کبھی آزادی کی آرزو ہی نہ کی تھی...... وہ دونوں اپنی اپنی جگہ اس آزادی سے پریشان تھے جو رات کے وقت ان کی کوٹھی میں دستک دیتی پھرتی تھی۔

وحیدہ سوچتی...... بھلا جب ملک صاحب نہ رہے تو میں کیا کروں گی۔

ملک صاحب سوچتے...... اس وحیدہ کا کیا بنے گا۔ یہ تو سنتی بھی کم کم ہے اور دیکھتی بھی کچھ زیادہ نہیں۔ بیٹے کے پاس امریکہ رہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن بیٹی کے پاس بھی جا کر کیا کرے گی۔ اسے تو بچوں کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں، وہاں اس کا کیا بنے گا؟

اسی خوف کے ہاتھوں وہ ہارون کے گھر گیا۔ بڑی دیر تک وہ دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ہارون اب نیوجرسی میں رہتا تھا۔ وہاں وہ پراپرٹی ڈیلر تھا۔ پہلے تو مشکلات پڑیں لیکن پھر سوکھا، ہو گیا۔

امریکہ جانے سے پہلے اس چچازاد بھائی نے ملک احتشام کے پاس اپنے برے دن گزارے تھے۔ پورے چار سال وہ ملک احتشام اور وحیدہ کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے فیملی کا حصہ رہا۔ ایک وقت میں تو ملک کو یہ بھی شبہ ہو گیا تھا کہ ہارون وحیدہ کی وجہ سے بیروزگاری کے دن بڑھاتا جا رہا ہے۔ پتہ نہیں وحیدہ اس حقیقت سے آشنا تھی کہ نہیں لیکن ملک کو یقین تھا کہ اس کا چچازاد وحیدہ کی کانچ سی نیلی آنکھوں کا اسیر ہو گیا۔ بیس سال پہلے وحیدہ رس دار پختہ پھل کی طرح گرنے گرنے کو تھی۔ ہارون جھولی پھیلائے پورے چار سال اس پھل کے انتظار میں گزارنے کے بعد نیوجرسی چلا گیا...... ملک نے کبھی وحیدہ سے یہ نہ پوچھا کہ تعلق کہاں تک اور کتنا تھا؟

کبھی کبھی وہ وحیدہ کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتا لیکن وہاں نہ اسے کبھی اداسی نظر آئی نہ گواچا پن...... وہ ملک صاحب کی سیدھی سادی گرہست میں الجھی بیوی رہی۔

ہارون ملک کی طرح بوڑھا ضرور تھا' لیکن جینز اور جیکٹ میں امریکیوں کی طرح Go-Getter سا نظر آتا۔ اس کی باتوں میں اعتماد' مسکراہٹ میں چاشنی' بیٹھنے میں دلکشی تھی۔

"تم نے گھر آنے کی کوشش نہیں کی ہارون۔"

"یقین مانئے دو دفعہ آیا تھا۔ لیکن گڑھی شاہو سے گلبرگ تک آنا بہت مشکل ہے...... مجھے راستے بھول گئے ہیں اور یہاں گھر والوں کے پاس ٹائم نہیں ہوتا۔" ہارون نے ادب سے کہا۔

"پھر بھی...... وحیدہ سے ملنے تو آجاتے......"

"وحیدہ بھابی؟......"

ہارون امریکی کے چہرے پر ہلکی سی بدلی آئی اور چلی گئی۔

"بوڑھی ہوگئی ہوں گی...... آپ سے چار سال بڑی تھیں نا......"

"ہاں بوڑھی تو ہوگئی ہے' لیکن مانتی نہیں...... اچھی طرح دیکھ نہیں سکتی لیکن عینک نہیں لگاتی۔ زیادہ سُن نہیں پاتی لیکن ہیرنگ ایڈ نہیں لگاتی...... بلڈ پریشر' شوگر' گھٹنوں کے درد اور جانے کس کس بیماری سے Suffer کرتی ہے لیکن مانتی پھر بھی نہیں۔"

ہارون کچھ سوچ میں پڑ گیا...... اس کے چہرے پر دکھ کے ڈھکے چھپے آثار تھے پتہ نہیں وہ بڑھاپے کے متعلق سوچ رہا تھا کہ وحیدہ کے بارے میں؟

"مجھ میں ہر قسم کی Fight ختم ہوگئی ہے ہارون...... میں جانے کے لیے تیار ہوں لیکن وہ ابھی زندہ ہے پوری پوری زندگی کے بکھیڑوں سے لڑتی جھگڑتی ہے......"

"یہ اچھی بات ہے...... امریکن لوگوں میں یہی خوبی ہے وہ بے خوف ہیں۔ تجربے کر سکتے ہیں۔ زندگی سے آنکھیں بھڑا کر اپنے سے نتائج نکال سکتے ہیں...... لڑائی زندگی ہے ان کے لیے۔"

"اب تو تم بھی امریکن ہی نظر آتے ہو...... ایک نیا تجربہ کر سکتے ہو؟"

ہارون نے اس کی بات نہ سنی اور اپنی جیکٹ کی زپ درست کرتا رہا۔

"کتنے بچے ہیں تمہارے......؟"

"میرے؟"

"ہاں...... تمہارے ہارون۔"

"میں نے شادی نہیں کی بھائی احتشام...... شروع میں ایک کالی امریکن سے پیپر میرج کی تھی۔ گرین کارڈ ملنے کے بعد بڑی مشکل سے اس سے جان چھوٹی......"

"تنہائی تو بہت ہوگی......"

"وہاں فیصلے کرنے پڑتے ہیں بھائی جی...... میں امیر بننا چاہتا تھا بڑے دھکے کھائے تھے میں نے یہاں...... رئیل اسٹیٹ میں پیسہ تو بہت ہے لیکن Establish ہونے میں بہت دیر لگتی ہے......"

اس کے بعد ہارون اپنے حالات سمجھاتا رہا۔ پاکستان کے حالات سمجھتا رہا۔

جب ملک گھر پہنچا تو مطمئن تھا۔ اس رات اس نے دوائیاں تو پی لیں لیکن خواب آور گولی کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کفن اتار کر قبر سے نکل آیا ہو۔ ادھ سوئی وحیدہ کو کندھے سے ہلا کر ملک نے بڑے تحکم سے کہا۔

"ذرا اٹھ بیٹھ ایک ضروری بات ہے......"

پہلے تو وحیدہ سٹپٹائی پھر دوپٹے سے منہ پونچھا اپنے آپ کو مجتمع کیا۔ ملک صاحب نے کئی برسوں سے اسے رات کو نہ جگایا تھا۔

"جی؟......"

"ضروری بات یہ ہے کہ نہ تو انکار کی گنجائش ہے نہ بحث و تمحیص کرنے کا حق میں تم کو دے رہا ہوں بس تمہیں میرے فیصلے پر اعتماد کرنا ہوگا......"

اتنی قطعیت سے ملک احتشام نے کبھی بات نہ کی تھی۔ وحیدہ نے دو چار مرتبہ پلکیں جھپکائیں۔ سبز آنکھوں پر پلکیں جھپکنے کی یہ ادا جوانی میں ملک صاحب کو نہتا کر دیتی تھی۔ اب ملک احتشام کی وحیدہ مکمل طور پر Senile نظر آئی۔

"سنو...... میں نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہیں کل طلاق دے دوں گا۔ میں اگر بہت جی پایا تو دو چار مہینے جی لوں گا۔ اس کے بعد تمہاری پریشانیاں بہت بڑھ جائیں گی۔ تم نے ساری زندگی نہ بینک کی شکل دیکھی نہ انکم ٹیکس کا دفتر' ساری عمر سہارا لے کر چلیں' میں اپنے مرنے کا انتظار کر سکتا تھا لیکن اس کی چھٹی اب کم رہ گئی ہے۔ امریکن لوگ جب فیصلہ کر لیں تو رکتے نہیں' اسے جلد واپس جانا ہے وہ میرے مرنے کے لیے رک نہیں سکتا۔"

"ابھی تک میں آپ کا مطلب سمجھی نہیں" وحیدہ مکمل استفسار تھی۔ ملک احتشام نے وحیدہ کا ہاتھ بچوں کی طرح پکڑ لیا۔ اس ہاتھ میں اب ملک کو گرمی، نرمی، ہٹ دھرمی کوئی بھی چیز محسوس نہ ہوئی۔ یہ ہاتھ اگر مردہ نہ تھا تو زندہ بھی شمار نہ ہو سکتا تھا۔

"کل میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں اور پھر تمہارا نکاح ہارون کے ساتھ ہوگا۔"

وحیدہ ہکا بکا رہ گئی۔ ملک احتشام کے علاوہ اس نے کبھی کسی کے متعلق سوچا بھی نہ تھا۔ وہ بیکار ہو کر بھی اتنی بے کار بھی نہ تھی۔

ملک نے بڑی کُرید کے ساتھ وحیدہ کا چہرہ ٹٹولا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وحیدہ کے دل میں ہارون کے لیے کیسے جذبات تھے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟......"

وحیدہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو ملک نے اپنے کُھردرے ہاتھ کو اس کے منہ پر رکھ دیا۔

"میرے پاس مہلت کم ہے۔ اگر تم نے کج بحثی کی تو ہو سکتا ہے یہ وقت اور بھی کم رہ جائے۔"

ڈاکٹر اکبر کا چہرہ وحیدہ کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا......!

بات یہ نہیں کہ وحیدہ نیو جرسی میں خوش نہ تھی۔

ایسے بھی نہیں ہوا کہ وہاں پہنچ کر وہ بیمار ہوئی۔ معاملہ کچھ ایسے بھی نہیں تھا کہ اس کے دونوں بچوں نے والدین کو اس واقعے پر کچھ لعن طعن کی ہو۔ وہ تو سرے سے اپنی زندگیاں گزارنے میں مشغول تھے پھر اس واقعے کا ان پر کیا اثر ہوتا؟ بس اتنی بات ہوئی کہ جس خاموشی سے وحیدہ نے طلاق نامہ پکڑا اسی ٹھنڈے دل سے نکاح نامے پر دستخط کیے اور اس سے بھی زیادہ صبر و شکر کے ساتھ پورے چار مہینے چار دن کے بعد اپنی جان کو جان آفرین کے سپرد کر دیا۔

وحیدہ کے بعد امریکن پراپرٹی ڈیلر ہارون نے شلوار قمیض پہننا شروع کر دیا وہ باقاعدگی سے جمعے کی نماز مسجد میں پڑھتا...... روزے رکھتا اور قرآن کی تلاوت کرتا۔
لیکن کبھی کبھی وہ اپنے گھر کے باہر بینچ پر بیٹھ کر امریکی ڈیموکریٹ کے انداز میں

ڈائیلاگ پر آمادہ ہو جاتا اور آسمان کی طرف چہرہ کر کے بولتا رہتا۔ ایسے میں اس کے منہ سے اشانتی کے لفظ نکلتے...... "ہاں بھئی...... اللہ کو تو ہم سے کبھی کوئی کام پڑ نہیں سکتا۔ پھر وہ کیسے جانے کہ مجبوری کیا ہے؟ اور مجبور انسان ہر صورت صلح کرنے پر مجبور کیوں ہوتا ہے؟"

وحیدہ کے جانے کے بعد ملک احتشام بڑی کوٹھی بیچ کر دو کمروں کی انیکسی میں پورے نو برس زندہ رہے اس دوران انہیں صرف ایک بات کی سمجھ آئی کہ اللہ کی تدبیرِ لطیف کے سامنے انسان کی تجویز کسی کام نہیں آتی۔

ایک دو اور تیسرا "وہ"

مائی ہاجراں نے ہاتھ کی ہتھیلی پر کچھ گلاب کی پتیاں ڈالیں پھر زور کی پھونک مار کر انہیں اڑا دیا۔ ایک دو سرخ پتیاں ہتھیلی پر رہیں۔ غور سے ان کو دیکھتے ہوئے مائی نے کہا...... "لو جی اس بار اتوار ہی راجا اتوار ہی وزیر...... سارا سال بارش خوب ہوگی...... چاول، کنک، گنا، کپاس کی کمی نہیں...... پر کالے رنگ کو ہاری رہے...... ماش، کودا، تل، لوہا...... ان کی قیمتوں میں کم کم ہوئے جائے۔ سفید رنگ کا کپڑا سستا...... کالے رنگ کا مہنگا...... دھاتوں کے بیوپاری خوش...... کیسر، ہلدی، کسم، لونگ، جاوتری بیچنے والے روئیں......"

مائی ہاجراں سال بھر میں ہونے والی فصلوں کا بیان تفصیل سے کرتی چلی تو اس کی چادر کا کونا کھینچ کر عبدالکریم بولا...... "مائی جی...... اماں پھول واری مجھے فصلوں سے کیا لینا دینا...... اچھی ہوں یا بُری...... مجھے ارزانی گرانی سے کیا...... مندا ہو کہ ہُن برسے، ہمیں بھرے گودام سے کچھ تعلق نہیں......"

مائی پھول واری نے آنکھیں کھولے بغیر بڑے جلال سے کہا...... "حق اللہ...... کبھی یہ ہوا کہ جاٹ ہو کر دھرتی سے ناتا ٹوٹے...... کبھی یہ ہوا کہ ماں بن کر اولاد بھولے کبھی یہ دیکھا مرد ہو کر عورت سے ناتا ٹوٹے......؟"

"میں جاٹ نہیں ہوں ماں جی...... گُجر ہوں گُجر...... پہلے بہت گائیں بھینسیں تھیں میرے باپ کے زمانے میں، اب صرف تین بھینسیں ہیں اور ایک گائے...... ان کا دودھ ڈرموں میں ڈال کر لاہور لے جاتا ہوں...... گرمی ہو تو ڈر لگا رہتا

ہے کہ کہیں راستے میں دودھ نہ پھٹ جائے...... سردی ہو تو پولیس والے کا خطرہ رہتا ہے...... میں تو ڈر کا، خوف کا پالا ہوا ہوں...... مجھے کیا لینا جنس اجناس سے......"

مائی ہاجراں نے آنکھ کھولی...... کانچ کی بنی آنکھیں ہری نیلی گویا اس سے بھی پرے دیکھنے لگیں۔

"تو پھر آگیا عبدالکریم...... بابا جا کر دودھ بیچ میرے پاس تیرے سوال کا جواب کوئی ناں۔"

"ہاں جی...... آگیا!"

"تجھے منع کیا تھا کہ ہماری جھونپڑی میں تیرے سوال کا جواب نہیں...... ہم تو گیہوں، جو، چنا، مشک، کافور، سُوت کپاس کا اُتار چڑھاؤ بتاتے ہیں...... تیرے چوپائے اس سال سستے ہوں گے پر ابھی ابھی خرید لے اگلی سنکرانت جب سورج نئے برج میں جائے گا بھاؤ بھینس، گائے کا پھر بڑھے گا...... پھر خریدنا مشکل ہوگا۔"

"اماں ہاجراں...... میں یہاں کے نفع نقصان کا نہیں سوچتا......"

اماں نے اپنے پاس پڑی چھڑی اٹھا کر زور سے زمین پر ماری اور قہر سے بولی...... "لے بچڑا یہاں کا پوچھتا ہے تو پوچھ لے...... شہرت، عزت...... رزق، محبت...... جو چاہے ترنت ملے پر تو پوچھتا ہے مابعد کی...... جنت کی...... عورت ٹھہری عارفِ دنیا...... میرا کام کیا جنت سے؟...... میں......! بتا میں دنیا کا بندہ میرا کیا کام بہشت سے؟"

عبدالکریم نے سر جھکا کر جیسے اپنے آپ سے کہا...... "وہ بھی یہی کہتی ہے مائی پھول واری...... وہ کہتی ہے...... قرآن میں تو ہر جگہ لکھا ہے جنت میں حوریں ہوں گی...... عورتوں کا تو کہیں ذکر ہی نہیں پھر چادر تان کر پڑی رہتی ہے اور روتی ہے کہ میں تو دوزخ میں جاؤں گی اور تو جنت میں؟...... ہمارا تو ملاپ آگے چل کر ہو گا ہی نہیں۔"

مائی پھول واری کچھ دیر ہنستی رہی پھر اپنا سلیپر اٹھا کر اس نے عبدالکریم کے کندھے پر مارا اور بولی...... "لے اب اٹھ جا...... جو کاروبار میں مندا اچھا پوچھنا ہو تو میرے پاس آجانا...... ایسے اُلٹے سیدھے سوالوں کو نہیں پوچھا کرتے......"

عبدالکریم بولا...... "پر میری گھروالی نے تو کبھی کسی کا دھیلی بھر نقصان نہیں کیا۔ اپنے جی کی کوئی خواہش پوری نہیں کی...... عشاء کو فجر سے جا ملایا...... بندگی میں کسر

نہیں، دوسروں کی سیوا میں ڈنڈی نہیں ماری پھر پھر...... وہ جنت میں کیوں نہیں جائے گی......؟"

مائی ہاجراں نے دونوں ہاتھوں میں پھول کی پتیاں لے کر اُچھالیں اور پھر گرج کر بولی...... "دیکھ بچڑا جو میں تجھے حقیقت بتا بھی دوں تو تیری سمجھ میں کیا آئے گی؟...... گجر کو دودھ بیچنے سے کام، تجھے کیا لگے عورت جنت میں جائے گی کہ نہیں...... تو نے کیا لینا ہے جنت سے...... اپنا آرام سے رہ...... نیک عمل کیے جا آپی تو جنت میں بیٹھا حوروں سے پنکھے جھلائے گا...... بس ایک بات یاد رکھ...... چیت جائے بساکھ...... مینہ برسے سو کھا پڑے...... دودھ میں پانی نہیں ملانا...... ملاوٹ نہیں کرنی عبدالکریم...... نہ بات میں نہ ہاتھ سے......" مائی ہاجراں نے کاٹن کی ساڑھی کا پلا سر پر درست کیا۔

پھر آنکھیں بند کرلیں اور اس کے لب خفی ذکر سے لرزنے لگے......

عبدالکریم نے حوصلہ پا کر اس کے پاؤں پکڑ لیے...... "میں نے تو دو سال ہوئے پانی کی بوند بھی نہیں ڈالی دودھ میں...... صبح تڑکے موٹر سائیکل پر کین بھر کر جاتا ہوں تو چل کر میرے گاہکوں سے پوچھ لے اماں پھول واری...... جو کسی کو شکایت ہو......"

اماں نے پاؤں کھینچ کر پیچھے کرلیا...... "جا بچڑا جا میں تیرے سوال کا جواب دے چکی...... عورت جنت میں نہیں جائے گی...... بس گنتی شنتی کی عورتیں ہوں نیک مردوں کا سایہ بن کر...... نبیوں کی مائیں...... نبی کے ناتے سے زندہ رہنے والی...... باقی سب ہاویہ زاویہ ہے لے بچڑا...... جا اب کام لگ عورت عارفِ دنیا ہے اور مرد عارفِ مولا...... یہ بات سمجھ جا۔"

"آپ کو معلوم ہے آپ جانتی ہیں...... آپ اتنی کرنی والی ایویں تو مشہور نہیں ہو گئیں...... آپ میرے سوال کا شافی جواب دیں بی بی پھول واری...... میری بیوی جنت میں کیوں نہیں جائے گی......؟ آپ مجھے گستاخی پر نہ اُکسائیں۔ میں بار بار ایک ہی بات کا رٹا نہیں لگانا چاہتا۔"

اماں پھول واری نے دوپٹے سے منہ پونچھا اور بولی...... "دیکھ بچڑا عبدالکریم، اللہ بڑی حکمت سے دنیا چلاتا ہے...... کسی کے ذمے کچھ، کسی کے ذمے کچھ...... کسی کی کوئی ذمہ داری...... کسی کے لیے کوئی اور خدمت...... کوئی اصیل ذاتی کام کیے

جائے...... کسی کمیرے کو اُجرت پر لگا لے...... چنگا چوکھا دے...... پر کمیرا اکڑتا جائے...... کچھ اس کے ٹہلیے کہ ہر دم نظر آ گئے...... کچھ روز پیسے لے کر دھونس دیں...... کچھ صرف روٹی کپڑے پر راضی، کچھ تاج دار دروازے چوکی پر پہرا دلوائیں، کچھ پروردے اِدھر سے اُدھر لگائی بجھائی کرنے والے...... اللہ کا نظام بچڑا بڑی حکمت سے چلتا ہے...... کسی سے پوچھ گچھ ہوتی رہتی ہے، کچھ بے کام دندناتے پھرتے ہیں۔ ہم جیسے چاکر صرف اوپری کاموں کے لیے ہوتے ہیں۔ بھاگ دوڑ بڑی پر ذمے داری صفر۔ جو کان میں پڑ گئی سب کو جا سنائی، بھیا ہم لوگ ٹھکانے دار نہیں ہوتے جو اس کے اندر کی خبر رکھیں...... بس اتنا سن رکھا ہے کہ عورت جنت میں نہیں جائے گی سو تجھ کو بتا دیا...... اب تو مانے یا نہ مانے تیری مرضی...... ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ جنت میں حوریں ہوں گی...... عورت کہیں نہیں...... ذکر ہے ان معدودے چند عورتوں کا...... جو کسی نبی کے حوالے سے قابلِ ذکر ہوئیں۔

مائی پھول واری چپ ہو گئی تو عبدالکریم اُٹھ کر دروازے میں جا بیٹھا...... گرمی شدت پکڑ رہی تھی۔ سامنے چھوٹا سا قبرستان تھا جس میں دیہاتی لوگوں کی کچی پکی قبریں تھیں۔ کسی کسی قبر پر تازہ چھڑکاؤ بھی تھا۔ نمبردار کی دادی سب سے نمایاں قبر کے اندر دفن تھی۔ اس پر لوح بھی سنگِ مرمر کا تھا اور سنگ تربت بھی گہرے سنگِ مرمر کی تھی...... ان ہی قبروں سے رات کے وقت مائی ہاجراں پھول واری گلاب کی پتیاں اپنی جھولی میں بھر کر لے آتی تھی۔ جس روز کوئی نیا ڈولا قبر میں اترتا مائی ایک دیا جلا کر رات گئے قبر پر پہنچتی اور دیر تک بیٹھی جانے والے سے باتیں کیا کرتی...... اماں پھول واری کی حرکتوں سے گورکن واقف تھے...... وہ اماں کے تکیے کی طرف کمر کر کے نہیں بیٹھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسی کرنی والی عورت جو رات گئے قبرستان میں آنے کا حوصلہ رکھتی ہو معمولی ذی روح نہیں ہو سکتی۔

اماں پھول واری کا تکیہ ذرا اونچائی والے ٹبے پر تھا۔ یہاں سے قبرستان کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ عبدالکریم اماں کے پاس سے اٹھ کر دروازے میں جا بیٹھا...... گرمی روز افزوں تھی، گرمی کا پیامبر بن کر ہوا قبرستان میں جھول رہی تھی۔ گویا کچی قبروں کو مٹ جانے کا حکم مل گیا تھا...... اونچائی کی وجہ سے نمبردار کی دادی کا روضہ ہوا کی راہ میں حائل تھا......

عبدالکریم نے دل میں سوچا...... انسان ہر وقت فکر میں کیوں مبتلا رہتا ہے؟ کچی قبر رہے نہ رہے...... انسان خود یہاں وہاں آگے پیچھے رہے نہ رہے...... وہ دودھ کے ڈرم بھرتا...... کچے راستے پر موٹر سائیکل چلاتا...... سوچتا چلا جاتا...... اسے اپنی فکر نہ تھی انسے خوف تھا کہ کہیں...... اس کی بیوی موت کے بعد اسے مل نہ سکے گی۔ عبدالکریم کو یہ تو پورا یقین تھا کہ وہ جنت میں جائے گی لیکن بیوی نے اس کے دل میں شبہ ڈال دیا تھا کہ وہ بہشت میں نہیں ہوگی...... قبرستان کی طرف منہ کر کے اس نے سوچا بھلا یہ بھی کوئی سوچ ہے' کوئی فکر ہے...... سارا وقت اسے بس یہی فکر ستاتا کہ بتول مرنے کے بعد کہاں رہے گی......؟

جنت میں کہ جہنم میں؟

برزخ میں کہ یہیں کہیں کسی بدروح کی شکل میں بھٹکتی ٹکریں مارتی سایوں میں ڈھلتی اندھیروں میں ڈوبتی ابھرتی' کسی درخت پر بیٹھی' کسی قبر پر چڑھی......؟ یہ تصورات اس کے لیے ہول ناک تھے۔

عبدالکریم کو یہ فکر کوئی ایک دن میں نصیب نہ ہوا...... وہ مسجد میں جمعے کی نماز ضرور پڑھتا' وہیں سے اس نے جنت اور دوزخ کی تشویش حاصل کی تھی...... اسے ہولے ہولے یقین آچلا تھا کہ بتول کو جنت نصیب نہیں ہوگی اور وہ تھوہروں میں بھٹکتی' کھولتے پانی پیتی دوزخ میں کہیں چلاّتی پھرے گی...... "سرمد...... اوئے سرمدا...... پترا...... سرمدا کہاں ہے تو...... بتا تو سہی کہاں ہے؟ اِدھر تو راستہ بھی نہیں ملتا سرمد۔"

اماں پھول واری کی طرف پشت کیے عبدالکریم قبرستان کی جانب خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے تین سال پہلے کی وہ رات یاد آئی جب وہ بتول کو بیاہ کر گاؤں لایا تھا۔ آدھی رات گئے بتول اٹھ کر باہر صحن میں چلی گئی تھی اور اپنے سات سالہ پچھ لگ بیٹے کے ساتھ سو رہی تھی جس وقت صبح کی اذان ہوئی اور عبدالکریم نے بتول کو اپنی چارپائی پر نہ پایا تو اچانک عبدالکریم کا سارا وجود بھونچکا رہ گیا...... باہر نکل کر اس نے صحن میں دیکھا تو تمام گھر والے چارپائیوں پر اوندھے سیدھے بے سدھ لیٹے تھے۔ اس کی ماں جس کا سر کبھی ننگا نہ ہوتا وہ بے خبر پڑی تھی اور اس کا دوپٹہ فرش پر صبح کی ہوا میں رینگ رہا تھا۔ دلہن بتول سرخ لباس میں ملبوس تھی' اس کا دایاں بازو سرمد کے سر کے نیچے تھا اور سرمد نے اپنا سر بتول کی گردن میں پھنسا رکھا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر عبدالکریم

چپ چاپ اندر چلا گیا۔

اس نے اپنی مرضی سے شادی کی تھی۔ شہر کی جانب دودھ سپلائی کرنے جاتا تو شہر کے شروع علاقے میں شکلاً بے آباد چند بکھرے سے' بے رچے' گھروں کی آبادی آتی۔ ان ہی گھروں میں بتول اپنے باپ کے ساتھ سرمد کے اردگرد گھومتی رہتی۔ پہلے تو عبدالکریم دودھ کی قیمت لیتا رہا پھر دوسرے چوتھے رقم پکڑنے لگا۔ ہولے ہولے اس نے دودھ کے پیسے وصول کرنے بند کر دیئے۔ بتول نے سوال نہ کیا وہ بھی خاموش رہی اور اس کفالت کو خوشی سے منظور کر لیا۔ بتول کا ابا پتنگ باز تھا۔ چھوٹی سی دکان لب سڑک تھی جس میں ادھیل' دمڑ چیل' تُکّل' کل چڑی پتنگوں کا بیوپار زیادہ تھا۔ آبادی سے دور بڑی پتنگیں نہ بکتی تھیں' چھوٹے بچے ہلکی قیمت کے گڈے' گڈیاں لے جاتے...... بسنت سے پہلے ابا بہت مصروف ہو جاتا۔ وہ کانچ کا سفوف اُبلے چاولوں میں ملا کر بڑی توجہ سے مانجھا بناتا اور ڈور پر ڈور سونتتا جاتا...... پھر کل چڑی' ہلکے پتنگ بنا کر ان گنت چرخی چڑھی رنگ برنگی ڈوریں لے کر شاہ عالمی پہنچتا...... سیر بھر گوشت چار روپے سے ایک سو دس روپے کے نرخ پر جا پہنچا لیکن ابا کی سدھ پتنگیں' چرخیاں زیادہ قیمت وصول نہ کر پاتیں۔ مانجھا بنانا' انٹی کرنا' چرخی پر ڈور لپیٹنا بتول کے کام تھے۔ سرمد اور بتول بھاگ بھاگ کر ابا کا کام کرتے پھر بھی ابا کو فکر رہتی کہ بتول جوان بھی ہے اور سدھ بھی اس کا سر بندھ ہو جائے تو وہ سکھ کی نیند سو رہے۔ "پھر تیرا کیا بھروسا۔" وہ پتنگ کو کنیا کر کہتا...... "آجائے گا تیرا وارث کہیں سے...... تو تو ایسی پتنگ ہے بتول جو ذرا سی ہوا میں سدھ نہیں رہتی...... کیا ہوا جو اللہ سائیں نے تیرا خصم سونت لیا...... وہ اللہ بھیجے گا...... تیرا کفیل...... تیز ہوا ہو تو پتنگ اراٹے مارتی ہے...... ہوا نہ چلے تو ہتھے سے اکھڑ جاتی ہے...... مانگتی ہے تو ایسا مانگ جو نہ تیز ہوا ہو نہ بند بس اوپر ہی اوپر لے جائے...... تارے کی طرح اڑائے آسمان میں......"

بتول خاموش رہتی۔

عبدالکریم بھی چپ چاپ رہا کرتا لیکن اس کے جسم میں خوشی کی کونپلیں ایسے آئیں تھیں جیسے بہار کے دنوں میں انار کی سوکھی شاخوں میں زندگی کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔

عبدالکریم نے بتول کی جانب بڑھنے کے لیے سرمد کا متوازی راستہ تلاش کیا۔

وہ شہر سے ٹافیاں' کھلونے' لنڈے کی جینز قمیص' کاپیاں پنسلیں لانے لگا' رفتہ رفتہ دودھ سپلائی کرنے کے بعد وہ سرمد سے باتیں کرنے بیٹھ جاتا۔ بتول کام کرتی رہتی کبھی کبھی ابا بھی اس گفتگو میں شامل ہو جاتا۔

"یہ تو بڑا ہو کر ڈاکٹر بنے گا' کیوں ابا......؟" عبدالکریم کہتا۔

بتول کی آنکھیں چمکنے لگتیں لیکن ابا کہتا...... "ناں بچڑا ناں...... زیادہ اونچا خواب دیکھو تو پینچا بھی بڑا پڑتا ہے۔ چھوٹے آدمی کی کانپ اچھی نہیں ہوتی وہ ایسے پینچوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا...... یہ تو میرے ساتھ پتنگیں بنائے گا...... ہم شاہ عالمی میں جا کر دکان ڈال لیں گے...... عیش کریں گے عیش...... ہے ناں سرمد؟"

بتول کو یہ بات پسند نہ آتی پر وہ خاموش رہتی۔ شوہر کی موت نے اسے چپ رہنے کی عادت عنایت کر دی تھی...... عبدالکریم لسّی کا گلاس پکڑے پکڑے کہتا......

"ناں ابا ناں اب اس پیشے میں کچھ نہیں رکھا...... اب یہ ڈاکٹر بنے گا اور بس...... میں نے کہہ دیا ناں ڈاکٹر اور کچھ نہیں۔"

بتول کی باچھیں کھِل جاتیں...... عبدالکریم کو علم ہو چکا تھا کہ بتول کے دل کو صرف ایک ہی راستہ جاتا تھا اور اس راستے کا بورڈ تھا سرمد گلی......!

پورے تین سال کی کوشش کے باوجود نہ تو بتول کے دل کا راستہ بدلا نہ ہی عبدالکریم نے اپنی سی کوشش چھوڑی...... وہ چاہتا تھا کہ بتول کے ماؤنٹ ایورسٹ پر اس کے نام کا جھنڈا نصب ہو جائے...... لیکن وہاں تو پہلے ہی سرمدی عَلم لگا ہوا تھا۔

پہلے پہل شادی کے بعد عبدالکریم نے سرمد کو اپنانے کی بڑی کوشش کی۔ پھر ہولے ہولے اسے علم ہو گیا کہ سرمد پر بتول کسی کا غاصبانہ حق برداشت نہیں کر سکتی...... شہر میں دودھ سپلائی کرنے کے بعد عبدالکریم لوٹتا تو اس کے ساتھ میٹھی گولیاں' نمکو' چپس ایسی ہی کئی چسکے والی چیزیں ہوتیں کبھی کبھی بتول اس سے بگڑ جاتی۔ "اس کو کھٹی میٹی چیزوں کا لالچ نہ دیا کر عبدالکریم...... سیدھے سبھاؤ محنت لگن سے پڑھ لینے دے...... ہمارے کون سے چار بیٹے ہیں......"

عبدالکریم کے گھر لڑکے تو کیا بچی بھی پیدا نہ ہوئی۔ بتول کی سائیکی اپنے سرمد میں اس قدر مشغول تھی کہ اس کے لاشعور نے بھی کسی اور بچے کی خواہش نہ کی...... عبدالکریم کبھی کبھی دل میں ایک اور بچے کی خواہش کرتا لیکن بتول سے اس آرزو کا ذکر

بھی اسے دخل در معقولات لگتا۔ عبدالکریم کو جب یقین ہو گیا کہ زندہ رہنے کے لیے سرمد ہی واحد سہارا ہو سکتا ہے تو اس نے اور بھی تن دہی' گرم جوشی اور لگن سے سرمد کی تربیت شروع کر دی۔ شہر سے لوٹ کر سرمد کو پڑھانے میں مشغول ہو جاتا' اپنے ساتھ سیر پر لے جاتا اور سارے راستے اخلاقی کہانیاں سناتا۔ واپسی پر وہ دونوں باورچی خانے میں بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ سرمد سکول کی باتیں سناتا۔ عبدالکریم شہر سے بٹوری ہوئی کہانیاں بیان کرتا' بتول نہال ہو جاتی۔ اسے لگتا کہ جنت اس کے گھر ہی کا نام ہے۔

کبھی کبھی دل ہی دل میں بتول کچھ خوفزدہ بھی ہو جاتی...... سرمد پڑھائی سے غافل تھا۔ وہ کھیل کود' کہانی' کھانے پینے کا رسیا تھا۔

جب عبدالکریم اسے پڑھانے بیٹھتا تو بتول اندازے لگاتی کہ سرد جھڑکیاں پڑ رہی ہیں۔ آواز کا غرّہ بڑھ رہا ہے اور سرمد پر عبدالکریم کے یہ جھڑکے باچھڑ کی طرح اندر باہر پڑ رہے ہیں۔ رات کو بتول پوچھتی...... "سرمد کیسا جا رہا ہے پڑھائی میں عبدالکریم......؟"

"تو اس کی رئی کرنا چھوڑ دے تو پڑھ لکھ جائے...... پر نہ تو سزا دینے دیتی ہے نہ جھڑکا' بھلا کبھی کوئی خوف کے بغیر پڑھا ہے؟ خوف کے بغیر اللہ کے حکم مانتا ہے کوئی' سیدھے راستے پر چلا ہے انسان؟"

"تو بھی تو پیار سے نہیں سمجھاتا عبدالکریم...... میرے تو سارے کام بھاگ بھاگ کر کرتا ہے تیری آواز ہی ایسی ڈراؤنی ہے ڈر جاتا ہے۔"

"اگر میں نہ سمجھاؤں گا تو کون راستے پر ڈالے گا؟ ہم اسے ڈاکٹر کیسے بنائیں گے بتول...... کیا تیرا ارادہ اسے پتنگوں کی دکان پر بٹھانے کا ہے؟"

بتول تھوڑی دیر کے لیے خوفزدہ ہو جاتی۔ "اللہ نہ کرے...... اللہ نہ کرے...... میں کب کہتی ہوں' اسے پڑھاتا رہ پر ذرا نرمی سے...... تھوڑا آواز کو سنبھال کر۔ پیار سے ناں جیسے مجھے سمجھاتا ہے۔"

پہلے تو بتول کو آواز پر اعتراض تھا لیکن سرمد کا ہاتھ اچانک ایک دن کھلا...... ہوا یوں کہ ان دنوں سرمد آٹھویں میں تھا۔ ایک رات وہ چوری چوری موٹر سائیکل لے کر اپنے کسی دوست کے ساتھ غائب ہو گیا۔ صبح جب دودھ کے کین موٹر سائیکل پر لاد کر شہر جانے کا وقت آیا تو نہ سرمد موجود تھا نہ موٹر سائیکل۔

عبدالکریم موٹر سائیکل کے لیے سراسیمہ تھا اور بتول کو اپنے سرمد کا فکر......
عبدالکریم نے سارے ملنے والوں سے تفتیش کی لیکن کچھ اندازہ نہ ہو سکا کہ زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا...... دودھ پھٹنے کے قریب تھا جب سرمد موٹر سائیکل گھسیٹتا وارد ہوا۔ عبدالکریم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پورے ہاتھ کی ایک جڑ دی۔ بتول کا سارا وجود ایک تھپڑ نے ہلا دیا۔

"اوئے کنجر! کہاں رہا ساری رات' پتا نہیں دودھ لے جانا ہوتا ہے صبح سویرے۔"

سرمد خاموشی سے گال سہلاتا رہا۔

عبدالکریم نے ایک اور زناٹے دار تھپڑ مار کر کہا۔ "نالے چور نالے چتر۔ اوئے ایک تو موٹر سائیکل چُرا کر لے گیا اوپر سے بتاتا نہیں گیا کہاں تھا؟"
عبدالکریم طیش میں آکر حشر نشر کر ڈالتا...... لیکن بتول ان دونوں کے درمیان آگئی۔

"بس بس غصہ تھوک دے عبدالکریم میں پوچھتی ہوں۔ بچہ ہے کسی کے کہنے میں آگیا ہوگا...... کیوں بھئی سرمد کہاں گئے تھے تم...... تمہارا ابا ساری رات سو نہیں سکا۔"

"رائے ونڈ کے میلے پر گیا تھا اماں تبلیغی جماعت کا کٹھ دیکھنے...... میں کوئی بُری جگہ تو نہیں گیا...... دعا میں شامل ہوا تھا اماں...... ٹائر پنکچر ہو گیا...... دکانیں بند تھیں اماں۔"

"لو یہ تو دینی کام کرنے گیا تھا اور تم اسے مار رہے ہو' اُلٹا گناہ اپنے سر مول لے رہے ہو...... خواہ مخواہ۔"

یہ تو وہ مقام تھا جہاں سرمد واقعی پڑھائی میں انہماک سے شامل ہو سکتا تھا لیکن بتول نے اسے پڑھنے پر راغب کرنے کے بجائے فرار کے راستے پر ڈال دیا۔ اب وہ پڑھنے کے وقت لمبے لمبے وظیفے کرتا' ساری نمازیں مسجد میں پڑھتا' ماں کو مسئلے مسائل سمجھاتا اور دینی کتابیں پڑھتا رہتا۔

عبدالکریم نے سرمد کی تربیت سے ہاتھ اٹھالیا...... وہ بتول سے اس درجہ محبت رکھتا تھا کہ سرمد کو کچھ کہہ کر بتول کی بچی کھچی محبت سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا تھا۔

سرمد کا سکول آٹھویں میں چھوٹ گیا لیکن بتول پر اس کا کوئی منفی اثر نہ ہوا۔ وہ بڑے فخر سے سب کو بتاتی کہ سرمد کتنا زیادہ دینی لگن کا شخص ہے۔ روزوں میں سرمد شبینوں کی خاطر مسجد میں رہتا...... پھر چند دن اس نے اعتکاف میں بھی گزارے...... کچھ سالوں میں اس کی ڈاڑھی بھی چہرے پر نمایاں ہو گئی۔ ہاتھ میں تسبیح رہنے لگی۔ سرمد نے جھوٹے سچے پیروں کے ساتھ زندگی گزارنا شروع کر دی...... کچھ دن اس نے اپنے نانا کے ساتھ پتنگوں والی دکان پر گزارے لیکن ایک روز نانا اسے واپس لے آیا...... بتول ٹھٹھک گئی...... "کیوں ابا...... یہ...... آپ تو کہتے تھے کہ اس کا مستقبل ہی پتنگ بیچنا ہے پھر اب......"

"بیٹی اسے رزقِ حلال کمانے کی عادت نہیں...... دکان پر یہ بیٹھ نہیں سکتا' پتنگیں یہ بنا نہیں سکتا پھر وہاں اس کا کیا کام...... وہاں تو کوئی مجھ جیسا دنیادار کمینہ بیٹھ سکتا ہے۔"

"نانا تو چاہتا ہے کہ میں نمازیں چھوڑ کر سارا دن دنیاداری کروں' پیسہ کماؤں' اللہ کو بھول جاؤں؟"

نانا بے چارہ پہلے ہی بہت کچھ سمجھا چکا تھا' چپ ہو گیا۔
عبدالکریم نے بڑی دیر کے بعد سرمد کے سامنے آواز نکالی اور دبی زبان میں کہا۔ "سرمد ہم دونوں جہاں کے آقا کے غلام ہیں' یہ جہان بھی اور اگلا بھی...... کیا تجھے معلوم نہیں کہ اسی دنیا کا دین بنتا ہے؟ یہاں کے اعمال کی پڑتال ہو گی تو جنت کا ٹکٹ ملے گا...... یہاں خیر گزری تو وہاں خیر ہو گی...... بیٹا تیرا انہماک ٹھیک ہے...... دین سے ایسے ہی پیار کرتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ حقوق العباد بھی ادا کرتے ہیں۔ رزقِ حلال بھی کماتے ہیں۔ اسلام ایک طرف کو جھک جانا نہیں ہے' ابھی تو ٹھیک ہے...... پر شادی کے بعد بیوی بچے کو کیسے پالو گے؟ کچھ یہ بھی سوچا ہے۔"

"میں ٹھیک جانتا ہوں کہ کیا درست ہے اور کیا نادرست؟ آپ اپنے مشورے اپنے پاس رکھیں۔"
عبدالکریم نے بتول کے خوف سے خاموشی سادھ لی۔ پھر اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں سرمد کو منع کر کے وہ گناہ ہی کا مرتکب نہ ہو رہا ہو......؟ اسے مذہب کے متعلق کچھ ایسی مربوط اور بامعنی معلومات بھی نہ تھیں۔ یہ وہ وقت تھا جب دنیا اور دین میں

مسابقت پیدا کرنے کے بجائے مفاہمت اجاگر کرنے کی ضرورت تھی لیکن عبدالکریم میں وہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ ایک نوجوان کو فرار کے راستے سے حقیقت کی طرف لا سکتا۔

عبدالکریم کی خاموشی نے سرمد کی زبان کھول دی...... ”شادی میں کیا پڑا ہے ابا...... ماں نے دو شادیاں کیں؟ کیا فائدہ ہوا؟ آپ نے شادی کی...... تو کیا ملا آپ کو؟ میں شادی نہیں کروں گا...... بس میرے لیے اللہ کافی ہے۔“

”ملنے ملانے کی بات نہیں ہے بیٹا‘ بات کرنے کرانے کی ہے جو نبیؐ نے کیا وہی کرنا درست ہے۔ نبیؐ سے زیادہ دینی ریاضت کرنے والا‘ ان سے الگ راہ بنانے والا ٹھیک نہیں کر رہا بچڑا......“

سرمد نے اٹھتے ہوئے بڑی کڑک دار آواز میں کہا۔ ”مجھے سمجھانے کی عمر نکل گئی‘ اب آپ اپنے آپ کو سمجھائیں میں اپنی راہ چن چکا ہوں۔“

”اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ سرمد...... یہاں...... عمل کا ہاتھ چھوڑ کر عبادت نہیں کی جا سکتی۔ اسلام سارے مذاہب سے اس لیے مشکل ہے کہ اس میں دین دونیا میں توازن پیدا کرنا پڑتا ہے۔ دین کا ہاتھ پکڑ کر دنیا کمانی پڑتی ہے اور دنیا میں رہ کر دین حاصل کرنا ہوتا ہے...... دونوں کا ہاتھ پکڑ کر چلنا پڑتا ہے گرہست میں رہ کر عبادت...... اور عبادت کا راستہ چن کر دنیاداری سب سے مشکل کام ہے...... بچہ یوں سمجھ دنیا اور دین ریل کی پٹڑی ہیں اس پر انسان کا انجن چلتا ہے۔ پھکا پھک‘ ایک پٹڑی نکال دو تو پٹڑا ہو جاتا ہے انجن کا۔“

سرمد دروازے کو پٹاخے سے بند کرتا تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس دن کے بعد عبدالکریم نے سرمد کو کچھ سمجھانے کی کوشش نہ کی۔ اس واقعے کو ہفتہ گزرا ہو گا کہ ایک رات بتول بڑے اچھے موڈ میں اس کے پاس آئی۔ چارپائی پر کھانے کا ٹرے رکھا اور دلار سے عبدالکریم سے بولی۔ ”لے عبدالکریم ہمارے دن پھر گئے...... اللہ نے ہماری سن لی۔“

”کیا ہوا......؟“

”میرا سرمد مان گیا......؟“

”کس بات پر مان گیا......“

”کل سے وہ شہر دودھ لے جائے گا تو اب فارغ ہے لا چابی دے موٹر سائیکل کی۔“

عبدالکریم ایک عرصے سے موٹر سائیکل کا ساتھی رہا تھا اچانک یوں ریٹائر کر دیا جائے گا اس کی اسے امید نہ تھی۔ بھونچکا سا رہ گیا لیکن اس کے اندر بھی کہیں بتول کا دل جیت لینے کی کڑی آرزو تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی روز بتول کے دل سے سرمد کا بت نکال کر اپنا بت نصب کر دے۔ عبدالکریم کو معلوم نہ تھا کہ اللہ نے عورت کا دل بچے میں رکھ دیا ہے۔ مرد بھی ہزار کوشش کے باوجود عورت کو دل سے نکالنے پر قادر نہ تھا اور یہ عورت اور مرد دونوں اپنے اپنے ہیرامن توتے کی تلاش میں اک رائیگاں سفر پر رواں تھے۔

نہ مرد کو کبھی عورت ملی اور نہ بچہ کبھی ماں کے پاس لوٹا لیکن عبدالکریم ان باتوں کو نہ سمجھتا تھا۔ بس وہ تو اتنا جانتا تھا کہ بتول جو کہتی ہے وہ ٹھیک ہے۔ اگر بتول خوش ہو جاتی تو عبدالکریم کو زندگی کا مقصد سمجھ آ جاتا ورنہ وہ سارا دن یوں گزارتا گویا روشنی کو ترستا ہو۔ خاموشی سے عبدالکریم نے موٹر سائیکل کی چابی بتول کو پکڑا دی۔ کچھ دن تو عبدالکریم کو سمجھ نہ آئی کہ وہ سارا دن کیا کرے۔ پھر اس نے گاؤں میں گھومنا پھرنا شروع کر دیا۔ بے مقصد گشت نے اسے قبرستان کے پاس اماں پھول واری سے ملا دیا...... یہیں سے اس کے اندر بلبلاتے سوال منہ پر آنے لگے۔

تھوڑی دیر سرمد گاؤں سے دودھ جمع کر کے شہر پہنچاتا رہا۔ پھر کبھی تو کم دودھ لے جاتا اور کبھی خود دیر سے گھر لوٹتا۔ کبھی واپسی پر شکایت ہوتی کہ سارا دودھ ہی راستے میں پھٹ گیا تھا۔ عبدالکریم دودھ کے کین خود دھویا کرتا تھا۔ اسے فکر رہتا کہ گندے کین میں دودھ ڈالتے ہی پھٹ جائے گا۔ سرمد کبھی کبھی ناغے بھی کر دیتا۔ سارا دودھ گھر پر پڑا رہتا۔ پھر بتول کو اسے سنبھالنے‘ بانٹنے‘ رِیندھنے کا کام پڑ جاتا لیکن وہ ہنسی خوشی سارے کام کرتی۔ اس کا خیال تھا کہ کچھ ہی دیر میں گھوڑا سان پر لگ جائے گا اور عبدالکریم کی طرح دودھ کی سپلائی میں کوئی ناغہ نہ ہو گا۔ ایک روز جب صبح قبرستان کا چکر لگا کر عبدالکریم گھر لوٹا تو ابھی موٹر سائیکل آنگن میں کھڑا تھا اور کین لبالب بھرے تھے۔

”یہ دودھ ابھی نہیں گیا خراب ہو جائے گا۔“

”ابھی لے جائے گا...... ذرا کسی سے بات کرنے گیا ہے۔“

”اگر زیادہ دیر ہے تو میں دودھ پہنچا دیتا ہوں...... یوں پڑے پڑے تو پھٹ جائے گا۔“

بتول گڑبڑا گئی۔

"ناں ناں آتا ہی ہوگا تو رہنے دے...... ایویں ناراض ہو جائے گا۔"

بتول سرمد کے معاملے میں چناں چنیں نہیں ہوتی تھی۔ بس اس کی خواہش تھی کہ سرمد خوب سارا کمانے لگے' سارے گاؤں میں اس کی عزت ہو۔ لڑکیوں کے رشتے لے کر عورتیں خود اس کے گھر آئیں اور بتول دودھیل گائے کی طرح انہیں لاتیں مارے اور وہ آگے سے ناراض بھی نہ ہوں لیکن بتول بھی اس روز تیورا گئی جب خالی ڈرم دھوتے وقت اسے ایک کین میں سے چھوٹا سا پستول مل گیا۔ اس پستول کو بہ ظاہر تو بتول نے سرمد کے سرہانے تکیے کے نیچے رکھ دیا لیکن وقفے وقفے کے بعد یہ اس کے اندر چلنے لگا...... اگر بتول اس کا ذکر عبدالکریم سے کر دیتی تو شاید معاملات کچھ اور ہوتے لیکن اسے ڈر تھا کہ سوتیلا باپ سرمد سے جھگڑ نہ پڑے۔

پستول گھر آئے ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ایک روز مغرب کی نماز کے بعد سرمد گھر آیا اس کے کپڑوں پر لہو کے نشان تھے اور وہ پہلی بار گھبرایا سا لگتا تھا...... بتول کے تو چھکے چھوٹ گئے۔ وہ گھبرا کر آگے بڑھی "کیوں کیا ہوا کاکا...... یہ تو...... کوئی لڑائی ہوئی ہے؟!"

سرمد اپنے پیروں پر کھڑا تھوڑا تھوڑا کانپ رہا تھا۔

"لڑائی نہیں ہوئی ماں...... میں نے......"

وہ چپ ہو گیا۔

مسجد کے قریب چھوٹی نہر بہتی تھی اور اسی نہر پر بنے پل نے گاؤں اور مسجد کو آپس میں ملا رکھا تھا...... اس پل پر سرمد نے دو آدمیوں کو اپنی پستول سے گھائل کر کے نہر میں بہا دیا تھا۔

"تو فکر نہ کر ماں...... ان دونوں کا عقیدہ خراب تھا۔ میں نے انہیں ٹھکانے لگا دیا ہے......"

عبدالکریم چارپائی سے لڑکھڑا کر اٹھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ سرمد کو زناٹے کا تھپڑ مارے کہ اسے تسلی دے۔

"تو نے ان کے عقیدے کے متعلق تحقیق کی تھی سرمد؟...... پوچھ گچھ کر لی تھی!؟"

"تحقیق کی کیا ضرورت ہے؟ لوگ کہتے ہیں...... لوگ کچھ غلط تو نہیں کہتے اماں!"

"لوگ تو اور بھی بہت کچھ کہتے ہیں...... لوگوں کی بات کبھی معتبر نہیں ہوتی بیٹا...... اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے بڑا غور و خوض کرنا پڑتا ہے...... اور پھر تجھے کسی کے عقیدے سے کیا؟ یہ اللہ جانے اور اس کے بندے...... کون جانے اللہ اور سچے نبی کو روزِ قیامت کس کا عقیدہ پسند آئے......" بتول گڑگڑائی۔

بتول کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے وہ دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"اور جو پولیس کو علم ہو گیا تو...... تو!؟" بتول بولی۔

"میں پولیس سے نہیں ڈرتا ماں...... میں نے یہ کام اللہ کی راہ میں کیا ہے وہ مجھے اجر دے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کا عقیدہ درست نہ تھا؟"

"کیا تو نے ان کا عقیدہ درست کرنے کی کوئی تدبیر کی' انہیں سمجھایا یا مالی مدد کی؟ ان سے میل جول بڑھا کر انہیں راہ پر لانے کی کوشش کی۔" عبدالکریم نے ڈانٹ کر پوچھا۔

"نہیں ابا میں نے ان کا ٹنٹا ہی ختم کر دیا......" سرمد آہستہ سے بولا۔

"بس تو نے اللہ کے فیصلے کا انتظار نہیں کیا بیٹے...... روزِ قیامت وہ ایسے لوگوں سے خود نپٹ لیتا یا پھر نکل کر ان کی مدد کرتا پورے انہاک سے...... انہیں راہ پر لانے کے لیے کچھ تو کرتا بیٹے۔"

"کیا اس کا حکم نہیں کہ بداعتقاد لوگوں کو ختم کر دو......؟"

"اور اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ بداعتقاد کون ہے؟...... بھائی جس نے ایک انسان کو مارا سمجھو کہ اس نے ساری انسانیت کو ختم کر دیا۔"

بتول سرمد کو گھیر گھار اندر غسل خانے میں لے گئی...... اس کے کپڑے دھوئے اور پھر رات گئے تک جائے نماز پر بیٹھ کر جانے کون کون سی دعائیں مانگتی رہی؟ اس کے پاس ایک ہی تو در تھا جہاں وہ ہر شے مانگ سکتی تھی۔

کچھ دن تو سرمد شہر میں لاپتہ رہا...... پھر اچانک گھر آ گیا...... بتول اور عبدالکریم نہ تو مذہب کو اچھی طرح جانتے تھے نہ انہیں علم تھا کہ سرمد کے معاملے میں کیا کرنا چاہیے...... بتول سارا دن لرزتی کانپتی دعاؤں کے حوالے ہو چکی تھی...... عبدالکریم بتول کے لیے خوف سے لرزاں تھا۔

ایسے ہی ایک شام سرمد گھر لوٹا اور کچھ نہ بولا...... ماں نے جلدی سے دودھ کا

گلاس لا کر دیا لیکن دودھ پڑا رہا سرمد نے پینے کی کوشش نہ کی...... عبدالکریم، بتول اور سرمد یوں چپ تھے گویا صندوقوں پر قفل پڑے ہوں۔ عشاء کی اذان ہو رہی تھی جب تین اسلحہ بند سپاہی سرمد کو گرفتار کرنے آ گئے...... نہ انہوں نے پوچھ گچھ کی نہ یہ تینوں کچھ بولے...... یہ بات ضرور ہوئی کہ جب پولیس مین سرمد کو ہتھ کڑی لگا کر لے جانے لگے تو سرمد کے سرہانے تلے سے بتول نے پستول نکالی اور پچھلے پولیس مین کو نشانہ بنا کر پستول چلا دی...... وہ تیورا کر گرا اور گرتے ہی جان دے دی......

عبدالکریم قبرستان میں اُڑنے والی مٹی کو دیکھ رہا تھا۔ کہیں کہیں چھوٹے بھنور کی صورت میں یہ مٹی قبروں میں چکر لگا رہی تھی اور قبروں پر پڑے ہوئے باسی پھولوں کو دھکیلنے کی کوشش میں مشغول تھی۔ عبدالکریم ایک شام پہلے بتول سے حوالات میں مل کر آیا تھا۔ اسے اس بات کی فکر نہ تھی کہ سرمد اور بتول کو اس دنیا میں کس انجام سے دوچار ہونا تھا۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور ایک بار اماں پھول واری کے پاس قدموں میں جا بیٹھا۔

"میں کچھ نہیں جانتا اماں ہاجراں...... بس تو اس قدر کر دے...... کہ بتول دوزخ کی آگ سے بچ جائے...... بس تو مجھے اتنی گارنٹی دے اماں...... کہ بتول دوزخ میں نہیں جائے گی۔"

اماں پھول واری نے کچھ گلاب کی پتیاں عبدالکریم پر اُچھال دیں...... پھر تھوڑی دیر ہنستی رہی آخر کو ہاتھ میں کچھ پتیاں لے کر انہیں مسلنے لگی۔

"بول اماں بول...... بتول کو دوزخ کی آگ سے بچا لے اماں ہاجراں!"

"ہے نا پاگل...... ہے نا...... بے وقوف۔ عورت کا کیا کام جنت میں...... عورت تو یہاں بھی اولاد کے دوزخ میں جلتی ہے وہاں بھی اولاد کی قسمت سے بندھ جائے گی...... جو کسی کے سات بیٹے ہوئے عبدالکریم اور چھ جنت میں گئے لیکن ساتواں دوزخ میں گیا تو ماں کو جنت میں تلاش نہ کرنا...... وہ تو تجھے ساتویں بچے کے ساتھ دوزخ میں ملے گی...... ارے احمق عورت کو جنت سے کیا لینا دینا...... وہ تو جیتی ہی کسی اور کے لیے ہے...... اگر جو کوئی نیک بی بی اپنے سارے اچھے اعمال دینے جوگی ہوتی تو ساری نیکیاں اولاد میں بانٹ دیتی...... عورت عارفِ دنیا ہے عبدالکریم اس سے دنیا کا حال پوچھ...... جو اولاد سے بندھا ہو اس سے مولا کی بات کیا کرنی...... اس سے دوزخ جنت کا سوال نہ کر کملیا!"

"اور نبی کی ماں...... وہ بھی عارفِ دنیا؟ وہ بھی؟"

"جا چلا جا...... بتایا تو ہے جہاں نبی ہو گا وہیں اس کی ماں ہو گی...... ماں تو ہوتی ہی اولاد کے ساتھ ہے چاہے اولاد سات سمندر پار بسے...... چھوٹی سی بات نہیں سمجھتا تو؟ ماں کوئی شرط لگا کر محبت نہیں کرتی اس کی جنت ہی بچہ ہے...... ماں بیمار بچے سے بندھی رہتی ہے' مقروض ہو تو قرض وہی ادا کرتی ہے گناہی' اپاہج' بد قسمت کے ساتھ ماں ہی نبھتی ہے تو بتا جب رشتہ ممتا کا ہو تو جنت میں کیسے جائے گی...... اولاد تو اسے دوزخ میں گھسیٹے ہی گھسیٹے...... جو نیک بیبیاں وہاں نہ جا سکیں وہ دوزخ کے باہر کھڑی بین کر لیں گی...... تو کیا جانے ممتا کیا ہے؟ تجھے کیا پتا؟ اس کے دکھ کیا ہیں...... کبھی تو نے پوچھا مائی ہاجراں قبرستان کے پاس کیوں تکیہ بنایا تو نے...... کبھی تو نے پوچھا...... ؟ادھر کس کی قبر ہے...... جو تو یہاں سے جا نہیں سکتی...... میرے لیے تو محل کھلے تھے پر میں ان بچوں کو چھوڑ کر کہاں جاؤں جو یہاں دفن ہیں...... بے وقوف تو پوچھتا ہے بتول کہاں جائے گی...... جو سرمد جنت میں گیا تو بتول کو بھی وہیں کہیں تلاش کر لینا...... نہیں تو پھر جہاں سرمد وہیں اس کی ماں...... عورت تو اپنی زندگی گزارنے کے لیے بنی ہی نہیں پھر تو کیسے اسے اکیلا جنت دوزخ میں دھکیل رہا ہے؟ مرد اور عورت جو اکٹھے ہو سکتے تو رونا کاہے کا تھا...... ان دونوں میں سارا سنتاپ ہی تیسرے کا ہے...... بچہ تو پانسہ ہے پانسہ...... کبھی آئے تو چھکا اور کبھی گوٹی نہ نکلنے دے گھر سے...... کر لو جو کرنا ہے اس بلوان کا...... کبھی کوئی کچھ کر سکا اس ناطاقتے بہادر کا؟...... سارے راستے روک کر کھڑا ہے...... مرد تو عورت کو گھسیٹ کر لے جاتا...... پر دیکھ لے مرد عورت میں ساری بازی ہی بچہ جیت جاتا ہے...... ایک اور ایک مل کر گیارہ ہو جاتے...... پر تیسرے نے سارے کھیل پر ہی قبضہ کر لیا عبدالکریم...... اب جا کر اس سے پوچھ تجھے کیا درکار ہے سرمد......؟ جنت یا دوزخ...... سارا جواب ہی اُس کے پاس ہے...... سارا کھوٹ ہی اس کے دل میں ہے۔ مرد اور عورت کا ہاتھ ہی چھڑانے والا وہ ہے...... جا کر سرمد سے پوچھ ناں کہ بتول جنت میں جائے گی کہ دوزخ میں......!"

"موم کا پُتلا"

پہلے تو عیشہ نے دروازے پر اپنی انگوٹھی سے دستک دی پھر زور سے ٹھڈا مار کر پٹ کھول دیئے۔ گل خاں شلوار اور بنیان میں کھڑا اپنے پٹے درست کر رہا تھا۔ کنگھی اس کے بالوں میں تھی اور کندھے گردن بازو تازہ غسل کے چھینٹوں سے تر تھے......

عیشہ کو ایسے منظر کی توقع نہ تھی وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر اوٹ میں ہو گئی۔ چند لمحے بعد گل خاں ملیشیا کی شلوار قمیض پہن کر باہر آ گیا اس کی سنہری مونچھیں اور براؤن بال ابھی گیلے تھے۔

"جی صیب؟......"

"میں نے سنا ہے تم جا رہے ہو خاں۔"

"جی صیب؟"

"کیوں؟......"

"جی سر دانہ پانی ختم ہو گیا...... جب ہمارا دانہ پانی پشاور سے ختم ہو گیا تھا تو ام ادھر آ گیا...... اب اللہ سے کہیں اور مقرر ہو گیا ہے تو......"

وہ چپ ہو گیا اس کی عادت تھی کہ موزوں الفاظ کی تلاش میں بات ادھوری چھوڑ دیا کرتا۔ زبان کے مسئلے میں مقید انسان کی طرح وہ جلاوطنی کو اپنا مقدر سمجھتا تھا......

"تمہیں معلوم ہے گل خاں تمہارے اس فیصلے سے کیا ہو گا؟"

"آ جی معلوم اے......"

"پھر بھی تم چلے جاؤ گے......؟"

"آ جا...... یہ ضروری اے یرا جی......" یرا جی استعمال کرنے پر وہ اندر ہی اندر سٹپٹایا ابھی صبح عیشہ کے والد کے سامنے بھی اس کی عقل ٹھکانے نہ رہی تھی۔

"یہ بہت ضروری ہے عیشہ کہ گل خاں جلد از جلد چلا جائے تم نہیں جانتیں...... ہر شخص کوئلے کی طرح ہے اس کی Allotropy بدلتی رہتی ہے۔ کوئلہ ہیرا بھی ہے اور گریفائیٹ بھی...... کوئلے کے متعلق تو سائنس داں پیش گوئی کر سکتے ہیں۔ انسان کے متعلق کچھ وثوق سے کہا نہیں جا سکتا کہ کب وہ ہیرا بن جائے اور کب معمولی گریفائیٹ میں تبدیل ہو جائے۔ انسان کے روپ بہروپ کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے...... ابھی گل خاں کو اپنی غلطی کا احساس ہے...... کون جانے کب وہ الف ہو کر میرے سامنے ڈٹ جائے...... کس وقت وہ میری عزت کو بھول کر اپنی خوشی کے متعلق سوچنے لگے۔" عیشہ کو بھی اپنے والد کی بات ابھی تک یاد تھی۔

گل خاں نظریں جھکا کر اپنی چھوٹی سی ٹرنکی میں چھوٹی موٹی چیزیں ڈالنے لگا۔

لیکن نظریں تو وہ ہمیشہ ہی جھکائے رکھتا تھا۔ اگر جھکانے کی فرصت نہ ہوتی تو ان کی باڑھ چہرے سے ہٹا کر کبھی کندھوں پر کبھی سر سے اونچی کر دیتا...... گل خاں کی شاید یہی سب سے بڑی ادا تھی جو عیشہ کو ہٹ کر گئی۔ پھر گفتگو کا لب و لہجہ جس میں شائستگی کے ساتھ ساتھ پٹھانی لہجہ' تذکرو تانیث کی غلطیاں اور ان جانے الفاظ بھی ٹکے ہوتے۔ عیشہ کو یہ انداز بھی پسند آنے لگا۔ عیشہ فرانسیسی کلاسوں میں جاتی تو اس کے کانوں میں گل خاں کی اجنبی اردو بھی ساتھ جاتی...... عجیب سی بات تھی لیکن اسے فرنچ کلاس میں اور گل خاں سے گفتگو کر کے ایک سا لطف حاصل ہوتا۔

جانے یہ زبان تھی کہ اس کا اپالو جیسا حسن نہ جانے اس کی خودداری تھی کہ غیرت کی سیسہ پلائی دیوار...... گل خاں جلد ہی عیشہ کی توجہ لسٹ پر آ گیا۔ عیشہ کا اپنا یہ عالم تھا کہ وہ شہر کی بالائی آبادی کی روح رواں تھی۔ چمپئی رنگت 'لٹکتے بکھرتے بال' ہوا میں جھولنے والی شاخ سے 'پچکیلی' زی ٹی وی کی دلفریب ناچنی کا سا جسم' بیٹھنے میں بے تکلفی' اٹھنے میں سپرنگ کی سی پھرتی' ہاتھوں میں امریکن لڑکیوں کے اشارے' بھاری آواز میں رول کر کے خوب منہ کھول کھول کر بولنے کا انداز' ہنسنے میں ہموار دانتوں کی نمائش' چلتے میں کشتی کے سے ہچکولے...... عیشہ کے جسم کی گفتگو تو صرف کوئی ایسا

ڈائریکٹر سمجھ سکتا تھا جیسے آج کی ماڈرن لڑکی کو سکرین پر نمائندہ کردار پیش کرنے کی حاجت ہوتی...... ان سارے ذاتی گنوں کے اوپر آئیسنگ کے طور پر ریٹائرڈ جج کے سٹیٹس کا لیپ۔ پھر گھر والوں کے لاڈ پیار نے اسے آزادی اظہار کے ایسے حقوق عطا کر دیئے تھے کہ وہ ہر محفل میں، ہر مقام اور وقت پر اظہار خیال کو سو رنگ سے باندھ سکتی تھی۔ اس کے خیالوں میں گہرائی اور گیرائی نہیں تھی کیونکہ عیشہ ایک تو اردو فکشن سے نابلند تھی دوسرے اس کا انگریزی کا مطالعہ بھی سطحی تھا پھر اسے اخبار سے بھی نفرت تھی۔ سیاسی گفتگو اس کے لیے وقت کا زیاں تھی۔ چونکہ معاشیات اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی' اس لیے وہ ایسے جھگڑوں کو فروعی سمجھتی جو معیشت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی سوچ کا بھی یہ عالم تھا کہ اگر آٹا دستیاب نہیں ہوتا تو کیک کھانا چاہیے...... وہ سمجھتی تھی کہ غریب اس لیے غریب ہیں کہ وہ محنت نہیں کرتے کاہلی اور سستی کی وجہ سے وہ پچھاڑے جاتے ہیں اور جہالت کے باعث ان کو وہ مواقع ہتھیانے کا حق نہیں ملتا جو ہر طرف بے پردہ دوڑتے پھرتے ہیں۔ اس کے نظریات کچھ اس کی اپنی سوچ کا نتیجہ نہ تھے۔ بس وہ سنے سنائے' بنے بنائے ادھار شدھار نظریوں کو بڑی قطعیت سے بیان کرنے میں ثانی نہ رکھتی تھی۔ وہ پُراعتماد طریقے سے ایسے بات کرتی کہ نوجوان یکدم احساس کمتری میں چلے جاتے۔

لیکن عیشہ کے لیے گل خاں Exposase کی ایک نئی کھڑکی تھا۔ اتنا اڑب' نڈر' کم گو باعزت آدمی سے اس کا پالا نہ پڑا تھا۔ آج تک وہ جن نوجوانوں سے ملی وہ اسے دیکھتے ہی اپنا ایٹمی پروگرام رول بیک کرنے کو تیار ہو جاتے لیکن گل خاں کی رال کسی بات پر نہ ٹپکتی وہ گویا اپنی ذات میں خود کفیل تھا...... ویسے تو جج صاحب کے گھر کئی ڈرائیور آئے گئے لیکن یہ اپنی کلاس آپ تھا۔ فارن سروس سے ناآشنا گل خاں کی حرکتیں سفارت کاروں جیسی تھیں۔ ریٹائرڈ جج صاحب نے بڑے ٹھنڈے دل سے گل خاں کو نوکری سے جواب دیا۔ وہ اپنے گھر میں ایس مائینز نہیں بچھانا چاہتے تھے۔ جن سے سارا گھر ہی بھک سے اڑ جائے۔ ان کا تجربہ بتاتا تھا کہ جلد ہی گھر میں ایسی آگ لگنے والی ہے جسے کوئی فائیر بریگیڈ نہ بجھا سکے گی۔

جج وحید فرقانی پیانو کے پاس بیٹھے تھے جب انہوں نے گل خاں کو طلب کیا۔ ان کے ہاتھ میں رول کیا ہوا ایک خاکی لفافہ تھا جسے وہ کبھی کبھی اپنے گھٹنوں پر بجاتے رہے۔

"تم اچھے ڈرائیور ہو خاں......"

"جی صیب......"

"تم میں وہ سب خوبیاں ہیں جو ایک اچھے ڈرائیور میں ہونی چاہئیں۔ تم گاڑی صاف رکھتے ہو' احتیاط سے چلاتے ہو' خاموش طبع ہو...... تم نے کبھی اصرار سے ایڈوانس نہیں مانگا' تنخواہ میں ترقی کے آرزومند نہیں ہوئے...... لمبی چھٹی نہیں مانگی...... لیکن......"

"جی صیب......"

جج صاحب نے ساری عمر چھاتی ٹھونک کر انصاف تقسیم کیا تھا۔ لیکن ایسا داروغائی انداز کبھی پہلے نہ دیکھا تھا۔ وہ اپنی ہیبت سے مجرم پر چھا جانے کے عادی تھے لیکن گل خاں کسی اور باغ کی بوٹی تھا۔ وہ پرشکوہ لوگوں کے آگے اور سر اٹھا کر چلتا تھا۔

"تم سے ایک غلطی ہو گئی ہے تم لال بتی کراس کر کے ہماری روایات سے جا ٹکرائے ہو۔ میرا مطلب تم سمجھ گئے ہو گے۔"

"جی صیب......"

"میں زیادہ گفتگو میں نہیں پڑنا چاہتا تم ایک گھنٹہ کے اندر اندر جا سکتے ہو...... اگر لاہور میں نوکری کرنا چاہو تو خیر ورنہ گاڑی تمہیں لاری اڈہ چھوڑ آئے گی۔ تم آج رات کو یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔"

خاکی لفافے میں ملفوف اس کی تنخواہ پیانو پر رکھتے ہوئے جج صاحب اٹھ کھڑے ہوئے بولے "بیگم صاحبہ نے تمہارا حساب کر دیا ہے...... کوئی غلطی ہو تو ان سے مل لو۔"

عیشہ کو نہ تو معافی مانگنے کی عادت تھی نہ ہی وہ پہلے سلام کرنے کی عادی تھی اپنے عمل کے جواز پیش کرنے اور تاویلات دینے کو تو وہ ہمیشہ کسرِ شان ہی سمجھتی آئی۔ پہلی بار ایسے شخص سے ٹاکرا تھا جو اس سے بھی بڑا خناس تھا۔ عیشہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' اس کا جی چاہا کہ گل خاں اس سے بات کرے۔ اگر بات نہیں کر سکتا تو کم از کم توجہ سے اس کی بات تو سنے...... نہ جانے کیوں اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے دکھوں کا ذکر گل خاں سے کرے۔ اس کے دکھوں کی داستان گو بچگانہ تھی لیکن اس کے لیے ماؤنٹ ایورسٹ کی طرح ناقابلِ تسخیر تھی۔ چار سال پہلے جب اس کے چہرے پر دانے نکل

آئے تھے تو اس کے اندر ایک قیامت برپا تھی۔ پہلے پہل وہ ایک ایک دانہ پھوڑ کر انہیں غائب کرنے کی کوشش کرتی رہی پھر ہر کریم لوشن لگایا۔ اس کے بعد ٹوٹکوں کی باری آئی۔ ہر سکن سپیشلسٹ کو ملنے اور مشورہ لینے کی نوبت آئی۔ وہ گل خاں کو اپنی ساری رام کہانی سنانا چاہتی تھی۔ اے لیول کے امتحانوں میں کس طرح جج صاحب اس کی امی کو لے کر ورلڈ ٹور پر چلے گئے اور اسے نہ لے جاسکے۔ اس محرومی کا ذکر وہ گل خاں سے کرنا چاہتی تھی۔ اس کی سہیلی مونا نے شادی کے بعد کیسے اسے برطرف کرڈالا اور کئی فون کرنے کے باوجود بھی اس سے ملنے کی کوشش نہ کی۔ صغیرہ اور کبیرہ کئی قیامتیں تھیں جن کو وہ اپنی تمام حساسیت کے ساتھ گل خاں کے گوش گزار کرنا چاہتی تھی۔
اچانک اسے بہت سارا رونا اکٹھا آگیا کیونکہ گل خاں بڑی دلجمعی سے سامان پیک کرنے میں مشغول رہا...... عیشہ کو یوں لگا وہ آنکھوں سے اندھا اور کانوں سے بہرہ تھا۔ وہ دروازے میں کھڑی غم وغصہ کے ساتھ اس فاتح سیزر کو دیکھتی رہی۔

عیشہ کو اپنی دادی یاد آگئیں۔

اس کے بیڈ روم سے ملحق ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا۔ اس میں عیشہ کے لیے ٹی وی اور دو چھوٹے صوفے سجے تھے۔ دادی ماں کا تخت پوش بھی یہیں براجمان تھا جس پر وہ سارا دن بیٹھ اٹھ کر، لیٹ کر کروٹیں بدل کر گزارتی تھیں کبھی کبھی تو وہ رات بھی یہیں گزار لیتیں اور اپنے کمرے میں نہ جاتیں۔ شاید دادی کو عیشہ سے پیار تھا یا پھر وہ تنہائی سے گھبرا کر یہاں پڑی رہتی تھیں۔ عیشہ کی سہیلیاں آتیں تو یہ لونگ روم آباد ہو جاتا ورنہ عیشہ تو ٹیلی ویژن اپنے کمرے میں ہی دیکھتی تھی۔ ہاں بیڈ روم تک پہنچنے کے لیے اس کمرے کو الانگنا ضرور پڑتا تھا۔ ایسے میں کبھی کبھی وہ دادی کو اوپری سی چھچھی ڈال کر ان کا سفید سر بھی چوم لیتی۔ کبھی کبھار دادی کو جھنجھوڑ کر جگا بھی دیتی...... ایسے بھی ہوتا کہ اس کے ہاتھ میں سینڈوچ یا پیسٹری ہوتی تو وہ دادی کو بہ اصرار کہتی۔

"دادو ایک بائیٹ پلیز......"

"ناں بچے میں نے ابھی دانت برش کیے ہیں......"

"دانتوں کا کیا ہے دادو...... میں دھلا لاؤں گی۔"

دادو مسکرا کر اس کی خوشی پوری کر دیتی...... اس آتی جاتی، بارہ بانی لڑکی کے ساتھ دادی کا تعلق برسات کا سا تھا۔ ملی تو جل تھل نہیں تو خشک سالی...... نہ تو عیشہ

بیگانہ خو نے اس رشتے کو بہتر بنانے کی سوچی نہ ہی دادی کے ہونٹوں پر کوئی گلہ آیا...... وہ تو سارا دن لکڑی کی براؤن تسبیح پر نہ جانے کیا کچھ بڑبڑاتی رہتی تھیں۔

تب عیشہ کو انفلوئنزا ہو گیا تھا۔ سارا دن بستر میں پڑے رہنے اور مائی سینوں کو پھانکنے سے جب اس کی طبیعت اوب گئی، تنہائی کاٹنے لگی تو عیشہ نے اپنے آپ کو چیتے کی لکیروں والے کمبل میں لپیٹا اور دادی کے تخت پوش پر کچھ لیٹی کچھ بیٹھی جا گھسی۔ دادی حسب معمول ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔

"دادو......"

"ہوں......"

عیشہ نے دادی کے ہاتھ سے تسبیح لے کر اپنے ہاتھوں میں قید کرلی۔

"یہ آپ سارا دن کیا پڑھتی رہتی ہیں اس پر......"

لکڑی کے تسبیح دانے گھس کر آدھے رہ چکے تھے۔

"کچھ نہیں......"

"جائیں جائیں دادو...... صبح وشام آپ کے ہونٹ ہلتے رہتے ہیں...... کونسی سورتیں پڑھتی ہیں آپ ہمیں بھی کچھ بتائیں۔" اسے کب کچھ پڑھنا پڑھانا تھا۔ ویسے ہی تکلفاً اس نے کہا۔

"بھلی لوک میں تو باتیں کرتی ہوں اللہ...... سے میں کب ورد وظیفہ کرتی ہوں۔"

"اور وہ سنتا ہے......؟"

"ساری...... ایک ایک۔"

"دادو...... اللہ کو اور کوئی کام نہیں سوائے آپ کی باتوں کے۔"

دادی مسکرائی۔ اس کے ہونٹوں پر ایسی ملائمت آگئی جس نے جوانی میں بڑے ابا کو متاثر کیا ہوگا۔

"اللہ کا مزاج بھی شوہر کا مزاج ہے بی بی...... وہ سنتا ہے مانے نہ مانے اس کی مرضی پر سنتا ہے۔"

پہلی بار عیشہ کے لیے دادی کی بات قابلِ توجہ ہوئی...... وہ دادی میں گھس کر بولی "شوہر کا مزاج؟...... وہ کیسا ہوتا ہے دادو۔"

دادی کچھ کسمسائی پھر اس نے اپنے آپ کو بٹورا......" بات یہ ہے عیشہ بیگم جب نئی نئی شادی ہوناں تو شوہر ساری باتیں سنتا ہے چونکہ سنتا ہے تو ساری باتیں مانتا بھی ہے۔ ماننے والا دراصل سننے والا ہوتا ہے...... پھر ہولے ہولے باتوں کا بینک خالی ہو جاتا ہے تو بیوی کو سمجھ نہیں آتی کہ اس کی توجہ کیسے حاصل کرے۔ اب ساس بہو کا جھگڑا شروع ہوتا ہے' اس کی رتی رتی روداد بیان میں آتی ہے۔ نندوں کی کہانیاں چلتی ہیں۔ جتنی کہانی دکھ بھری ہو گی اتنی ہی میاں کی توجہ ملے گی وہ کفیل جو ہوا...... اس کی توجہ بیوی کے مسائل سلجھانے پر رہتی ہے...... پھر اگر دو پاٹن کے بیچ والی کہانی ہو...... ایک طرف ماں دوسری طرف بیوی...... ایک جانب بہن دوسری طرف بیوی تو شوہر سے مسئلہ سلجھتا نہیں...... ان بھڑبھڑیا باتوں سے وہ زچ ضرور ہوتا ہے پر سنے بغیر رہ نہیں سکتا...... مسئلے کا کوئی حل نہیں نکلتا پر بات ضرور...... بر ضرور سنتا ہے...... اللہ کا بھی شوہر جیسا مزاج ہے عیشہ بیگم......"

"پھر وہی بات دادو...... اگر اللہ میاں جی نے سن لیاناں تو آپ کو گناہ ہو گا۔"

"جب تیرے بڑے ابا نے یہ زنانہ جھگڑے سننے بند کر دیئے...... آخر وہ بھی توجج تھے سارا دن ان کا بھی جھگڑوں میں گزرتا تھا...... جب انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ نہ ماں کی سنیں گی نہ بیوی کی...... تو پھر...... میں بیمار رہنے لگی...... اب بیماری کے بیان سے تو وہ لاپروا نہیں رہ سکتے تھے۔ باتیں پھر شروع ہو گئیں...... ڈاکٹر نے کیا کہا؟...... کیا تجویز کیا...... رفتہ رفتہ یہ باتیں بھی تیرے بڑے ابا سنتے نہیں تھے...... موجود رہتے ظاہر کرتے کہ سن رہے ہیں۔ پر بات ان کے اندر نہ جاتی...... بلڈ پریشر کی داستان کوئی کب تک سنے بی بی......؟ شوگر کے مریض کی داستاں کہاں تک؟ یہی وہ وقت تھا جب تمہارے بڑے ابا کو چھوڑ کر میں نے اللہ میاں کو پکڑ لیا......"

"شیم...... شیم دادو شیم...... بڑے ابا کو چھوڑ دیا؟ شیم!"

"چھوڑا نہیں بچڑ! ابا تیں کرنا چھوڑ دیں بس بچہ اللہ کا مزاج بھی شوہر کا مزاج ہے...... زیادہ دکھ بھری داستان کو وہ بڑے کان لگا کر سنتا ہے...... کچھ غم مٹا بھی دیتا ہے کچھ الجھنیں سلجھا بھی دیتا ہے لیکن اگر سارے ہی غم سلجھ جائیں تو آدمی اور اس میں بات چیت بند ہو جاتی ہے...... بیماری نہ ہو تو ڈاکٹر کے پاس کوئی کیوں جائے؟ جھگڑا نہ ہو تو وکیل کس کام کا؟...... بس خود ہی مصیبت بھیجتا ہے اور خود ہی ثالث بن جاتا ہے......

اگر زندگی میں راحت ہی راحت ہو' چین ہی چین ہو تو کون اس کا در کھٹکھٹائے' کون اس سے باتیں کرے...... اللہ جی شوہر اور باقی ساری مخلوق زن...... جتنی کہانی دکھ بھری ہو گی اس قدر توجہ ملے گی...... یہ کھیل تو ازل سے ہو رہا ہے۔ بی بی عیشہ...... تھوڑے ہوں گے جو شکر گزاری کی باتیں کرتے ہوں باقی سب تو گلہ گزاریوں میں وقت گزارتے ہیں' دکھڑے بیان کرتے ہیں اور توجہ لیتے ہیں۔ اور وہ تیرا رابن ہڈ نہیں تھا؟ جو لوگوں کی مدد میں خوار پھرتا تھا...... بس اوپر بھی ایک رابن ہڈ بیٹھا ہے...... سب کی سننے والا...... سب کے لیے مارا مارا پھرنے والا۔"

وہ دادی کی بات گل خاں سے کرنے والی تھی لیکن اس کا تو سامان پیک ہو چکا تھا اور وہ کچھ اندر باہر ہو رہا تھا۔ اس نے ملیشیا کے سوٹ کے نیچے جوگرز پہن رکھے تھے۔ سر پر سواتی ٹوپی اور جیب کے اوپر سیفٹی پن کے ساتھ پاکستان کا چھوٹا سا جھنڈا لگا تھا۔ یہ پاکستانی جھنڈا بھی کچھ غریبوں کی آبرو سا بن گیا تھا۔ عیشہ کی کلاس کے لوگ اس جھنڈے سے محبت کے اظہار کو چیپ خیال کرتے تھے۔ عیشہ تو صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ گل خاں کو اس گھر سے بچھڑنے کا کتنا دکھ ہے لیکن اس گریک دیوتا کے دل میں اگر ملال تھا تو اس نے کہیں اندر ہی اندر کسی کال کوٹھری میں اسے مقفل کر رکھا تھا...... عیشہ کو علم تھا کہ ڈرائیوروں کی حیثیت گھریلو خلاصیوں سے مختلف ہوتی ہے۔ ڈرائیور غریب رشتہ دار کی طرح خاندان سے خارج تو ہوتا ہے لیکن وہیل پر براجمان رہنے کی وجہ سے اس میں ایک خوش اعتمادی ایسی آجاتی ہے کہ وہ مالک اور اس کے گھر والوں کو کچھ نہیں سمجھتا۔ بلکہ اپنے آپ کو رہبر' جان بچاؤ' ٹھکانے پر لے جانے والے کی طرح وہ اندر ہی اندر مکئی کے دانے کی طرح پھول جانے کی قوت رکھتا ہے۔ باقی ملازموں سے بہتر کھانا' باوردی ہونے کی حالت میں اپنے آپ کو نمایاں سمجھنا اس کی عادت ہوا کرتی ہے...... شیشے میں سڑک کا پچھلا حصہ دیکھنے کی ضرورت کو پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خواتین کی نظروں سے متصادم رکھنے کو ترجیح دینے میں کوئی برائی نہیں سمجھتا۔ ساتھ والی سیٹ پر اگر گھر کا مالک بیٹھا ہو تو ڈرائیور مودب' حاضر دماغ' لیس سر جی سر صاب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اگر کار میں وہ تنہا ہو تو مابدولت کے انداز میں کار کو بہ نفس نفیس یوں ڈرائیو کرتا ہے گویا کار اس کی زر خرید ہو۔ گھر کی ایک آدھ خاتون ساتھ سفر کر رہی ہو تو کار کے دروازے بددلی سے کھولتا ہے۔ بری طرح سے کار پارک کر کے کار سے باہر

نکل کر انتظار کرنا اس پر دو بھر ہوتا ہے...... ڈرائیور لوگوں کا عموماً باورچی خانے میں پھڈا رہتا ہے۔ وہ ناشتے کے معاملے میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔ انڈہ کیسے تلا گیا؟ پراٹھا کیونکر بنا۔ چائے ٹھنڈی تھی کہ گرم ایسی باتوں کے معاملے میں ان کی رائے حتمی ہوتی ہے۔ جس قدر بڑا صاحب ہوگا اسی تناسب سے اس کا ڈرائیور نازک مزاج ثابت ہوگا۔ فنکشنوں پر عموماً ڈرائیور حضرات کے لیے بعد میں میز لگتی ہے اور وہ مال غنیمت بٹورنے کے انداز میں روسٹ 'کولڈ ڈرنکز' فرنی کی ٹھوٹھیاں اڑاتے ہیں۔ پھر ہر گھر میں ان کے لیے خاص ٹرے لگ کر آتی ہے...... انوکھا لاڈلہ بنتے انہیں دیر نہیں لگتی۔ باوردی پی کیپ والا ڈرائیور مور پنکھ لگے انداز میں ناچتا ہوا دروازے کھولتا اور نرت کے انداز میں صاحب کے آگے پیچھے پھرتا ہے۔ ڈرائی کلینرز سے پلاسٹک کے لفافوں میں ملفوف کپڑے لے کر آتا ہوا ڈرائیور اس قدر اہم ہوتا ہے گویا ملک کے صدر کو سفارت کار اپنے کاغذات پیش کرنے جا رہا ہو...... کچھ تھوڑی بہت کمی بیشی کے ساتھ ڈرائیور تال پر جمے ہوئے کنول کی طرح نمایاں رہتا ہے۔ جن ڈرائیوروں کو زنانہ سواری کا ساتھ رہے وہ میوزک کے بھی عادی ہو جاتے ہیں۔ انہیں سر تال کی پہچان اور ماڈرن گانوں سے کچھ ایسی وابستگی ہو جاتی ہے کہ موسیقی کے بغیر ان سے گاڑی نہیں چلتی۔ اگر خواتین ماڈرن ہوں تو وہ مغربی موسیقی لگائے گا' اگر دین اسلام کی پابند' حجاب میں ملبوس ہوں تو پھر ہندوستانی موسیقی کا سہارا لے گا...... ڈرائیور سڑک پر ایک اور ہی شخصیت ہوتا ہے۔ اگر پُراعتماد صاحب حیثیت لوگوں کا ساتھ ہو تو وہ اوورٹیک کرتے وقت احتیاط' اشارے کی پابندی اور لائنوں کا خیال رکھتا ہے۔ اگر یوں ہی کچرا قسم کے لوگ بیٹھے ہوں تو اوورٹیک کرتے وقت دائیں بائیں کا خیال نہیں کرتا۔ لال اور ہری بتی برابر ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی پولیس مین سے ٹاکرا ہونے پر اس کے کئی ہتھکنڈے ہوتے ہیں۔ پہلے تو خوشامد درآمد سے کام چلاتا ہے۔ نہ چلے تو کاغذات کے ساتھ ڈرائیونگ لائسنس میں دس بیس روپے ڈال کر کام چلاتا ہے...... اس پر بھی ظلمی بالما پولیسیا ٹلا نہ مانے تو چالان کٹا کریوں کوٹھی میں داخل ہوتا ہے گویا اولوں کی ماری فاختہ سردیوں میں بن پتوں کی شاخ پر بیٹھی ہو' لیکن گل خاں ڈرائیوروں کی **Category** میں سے نہ تھا۔ جب وہ تروجبّا سے نوکری کی تلاش میں پشاور آیا۔ تو چھوٹے سے شیشے کنگھی کے ساتھ اپنے سنوارنے کو وہ علم بھی ساتھ لے آیا جس پر اس کے یوسف زئی

خاندان کا ابھی تک ایمان تھا۔ اسے پہلے پہل تو پشاور میں دقت پیش آئی کیونکہ پشاور بھی عبوری دور سے گزر رہا تھا۔ لوگ ترقی شکار کرنے کے لیے کئی قسم کے ذرائع ہتھیار استعمال کرنے لگے تھے...... وہ خاموش رہ کر سوچتا رہتا اس کے باپ باچا خان نے کہا تھا...... "او یرا گل خاں تم تروجبّا چھوڑ کر جاتا ہے۔ آشیانہ چھوڑتا ہے لیکن ایک بات یاد رکھنا جو چپ رہ کر سنتا نہیں وہ کچھ نہیں سیکھتا......"

کرنل صاحب کی کوٹھی پر یہ چپ اس کے بہت کام آئی۔ گل خاں اپنے ماموں کے ساتھ کوارٹر میں رہتا تھا۔ ماموں بادشاہ خاں کرنل صاحب کا بیٹ مین تھا۔ اندر باہر کی خدمت پر مامور ساری خبروں سے مطلع' حکمت عملی سے ہتھیار بند' نشست و برخاست میں پُھرتیلا بہت جلد اس نے گل خاں کو شہری بندہ بنا دیا۔ پھر کرنل صاحب نے مہربانی کی اور اسے اپنا ڈرائیور مقرر کر لیا۔ لیکن بدقسمتی سے کرنل صاحب کی تبدیلی کوئٹہ سٹیشن کی ہوگئی۔ جاتے وقت وہ گل خاں کو جج صاحب کے نام رقعہ دے گئے۔ یہی رقعہ لاہور میں اس کی نوکری کا باعث بنا اور اس رقعے کی بدولت وہ لاہور پہنچا۔

گل خاں کو جج صاحب کی کوٹھی پر سب "خان" کہہ کر بلاتے تھے۔ وہ کبھی زیادہ بات نہ کرتا۔ آنکھیں نیچی کیے رہتا اور ملازموں سے سروکار نہ رکھتا۔ اپنے چھوٹے سے ریڈیو پر پشاور سٹیشن لگا کر "وئی وئی" قسم کے گانے سنتا۔ خبریں بھی سنتا لیکن کئی خبریں اسے بالکل سمجھ نہ آتیں۔ باقی ملازم اندر جا کر دادی ماں کے تخت پوش کے اردگرد بیٹھ کر ٹیلیویژن دیکھتے' بعد میں پروگراموں کو آپس میں بڑی گرمجوشی سے زیر بحث بھی لاتے لیکن خان کو اندر جاتے ہوئے حجاب آتا۔ اس کی غیرت دو رویہ تھی۔ اس کی غیرت کا ایک راستہ اس کے تحفظ کے لیے تھا لیکن دوسری راہ اس نے فرار ہونے کے لیے بوقت ضرورت چھپا رکھی تھی۔

گل خاں نے شلوار قمیض پر پی کیپ پہن لی اور تھوڑا سا مضحکہ خیز لگنے لگا۔ عیشہ نے بھی اس کے حلیے کو دیکھ کر ریلیف محسوس کیا۔

"خاں تو تمہارا ارادہ تروجبّا جانے کا ہے۔"

"آ جی......"

"لیکن......"

"لیکن کا وقت گزر چکا اے جی......"

اس وقت وہ ہر قیمت پر فرار ہونے کو ترجیح دینے پر مجبور تھا۔

عیشہ کا جی بیٹھ سا گیا وہ پڑھی لکھی' کافی حد تک خود سر' خود پسند اور خود آرا تھی۔ گھر میں اس کا ٹکٹ سکہ چلتا تھا۔ اسے بیٹوں سے بھی بڑھ کر پیار ملتا تھا۔ امی اس کی طرفداری کے باعث جج صاحب پر حکومت کرتی تھیں۔ جب خواہش عیشہ کی ہوتی تو امی کو اپنی بات منوانے میں دقت پیش نہ آتی۔ گو جج صاحب کو ریٹائرڈ ہوئے کچھ سال ہو گئے تھے اور اب ان کی سوشل لائف بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ بازاروں' ہوٹلوں میں مارے مارے پھرنا انہیں قدرے معیوب لگتا۔ وہ اپنی سروس کے دوران بڑی محتاط اور Reserved زندگی گزار چکے تھے۔ اتنی سنجیدہ زندگی کے بعد انہیں سڑکوں پر دہی بھلے' چاٹ' چھلیاں کھانا معیوب لگتا۔ درزیوں' رنگسازوں' جیولرز کے پھیرے ماں بیٹی اکیلی ہی لگاتی تھیں...... لیکن اس کا خیال تھا کہ اگر عیشہ ڈرائیونگ سیکھ لے تو وہ دونوں اور بھی آزادانہ گھوم پھر سکتی ہیں۔ عیشہ کو ڈرائیونگ کی ضرورت اس لیے درپیش تھی کہ بغیر ڈرائیور کی کار میں سہیلیوں کی بے تکلفی بڑھ جاتی۔ بدبخت ڈرائیور کی موجودگی میں زیادہ گفتگو انگریزی میں کرنا پڑتی اور کئی ایسی باتیں زیر بحث نہ آسکتیں جو اپنی زبان ہی میں لطف دیتی تھیں۔ پھر یہ بھی خدشہ رہتا کہ ڈرائیور صاحب کوٹھی پہنچتے ہی پٹرول کے حساب کے ساتھ ساتھ عیشہ بی بی کا ٹور بھی بیان کرنے لگتا۔

تروجبا کا گل خاں ڈرائیور کم گو' خوبصورت اور بہت فاصلے پر رہنے والا آدمی تھا۔ وہ عورتوں سے بے تکلفی سیکھا ہی نہ تھا۔ جب بھی عیشہ اور اس کی چاروں جی جان سہیلیاں اکٹھی کسی ہوٹل' کلچرل فنکشن' میلے' بینیفٹ شو پر جاتیں تو عیشہ کو فرنٹ سیٹ پر بیٹھنا پڑتا۔ گل خاں کا بایاں بازو گیئر لگاتے ہوئے اس کے بہت ہی قریب ہو جاتا اور سنہری بالوں والا یہ بازو اسے باغ بہشت کا من چاہا پھل لگتا...... دراصل ساری داستان اس سنہری بازو سے شروع ہوئی تھی۔ کبھی کبھی جب سہیلیوں کا جھرمٹ چھلیاں کھانے رکتا اور گل خاں کار سے نکل کر ان سب کی طرف کمر کر کے کھڑا ہو جاتا تو عیشہ کو لگتا گل خاں انسان نہیں گٹار ہے اور اس میں ان گنت گیت اور سُر بند ہیں۔ کسی ایسے ہاتھ کی کسر ہے جو ان سروں کو آزاد کرا سکے۔

کبھی کبھی چھلیاں کھاتے کھاتے یا قلفی چاٹتے ہوئے یا گول گپے سڑکتے ہوئے ان نوجوان سر پھریوں کو گل خاں کا بھی خیال آ جاتا اور وہ اسے بھی کھانے میں شریک

کر لیتیں۔ لیکن گل خاں ہمیشہ گاڑی کی طرف پیٹھ کر کے اس تواضع میں شامل ہوتا۔ کسی لڑکی نے کبھی اسے کھاتے نہیں دیکھا تھا۔

جب بھی پانچ کا یہ ٹولہ باہر نکلتا ان کی کوشش ہوتی کہ کچھ ایسا کریں جو ان کے ماں باپ عام طور پر کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ سڑکوں پر کھڑے ہو کر کھانا' اونچے اونچے گاتے جانا' دوپٹے گاڑی میں پھینک پھانک سڑکوں پر اٹھلے گھیلے پھرنا' لوگوں پر ریمارک کسنا' دکانداروں سے جھگڑا کرتے کرتے فلرٹ کرنا' راہ چلتوں پر چلتی گاڑی میں سے چھلکے پھینکنا اور اس بے ہودگی کو آزادی سمجھنا' اپنے ماں باپ کی کھلم کھلا بدگوئی' غیبت اور چغلی کھانا...... ان کے انجوائے منٹ کے کچھ یہ طریقے تھے۔ یہ پانچوں سوسائٹی کے وی آئی پی طبقے کی شستہ پڑھی لکھی آزاد لڑکیاں تھیں۔ ان کا اخلاق درست آداب محفل پالش شدہ' لباس ماڈرن' تعلیم پختہ اور انداز زیست میں آسائش' آرائش اور زیبائش بہت تھی۔ اس لیے وہ جب بھی اکٹھی ہوتیں ان کا جی چاہتا کہ زندگی کے تمام اصول توڑ کر کچھ سر پھرے' پاگل پن' وحشی ہونے کا ثبوت دیں۔ جس کو نئی بات سوجھ جاتی وہی بازی جیت جاتی۔

"یہ تمہارا ڈرائیور تو پورا کلارک گیبل ہے......" انگریزی میں خولہ کہتی......

"اگر اسے تھری پیس سوٹ پہنا دیں تو سیدھا فلم ایکٹر بن سکتا ہے۔"

"یار یہ تو سیدھی مصیبت ہے...... آدمی اس کو دیکھے کہ بات کرے۔ پلیز عیشہ تم ڈرائیونگ سیکھ لو...... میں تو پیچھے سے اسے دیکھ دیکھ کر پاگل ہو جاتی ہوں...... پتہ نہیں تم کیسے ساتھ بیٹھی ہو......" مونا کہتی۔

"اب گیئر بدلے ناں تو اس کے ہاتھ پر اپنے ٹیشو کا گولا بنا کر مارنا...... دیکھو کیا کرتا ہے؟"

پیچھے بیٹھی چاروں لڑکیاں انگریزی میں تبصرہ جاری رکھتیں۔ عیشہ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر اس طرح الٹی ہو کر بیٹھتی کہ اس کا چہرہ کبھی کبھی گل خاں کے کندھے کے بہت قریب ہو جاتا۔ ایسے میں گل خاں نے کبھی کنکھیوں سے بھی عیشہ بی بی پر نظر نہیں ڈالی لیکن جو خوشبوئیں بی بی استعمال کرتی تھیں ان کا گل خاں پر نسوار سے زیادہ اثر ہوتا۔ اس کے ہاتھ وہیل پر ذرا ذرا لرزنے لگتے...... وہ جی ہی جی میں سوچتا۔ یہ

بھی خدا کی قدرت ہے...... مصیبت بدل جاتی ہے لیکن ختم نہیں ہوتی...... بیروزگاری کی مصیبت سمجھ میں آتی تھی۔ اس مصیبت کا نہ تو سر تھا نہ پیر...... بس چھلیڈا کی طرح کبھی لمبا' کبھی چھوٹا چھوٹا بونا سا...... کبھی بالوں والا جھبرا' کبھی سوکھی شاخ بن کر ننگے پنڈے پر چابک کی طرح پڑنے والی مصیبت! گل خاں سامنے پورا تیار کھڑا تھا جیسے کوئی ہاری ہوئی فوج پسپا ہو رہی ہو۔

"کیوں؟ تم آخر کیوں جا رہے ہو گل خاں......"

"وجہ تو کوئی خاص نہیں ہے سر جی پر...... ادھر ہمارا باپ ہے...... باچا خاں وہ کہتا تھا...... جب کوئی جگہ تم کو قبول نہ کرے گل خاں تو پھر ادھر لوٹ آنا۔ باپ کا گھر تمہیں ہمیشہ قبول کرے گا۔" گل خاں نے جیسے اچانک حملہ کر کے کہا۔ "تم تو عیشہ بی بی ام کو ہر حال میں قبول نہیں کر سکتا لیکن ایک ہمارا اوالد ایسا ہے جو کوئی شرط پیش نہیں کرتا۔" لیکن یہ بات اس نے زبان سے نہ نکالی۔

عیشہ نے محسوس کیا کہ گل خاں نے اس کے جبڑے پر پنچ مارا وہ اس اتفاقی حملے کی مدافعت نہ کر پائی...... بہت سال پہلے جب اس نے پیلی بلٹ کے لیے جوڈو کراٹے کی ٹریننگ شروع کی تھی تو اس کے استاد جمال صاحب نے تعلیم کے آغاز میں چھوٹے چھوٹے گُر اسے سمجھائے تھے۔ سب سے اہم بات جو وہ بار بار دوہراتے یہی تھی۔ "یاد رکھو کراٹے میں لڑائی کا آغاز نہیں کرنا۔ اس کا طریقہ واردات سب لڑائیوں سے مختلف ہے۔ یہ مارشل آرٹ اپنی دفاع کے لیے کیا جاتا ہے۔ لڑائی کے لیے نہیں' اس لیے ہمیشہ ہمیشہ دوسرے کے وار کو رڈ کرنا سیکھو' دوسرا آغاز کرے تم وار روکو...... اور پھر حملہ کرو...... اپنی Defence میں ٹرائی کرنا ہے...... لڑائی شروع نہیں کرنا۔"

جہاں تک کراٹے کا تعلق تھا وہ حملوں کو Block کرنا سیکھ گئی تھی۔ گفتگو میں بھی وہ رک کر بات سنتی اور پھر پلٹا کر یوں زناٹے دار جواب دیتی کہ بات کرنے والے کا سر دونوں کانوں کے درمیان آ جاتا۔

لیکن گل خاں نے اسے ایسا پنچ مارا تھا کہ وہ بھنا گئی...... کوئی ایسا انسان تروجبّا میں موجود تھا جو گل خاں کو ہر حال میں قبول کرنے کو تیار تھا...... اور وہ...... اور اس کا گھرانہ؟

چھ ماہ پہلے کی بات ہے جب اس نے ڈرائیونگ سیکھنا شروع کی۔ پہلے پہل تو

بیگم صاحبہ بھی مارے لاڈ اور تحفظ کے ساتھ جاتی تھیں لیکن پھر ان کی مصروفیات ایسی تھیں کہ وہ باقاعدگی سے ساتھ نہ دے سکیں۔ کچھ عرصہ ایئرپورٹ کے پچھواڑے کھلی سڑکوں اور پارکوں کی سائیڈ لینوں پر پریکٹس جاری رہی۔ گل خاں نے اپنے اور عیشہ کے درمیان گیئر کو ہمیشہ تلوار سمجھا اور کسی قسم کی آزادی نہ چاہی' نہ مانگی۔ وہ ڈیورنڈ لائین سے لے کر مذہب کی حدود تک اور مالک اور ملازم کے درمیان واضح اور غیر واضح فاصلے کو خوب سمجھتا تھا۔

لیکن پھر ایک واقعہ کلمہ چوک پر ہو گیا۔

عیشہ اب بلا جھجک گاڑی چلاتی تھی۔ امی کو ساتھ بٹھا کر کئی بار کم آمد و رفت کے راستوں پر لے جاتی۔ اس روز وہ اپنی فرنچ کلاس سے واپسی پر گلبرگ کی جانب سے آ رہی تھی رش زیادہ تھا۔ سکولوں سے لوٹنے والے طالب علموں کا رش' اوورٹیک کرنے کی خواہش میں مبتلا ڈرائیور' سڑک کو ذاتی ملکیت سمجھنے والے انا پرست' بتیوں کے حکم سے آزاد لوگوں نے کلمہ چوک کے چاروں جانب ہڑبونگ مچا رکھی تھی...... عیشہ وہیل پر تھی۔ آخری حکم جو گل خاں نے دیا یہ تھا...... "سر...... اپنا لین میں گاڑی رکھو...... لیکن عیشہ ہمیشہ آگے نکلتی آئی تھی ابھی وہ اپنی لین میں رہنا نہ سیکھی تھی۔ یکبارگی جو اس نے وہیل موڑی تو کار تیورا کر بجری بھرے ٹرک سے بھڑ گئی۔ گل خاں نے ہر قسم کی بندش توڑ کر وہیل کو موڑنے کی کوشش کی اس کے دونوں ہاتھ عیشہ کے ہاتھوں پر تھے۔ گل خاں نے بڑے حادثے سے تو عیشہ کو بچا لیا۔ لیکن بریک لگنے پر عیشہ کی بائیں گال اور سر وہیل سے جا ٹکرایا اور خون کا ایک فوارہ اس کی گال سے نکل کر گل خاں کی قمیض پر پڑنے لگا...... یہی وہ وقت ہے جب گل خاں بھول گیا کہ وہ ڈرائیور ہے...... تروجبّا سے آیا ہے...... غلط لین میں جاتے وقت گل خاں کو بھی علم نہ ہو سکا کہ عیشہ بی بی کی گال پر تو چار ٹانکے ہی لگیں گے لیکن گل خاں کی قمیض پر لہو کے ایسے دھبے پڑ جائیں گے جنہیں سندھ دریا کا سارا پانی بھی نہ دھو سکے گا......

بات گفتنی' ناگفتنی واقعات کی نہیں اچانک سارے گھر میں گویا فائر بریگیڈ کے سائرن بجنے لگے۔ جج صاحب نے کسی قسم کی عینی شہادت نہ مانگی۔ کوئی سلطانی گواہ بھی موجود نہ تھا۔ جو کچھ حادثے سے لے کر ہسپتال تک ٹانکے لگوانے کی تفاصیل تھیں وہ بھی جج صاحب کے کان تک نہ پہنچیں۔ جج صاحب برسوں انصاف کی تکڑی کا توازن

درست کرنے میں مشغول رہے تھے۔ انہوں نے معاملہ حدود سے آگے بڑھنے نہ دیا اور گل خاں کو بلا کر فائر کر دیا۔ وہ یہ بھی جاننا نہ چاہتے تھے کہ گل خاں عیشہ کو گھر لانے کے بجائے کیسے ہسپتال لے گیا؟

"گل خاں تم اچھے صاف ستھرے نیک اور دیانتدار آدمی ہو لیکن میں تمہیں آج کے بعد یہاں نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں نے بیگم صاحبہ کو بتا دیا ہے۔"

"جی صاب......"

گل خاں پیروں پر مڑ گیا وہ اپنے آنسو جج صاحب سے چھپانا چاہتا تھا۔

"سنو گل خاں......"

"جی صاب...... اگر میں اکیلا ہوتا تو ساری عمر تمہیں ڈرائیور رکھتا لیکن اب مشکل ہے......"

گل خاں کچھ معافی مانگنے کے لیے الفاظ تلاش کر رہا تھا لیکن اس کی آواز حلق سے نہ نکلتی تھی۔

"جی صاب......"

"سنو گل خاں میں نے اس واقعے سے ایک سبق سیکھا ہے کہ کبھی کسی خوبصورت ڈرائیور کو اپنے گھر نہیں رکھوں گا۔ اگر چاہو تو میں تمہیں ایک نصیحت کر سکتا ہوں......"

"آ جی......"

"کبھی کسی ایسے گھر میں نوکری نہ کرنا جہاں عورتیں ہوں...... تمہارا انجام آج سے مختلف نہ ہوگا......"

عیشہ کی بائیں گال پر چار ٹانکے ابھی بھی تازہ تھے۔ گل خاں نے اپنا اٹیچی اٹھا رکھا تھا اور وہ چلنے کے لیے تیار تھا۔

"گل خاں...... تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ جا سکتی ہوں...... ابھی اسی وقت ہمیشہ کے لیے۔"

"او تو ٹھیک اے جی لیکن ام آپ کو ساتھ لے جا نہیں سکتا۔"

"وہ کیوں گل خاں کیوں...... کیوں کیوں۔"

"ہمارا باپ باچا خاں بولتا ہے جی نہ تو کبھی دین کے معاملہ میں مناظرہ کرنا

ہے گل خاں اور نہ کبھی کسی عورت کے ساتھ بحث کرنا ہے...... تمہارا قلب سیاہ ہو جائے گا۔"

"اور تم اپنے باپ کی ہر بات مانتے ہو گل خاں......"

"مجبوری اے جی......"

"اچھا جاؤ پھر دفع ہو جاؤ فوراً...... یہ مت سمجھنا کہ دنیا میں ایک تم ہی فٹے منہ رہ گئے ہو...... جاؤ...... اسی وقت چلے جاؤ...... میں تم پر ذرا مہربان کیا ہو گئی تھی تم تو آسمان پر ہی چڑھ گئے......"

"ام گرد و غبار اے عیشہ بی بی...... بیٹھ جائے گا......"

گل خاں کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپ سے گرے اور وہ جلدی جلدی بڑے پھاٹک کی طرف چلنے لگا...... آنسو صرف دو تھے لیکن اس طغیانی میں عیشہ ساری کی ساری بہہ گئی۔

"گل خاں سنو......"

گل خاں اپنے پیروں پر میخا گیا۔

"جی صاب۔"

"یہ میرے بائیں گال کو دیکھتے ہو......"

"برا ہوا عیشہ بی بی......"

"یہ داغ ہمیشہ رہے گا...... گل خاں...... جب بھی میں آئینہ دیکھوں گی...... یہ داغ مجھے ستائے گا......"

گل خاں کی آنکھوں کا رنگ اب آنسوؤں کی وجہ سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے عیشہ کو بتانا چاہا کہ وہ بھی اس سفید جوڑے کو کبھی دھونے کا ارادہ نہیں رکھتا جس پر لہو کے داغ تھے لیکن آواز نے اس کا ساتھ نہ دیا......

گل خاں مڑ کر پھاٹک کی طرف جانے لگا تو عیشہ نے محسوس کیا کہ پتھر کا دیوتا تو دراصل موم کا پتلا تھا...... اتنی سی حدت سے سارا کا سارا پگھل گیا۔

سفید لکڑی کی گفنگیر کی طرح نچلی طرف گڑھا سا دکھاتے اور اٹھتے رہے۔

آواز آئی...... ہوتے ماٹے پینگاں پائیاں......

راجے دی وہٹی آئی جے...... آئی جے آئی جے......

ہر بار جب راجے کی رانی منے کے روپ میں اس کے سینے تک آئی تو وہ گہری شربتی آنکھیں اس کی جانب کر لیتی ہے اور اس کے ہونٹوں کے کناروں میں تھوڑا سا رونا کہیں سے آ چھپتا۔

حارث کے سامنے گڈھوں والے پاؤں گہری شربتی آنکھیں اور چھپے چھپے رونے آ بسے۔

اختری عزیزہ کی ضد تھی اور عزیزہ اختری کی......

اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ اب ان دونوں کا شعاعی لباس سبز تھا اور وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے ایک ہی گانٹھ سے جڑی ڈالیوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔

ان دونوں سے حارث کا کیا تعلق تھا؟ کیا رشتہ تھا۔

رحم کا رشتہ؟ ترس کا تعلق؟...... ان جانی چیزوں کو دیکھ لینے پاس سے چھو لینے کا شوق؟

کیا چیز تھی جو باقی نہ رہی۔ جیسے ایک کھڑکی سے تیر اندر گھسے اور سیدھا دوسری کھڑکی سے باہر نکل جائے......

اختری اور عزیزہ......؟

ایک کھڑکی سے دوسری کھڑکی تک کا فاصلہ......

حارث ان جانی پتھریلی راہوں پر گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا اس کا جسم زخموں سے نا آشنا تھا نہ جسم پر ان نوکیلے گھنگھریالے پتھروں کی ضرب لگتی تھی چاروں طرف چپ چاپ سکون تھا۔ آگ بجھ جانے کے بعد کی سی کیفیت اور اردگرد ان گنت ہیولے بے شمار رنگوں کے بہاوے ڈول رہے تھے ہل رہے تھے بے مصرف پھر رہے تھے حارث منتظر تھا۔ وہ اس کا منتظر تھا جس نے کبھی نہ آنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

حارث نے میلوں گہرے اندھیرے شگاف میں دیکھا اور آہستہ سے آواز دی...... "جمیلہ......!......"

اس نے لمبی کھائی کی دوسری جانب دیکھا وہاں کوئی نہ تھا۔ بس دھول سی ہوا

میں معلق تھی۔ شگاف کے اندر لاوا سوکھ چکا تھا۔ پانی عکس میں بدل گیا تھا۔ روشنی اور اندھیرا منجمد ہو کر سو گئے تھے اور کوئلے کی کان سی بو اندر سے آتی تھی۔

حارث منتظر تھا۔

صدیاں گزر جانے پر بھی وہ راہ دیکھ رہا تھا۔ منتظر تھا کہ کچھ ہوگا۔ کچھ ٹوٹ بہے گا۔ کچھ کٹ جائے گا۔ کچھ بکھر جائے گا کچھ سمٹ کر مربوط شکل اختیار کر لے گا۔

لیکن شگاف کے اندر...... گہری کھائی میں بہت اندر۔

جیسے جمیلہ مشین چلا رہی تھی۔ دوپٹہ کی لیس بل کھائے سانپ کی مانند جمیلہ کی گود میں پڑی تھی۔ جب انسان کسی سے محبت کرتا ہے تو پہلے اس کی سڑک کے طواف لگاتا ہے پھر پھاٹک پر پہنچتا ہے۔ رفتہ رفتہ برآمدے تک رسائی حاصل کرتا ہے برآمدے سے ڈرائنگ روم کا صوفہ اور صوفے سے بیڈروم کے پلنگ کی منزل۔

پہلے بوسے سے آخری یک جہتی کی منزل میں وقت بھی لگتا ہے اور صبر بھی۔

اور اس کے باوجود وہ دونوں کبھی قریب نہیں آپائے ایک دوسرے کی تلاش میں ایک دوسرے کو آرپار کر کے کہیں وہ دور نکل جاتے اتصال فصل کا باعث بنتا اور یک جہتی انتشار کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔

جمیلہ سے شادی کے بعد وہ جمیلہ کے آرپار ہو کر بہت دور نکل گیا جہاں بگولے اڑتے ہیں اور ایک ہی جگہ اڑتے رہتے ہیں۔

جمیلہ نے اس سے کبھی یوں صحرا بصحرا کو بہ کو اڑنے کی شکایت نہ کی۔ کیونکہ وہ ایک ایسے درخت کی مانند تھی جس کی جڑیں پاتال میں اتر جاتی ہیں۔ جس کے پتوں میں درخت کی سردیوں بھر کی خوراک کاک بند رکھی جاتی ہے۔ جمیلہ نے حارث کی ساری محبت اپنے پتوں میں مہر بند کر کے سمیٹ لی تھی اور قحط سالی کے دنوں میں وہ ان پتوں پر زندہ رہ کر دن پورے کرتی تھی۔

اگر حارث بدمعاش ہوتا اور جسم سے جسم تک گھومتا رہتا تو جمیلہ کی زندگی ایسی نہ ہوتی۔ وہ حارث کی محبت کو اپنے ماں باپ کی محبت کی مانند اوپر طاقچے میں رکھتی اس پر پھول چڑھاتی اور خوش رہتی۔ لیکن شادی کے بعد حارث کا کسی عورت سے جسمانی تعلق تو ہوا ہی نہ تھا۔

ان تلوں میں خوب تیل تھا۔ لیکن یہ تیل جمیلہ کے لئے نہ تھا۔

شگاف سے کھلے بالوں اور نیلے ہاؤس کوٹ والی دراز قد لڑکی نکلی اور حارث نے دیکھا...... یہ لڑکی جس کے ہاتھ پیر بہت اجلے تھے اس کے ساتھ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اسی سیٹ پر جمیلہ بیٹھ کر عموماً نٹنگ کرتی دائیں بائیں دیکھا کرتی۔ اس لڑکی نے گلو بکس کے اوپر والے ہتھی پر اپنا نازک ہاتھ رکھ دیا اور اپنی ڈارس ڈے جیسی کھلی آنکھیں حارث پر مرکوز کر دیں۔ ایسی نظروں کا کیا مقابلہ ہو سکتا۔ ایسی خوشبو جو وہ استعمال کرتی تھی ایسی باتیں جو وہ کرتی تھی ان کا سدباب کیا تھا؟

صرف جمیلہ کی پاتال میں بیٹھی ہوئی جڑوں کو دیمک کھانے لگی تھی۔

حارث ان لوگوں میں سے تھا جس سے زندگی سرخ قالین بچھا کر ملتی ہے۔ اس کی زندگی میں ایسی کوئی لڑکی نہ آئی جس کی طرف اس نے نظر ڈالی اور وہ پلٹتے گیند کی مانند اس کی طرف نہ آئی۔ وہ لڑکیوں کی طرف بڑھتا۔ انہیں اپنی طرف بڑھاتا اور جب دونوں شدت سے ایک دوسرے کی جانب فل سپیڈ سے آتے تو حادثے کے ڈر سے حارث بریک لگا لیتا۔ یہ بریک اس کے سسٹم کے اندر کہیں غیر شعوری طور پر فٹ تھی......

ان لڑکیوں‘ ان رابطوں سے اس کی جانب بڑھتی ایک جمیلہ تھی جو اس کے اور باقی لڑکیوں کے درمیان اندھے شیشے کی طرح جھلملاتی تھی۔

جمیلہ کو پا لینے اور بن باس دے دینے کے درمیان کتنے ہی سال اور دو بچے تھے۔

شگاف کے دوسرے طرف کسی نے پورے زور سے سانس بھری اور آنسوؤں میں ڈوب کر کہا...... ”جمیلے...... شگاف کو چیرتی اندھیروں میں ڈوبتی آواز اس تک پہنچ کر پھنکاری......

”جمیلے......“

جب بھورے بالوں والی ایلا سے وہ ملا تھا۔ تو وہ یورپ میں تھا اور جمیلہ لاہور میں...... اپنی ساتھ والی سیٹ پر ایلا جب ٹھوڑی کو ہتھیلی کے پیالے میں جما کر پروفیسر کی جانب دیکھتی تو حارث کانپ سا جاتا۔ نائیلون کی جرسی بغلوں کے قریب بھیگ کر خوشبو سی چھوڑتی۔

یوڈی کولون‘ گرم کپڑے اور ڈرائی کلین کئے ہوئے بدن کی خوشبو۔

یہ خوشبو حارث کو ایلا کی طرف بڑھا کر لے گئی...... جیسے پھولوں کی خوشبو شہد کی مکھیوں کو بلاتی ہے۔

جب شام کو وہ دونوں بیٹھ کر کالج کے نوٹ تیار کرتے تو ایلا سر پر تولیہ اوڑھ کر پوچھتی...... ”جمیلہ اس طرح دوپٹہ اوڑھتی ہے؟“

”ہاں......“ وہ سانس روک کر کہتا۔

”جمیلہ کی آنکھیں سیاہ ہیں......؟“

”نہیں......“

”جمیلہ سے تم شادی سے پہلے بھی محبت کرتے تھے؟......“

”نہیں......“ وہ جھوٹ بولتا......

”ہمارے ہاں شادی سے پہلے محبت نہیں ہوتی......“

”تو...... تو تمہیں اس سے محبت نہیں تھی شادی سے پہلے......“

”نہیں......“ وہ سانس روک کر کھڑا ہو جاتا......

”حارث......“

”کیا ہے ایلا......؟......“

”اگر تمہاری شادی نہ ہوئی ہوتی......

اگر...... جمیلہ تمہاری بیوی نہ ہوتی تو تم...... یہاں شادی کر لیتے ناں یورپ میں......“

”ہاں ایلا......“

پھر ایلا سر کا تولیہ اتار کر اس میں آنسو جذب کرنے لگتی اور اس کا سینہ پھونکنی کی طرح آپ ہی آپ ہواؤں سے بھر جاتا۔ اور یہ ہوائیں سرد آہوں میں بدل جاتیں اور حارث ایلا کا سر تھپتھپاتا۔ اس کا سارا جسم جبر اور بے بسی کے باعث اینٹھ جاتا۔ پیٹ کے نچلے حصے میں درد ہونے لگتا اور ایلا اس کی ہچکیوں میں اپنی سسکیوں کو سلا دیتی۔

ایلا کی محبت یا نیلے ہاؤس کوٹ والی کی محبت میں وہ سب کچھ نہ ہوا جو عام طور پر عشق میں ہوتا ہے اسی لئے حارث اپنے آپ کو مصلوب سمجھتا تھا وہ جمیلہ سے ناکردہ گناہوں کی داد چاہتا تھا اور جمیلہ ان تلوں کو دیکھتی تھی جس کا سارا تیل دوسروں کے لئے تھا اور کھلی کھلی اس کی جھولی میں پڑی تھی۔

اصل وجہ کچھ نہ تھی جو بظاہر نظر آتی۔

جب بہت سے سال سرخ قالین پر زندگی گزارتے بسر ہو گئے اور بچے دسویں میں جا پہنچے تو جمیلہ کے درخت پر سے چھلکے اترنے لگے۔ پتوں نے ساری خوراک تنے کو دے چکنے کے بعد ڈالیوں کو الوداع کہہ دیا اور ٹنڈ منڈ ڈالیاں خزاں کی ہواؤں میں جھولنے لگیں۔

اب جب زندگی کی سہ پہر آچکی تھی حارث آخری بار بہار کی رات سے آشنا ہوا۔ اس میں جابجا پھول کھلے اسے خوشبوؤں کا احساس ہوا۔ اور جس طرح بودا کپڑا جب زیادہ نچوڑا جائے تو جھیر جھیر ہو جاتا ہے جمیلہ تنکے تنکے ہو گئی اب زندگی میں پہلی بار حارث جمیلہ کے پاس آتا تو جمیلہ کی آنکھیں پھیل جاتیں خوف اور رنج سے وہ سوچتی...... شوہر اور بیوی کا رشتہ کیا ہے؟ صرف ایک گھر میں رہ کر ایک دوسرے کے جسم استعمال کرنے کا رشتہ۔ سارا دن اجنبی بنے رہو اور رات کو ایک تکیے پر سر رکھ کر غڑغوں غڑغوں کرنے لگو......

خدا جانے دن کی روشنی کا رشتہ درست ہے کہ رات کے اندھیرے کا۔

ادھر جتنا زیادہ حارث کو ڈارس ڈے جیسی آنکھوں والی اچھی لگتی اسی قدر شدت سے وہ بیوی کے حقوق کی حق تلفی کو سمجھتا ہوا اس کی تلافی کرتا رہتا۔

لیکن تلافی آخر تلافی ہے اور جس کے ہاتھ آگے سے کھانا اٹھا دیا جائے اور صرف تلافی کی جائے اسے رنج ہوتا ہی ہے گھر میں اب اٹھتے بیٹھتے بحث ہونے لگی۔

جمیلہ کو حارث کی محبت پر اعتبار نہ رہا تھا اور حارث چونکہ دانستہ نئی محبوبہ کی آنچ سے اپنے آپ کو دور رکھتا تھا اس لئے وہ اپنے آپ کو مظلوم مصلوب اور ناحق گناہ گار سمجھتا تھا۔

قصور جمیلہ کا نہ تھا۔

کچھ قصور حارث کا بھی نہ تھا۔

ان باتوں کا قصور تھا جنہوں نے اتنے سالوں میں طعنوں کا روپ دھار لیا تھا۔

حارث کہتا...... ”عورت پیدائشی گھٹیا ہے اس کا صرف ایک کام ہے اور وہ ہے حسد......“

جمیلہ کہتی...... ”عورت اور مرد کا رشتہ صرف جسم تک ہے مرد روح کے قائل

نہیں......“

حارث کہتا...... ”عورت اور مرد کی ایک جنس نہیں ہے دونوں کی جنس ہی علیحدہ ہے......“

جمیلہ کہتی...... ”عورت کی محبت اور مرد کی محبت ہی سے ظاہر ہے کہ ان کی ایک جنس نہیں ہو سکتی“

حارث بھول گیا کہ اتنے برسوں گھٹیا رہنے کے باوجود جمیلہ نے کبھی زبان نہ کھولی تھی اس کے کسی معاشقے کا دبے الفاظ میں بھی ذکر نہ کیا تھا۔

جمیلہ بھول گئی کہ حارث اتنے سارے معاشقوں کے باوجود کھوئی ہوئی لہر کی طرح ہر بار اسی کے پاس لوٹ آیا۔

ہوا یوں کہ جمیلہ کو شام کا بخار آنے لگا اور اس کے سینے میں ہولے ہولے ایک تتلی گھس آئی جو آہستہ آہستہ۔ پر پھڑپھڑاتی رہتی جس پسلی پر بیٹھتی وہی تتلی کے بوجھ سے دکھنے لگتی۔ جتنی دیر غسل خانے میں آنسو رواں رہتے اتنی دیر سینے میں بند بند دھواں گھسا رہتا۔ جب کھانے کی میز پر گھر میں چلتے پھرتے یہ آنسو روک لئے جاتے تو اسے لگتا سینے میں ایک جلا ہوا کاغذ پھنس گیا ہے جو باہر نکلنا چاہتا ہے۔

وہ سوچتی...... اتنی ساری محبت کے باوجود میں حارث کی زندگی میں کتنا بے معنی اضافہ ہوں؟

مجھ سے بہتر مجھ سے اچھی سمجھ دار خوبصورت لڑکیاں اس کی ساتھی ہو سکتی تھیں۔

اگر میں حارث کی زندگی میں نہ آتی تو آج حارث بار بار اتنی نامکمل محبتیں نہ کرتا۔ مجھ میں وہ خوبیاں نہیں ہیں جو ایک مرد کی توجہ ہمیشہ کے لئے اپنے پر مرکوز رکھ سکیں۔ وہ بات مجھ میں نہیں ہے جس سے ابدی محبت کا چشمہ پھوٹتا ہے۔

جمیلہ کی خالی سوچوں نے اس کا دفاع ڈھول کی مانند خالی کر دیا اس میں وہ خوش اعتمادی حسن خوش رنگی نہ رہی تھی جو ڈارس ڈے کی آنکھوں والی لڑکی میں تھی اس میں وہ چمک نہ رہی جو ایک نوجوان لڑکی اور منجھے ہوئے کانسی کے برتن میں ہوتی ہے پھر اچانک سب کچھ ختم ہونے سے ایک شام پہلے حارث نے جمیلہ کی بھیگی بھیگی آنکھیں دیکھ کر کہا تھا ”آخر تم چاہتی کیا ہو؟ تمہیں کیا چاہیے؟ تمہیں کسی بارش میں بٹھا دوں؟

کیا کروں کہ یہ آنکھیں خشک ہو جائیں! خدا کے لئے بتاؤ جمیلہ تمہیں کیا ہوتا جارہا ہے......"

"کچھ نہیں حارث...... تم پروا نہ کرو......"

"میں تو دعا کرتا ہوں جمیلہ کہ میرا کسی جنم میں کسی عورت سے کوئی ناطہ نہ ہو...... اگر میں پھر پیدا ہوا تو ایک ٹیلے پر عمر بسر کروں گا...... اکیلا......"

جمیلہ کے حلق میں آنسو پھنس گئے۔ پچھتاوے کے نمکین آنسو۔

"میں تو عورت کی ذہنیت سے تنگ آ گیا۔ بالکل چھوٹا سوچتی اور چھوٹا دیکھتی ہے......"

اس کے بعد ان کی زندگی میں کچھ باقی نہ رہا۔

سپٹر ٹومائیسن کے ٹیکے چھ خاکی گولیاں صبح چھ شام چھ دوپہر...... انڈا مکھن' دودھ اور گوشت شام کو بخار اور رات کو پسلیوں کا درد...... چھوٹی چھوٹی آہیں اور گرم گرم آنسو......

وہ ڈارس ڈے جیسی آنکھوں والی کی طرف جس تیزی سے بڑھا تھا اسی شدت سے اس نے بریکیں لگائیں لڑکی بوکھلائی حارث بوکھلایا اور جمیلہ بستر پر لیٹی سوچتی رہی اگر سینے سے تتلی نکل بھی جائے اگر جلا ہوا کاغذ ایک دن سینے میں نہ بھی باقی رہے تو بھی اپنے ناکافی ہونے کا احساس باقی رہے گا۔ ایک انسان دوسرے انسان کی محبت کو کبھی نہیں جیت سکتا۔ کچھ عرصہ کے لئے شرابور ضرور ہو سکتا ہے مگر مکمل طور پر اس بارش میں رہ نہیں سکتا......

وہ لیٹے لیٹے سوچتی...... کبھی مجھ میں ایسی خوبیاں پیدا نہیں ہو سکتی تھیں کہ حارث مجھ سے ملنے کے بعد کہیں اور نہ جاتا؟

اگر مجھ میں زمانے بھر کی عورتوں کا حسن و خوبی پیدا بھی ہو جاتی تو بھی یہ حارث کے لئے کافی نہ ہوتا۔

پھر اچانک حارث نے راجہ رام چندر کی طرح ایک دھوبی کے کہنے پر نہیں بلکہ ایک تیسرے درجے کے ڈاکٹر کے مشورے پر جمیلہ کو گاؤں بھیج دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں کھلی ہواؤں میں جمیلہ بہت تندرست ہو جائے گی۔

جب جمیلہ سٹیشن پر اتری اور گڈے میں سوار ہوئی تو اسے معلوم تھا کہ یہ بن

باس' سانس کے آخری پیام تک کا ہو گا۔ یہاں کچی دیواروں سے اڑتے ذرّوں اور مکئی کے دانوں کی خوشبو میں اس نے دو سال گزارے اور جب آخری وقت آیا تو حارث اس کے پاس تھا۔ حارث جس نے اپنی غیر موجودگی میں اس کی بہت دلجوئی کی تھی جس نے اسے سینے سے لگایا تھا۔ پاتال کی جڑوں کو ان جانے خوف چاٹ گئے...... جمیلہ بیماری سے نہیں خوف سے مر گئی۔

ادھر حارث اپنے آپ کو بے قصور سمجھتا رہا...... وہ تو مہاراجہ رام چندر کی طرح تھا۔ سروپ نکھا پاس آئی۔ ستیل پاٹی بچھائی مرگ چھالا پر خود بیٹھے۔ جل پان پیش کیا۔ لنکا کی باتیں پوچھیں مان آدر کیا۔ سروپ نکھا آتی جاتی رہی اور جب ایک دن سروپ نکھا نے اچانک مہاراج رام جی کے بہت قریب آنا چاہا تو انہوں نے اس کی ناک کاٹ دی۔ حارث نے بھی ہر سروپ نکھا کی ناک کاٹی تھی اور اسی لئے وہ اپنے آپ کو اتم مہاپرش اور بے قصور سمجھتا تھا۔

جب جمیلہ کے سینے سے تتلی کو فرار کی راہ نظر آئی تو اس نے حارث کا ہاتھ پکڑ کر کہا......"اچھا ہی ہوا آپ آ گئے......"

"میں نے نئی کوٹھی بنوالی ہے تمہارا Wing علیحدہ ہے۔ میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا جمیلہ۔ یہ زندگی بہت چھوٹی ہے میں تمہیں یہاں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا......"

جمیلہ مسکرا دی

"اشومیدھ یگ میں اس کا کیا کام؟ نئی کوٹھی میں وہ کون؟"

"تم مایوس ہو گئی ہو جمیلہ...... ہمارا تو جنم جنم کا ساتھ ہے...... ہم علیحدہ نہیں ہو سکتے میرے راستے میں ہزار دوسرے لوگ آئے لیکن میں نے جس سنگھاسن پر تمہیں بٹھایا اس پر کسی اور کو بیٹھنے نہیں دیا......"

"یہ دوسروں کے ساتھ بے انصافی تھی......"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے جمیلہ......"

"دوسری زندگی اگر کوئی ہوئی...... تو......"

"تو ہم وہاں اکٹھے ہوں گے جمیلہ......"

جمیلہ نے آنکھیں بند کر دیں "اگر کوئی دوسری زندگی ہوئی تو......"

"ہم اکٹھے ہوں گے جمیلہ...... تم اور میں۔" "آپ ایک ٹیلے پر ہوں گے اور

میرا کہیں وجود نہیں ہو گا۔ میرا رب مجھ سے وعدہ کر چکا ہے میرا اس زندگی کے بعد کہیں کوئی سراغ نہ ہو گا۔ اب میں اپنی خوشیاں کسی اور کے پلّے سے نہیں باندھ سکتی۔ کوئی آدمی کسی اور آدمی کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کافی نہیں ہوتا...... اسی لئے میرا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جانا ہی بہتر ہے"

دھرتی کا سینہ شق ہوا اور مہارانی سیتا بیچ میں سما گئی۔ حارث ٹیلے پر اکیلا کھڑا تھا۔ نیچے دھرتی کا سینہ شق تھا اور گہرے شگاف میں اسے جمیلہ مشین چلاتی نظر آ رہی تھی اردگرد گرم کپڑے یوڈی کولون اور ڈرائی کلین جسم کی خوشبو تھی بہت سی سروپ نکھائیں ڈولتے شعلوں کے لباس پہنے شگاف کے اندر باہر پھر رہی تھیں اسے آوازیں دے رہی تھیں۔

اختری اور عزیزہ......

ڈارس ڈے جیسی آنکھوں والی۔

اجلے ہاتھ پیروں والی دھان پان سروپ نکھا سر پر دوپٹے کا تولیہ اوڑھے ایلا۔

سب کہہ رہی تھیں...... "ہمارے ساتھ چلو حارث۔ یہاں ایک اور ایک گیارہ کی قید نہیں ہے...... چلو حارث خلاء اتنا بڑا ہے کہ ہم سب مل کر بھی اسے پورا نہ کر سکیں گے"

حارث جو اپنے آپ کو مہاں پرش سمجھتا تھا جو کسی عورت پر کبھی ظلم نہ کر سکا حارث جس نے ہر سروپ نکھائی ناک کاٹ دی تھی جو بہت ساری سروپ نکھاؤں کو اپنے پیروں میں بٹھانے کے باوجود کسی کے قدموں میں نہ بیٹھا تھا۔ ٹیلے پر اکیلا بیٹھا تھا اس کے اردگرد کوئی عورت نہ تھی۔ وہ بار بار شگاف تک منہ لے جاتا اور آواز دیتا...... جمیلے"

شگاف کے آخری سرے پر جہاں دھرتی پھٹ گئی تھی ایک گیروے شعاعوں والا اونچے مستک والا مہاں پرش کھڑا تھا جس کے چہرے سے لگتا کہ اشومیدھ یگ سے اُٹھ کر آیا ہے۔

جب کبھی جمیلہ کی آواز اس تک پہنچتی وہ دو زانو ہو کر دھرتی کو چومتا اور آہستہ سے کہتا...... "سیتے......"

لیکن سیتا نے تو نہ آنے کی قسم کھائی تھی اور اس کے رب سے اسے یہ بردان

مل چکا تھا وہ گھاٹی سے نکل نہیں سکتی تھی اور حارث...... جس سے زندگی نے ہمیشہ راجاؤں کا سا سلوک کیا۔

موت نے اسے امر کر کے بالکل تنہا کر دیا تھا۔

اب اگر وہ اشومیدھ یگ بھی کرنا چاہتا تو کس کے لئے؟

اُس کے لئے ساری سروپ نکھائیں ہی تھیں جن کی وہ صرف ناک کاٹ سکتا تھا۔

دلِ یزداں

ساری کائناتیں قلقاریاں مارتی' بڑے ٹماخ سے اپنے اپنے محوروں پر رواں دواں تھیں۔ ان کائناتوں میں چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ اور بڑے سے بڑا سیارہ اپنے چمکدار ستاروں کو جلو میں لیے متحرک تھا۔ سورج کرنوں کا تاج سجائے زمین کی جانب ٹکٹکی لگائے تک رہا تھا اور کرۂ ارض اپنے ندی نالے' دریا' سمندر' پہاڑ' صحرا سینے سے چمٹائے اپنے سفر پر شتکارتا پھرتا تھا۔ کائناتیں اپنی اپنی جمعیت میں علیحدہ اور اللہ کی مشیّت میں ایک تھیں...... ساری مخلوق اللہ کے وقت میں پروئی ہوئی تھی۔

لم ڈگو کسان اپنا چادر سنبھالتا کچے گھر میں داخل ہوا۔ آخری بار اس نے آسمان پر نظر ڈالی' شام ڈھلنے کی سرخی مشرق میں گدلی ہو گئی تھی اور وہ بدلی جو دوپہر کی گھڑی آئی تھی دور دور تک کہیں نہ تھی۔ سورج ڈوبنے سے پہلے اس بدلی کو بھی گنڈیری کی طرح چُوس گیا تھا۔

کُھردرے ہاتھوں اور بوائی پھٹے پاؤں والی سوانی نے چارہ کاٹنے والی مشین کا ہتھا چھوڑ دیا' وہ مشقتی زندگی سے اوب چکی تھی۔ لم ڈگو کی طرف بڑھتے ہوئے چیخی

"اوئے مورکھ آسمان پر آنکھیں جمانا چھوڑ دے۔ چھوڑ دے...... اوئے ربا بندہ کرئے بھی تیلی اور کھائے بھی سوکھی...... اس زور اور سے یاری نہ لگا کملیا اس کو سو کام' تیرے جیسے کی وہاں پہنچ کہاں...... جب اس کے جی میں آئے گا بارش بھیج دے گا...... بڑوں کے منہ نہیں لگتے...... ایویں کسی وڈی سزا میں پڑ جائے گا۔"

"ساری فصل سوکھ کر ڈھنے کو ہے بھلی لوک...... روٹی ڈال دے مجھے بھوک

لگی ہے۔"

سر کا سالو درست کرتے ہوئے بھلی لوک نے چارے کا خیال چھوڑ دیا اور تھڑے کی طرف چلنے لگی جہاں لیپے پوتے چولہے پر چڑھی ہانڈی سرسرا رہی تھی۔

"چھوڑ دے اوپر والے کی یاری چھوڑ دے گنوارو۔ اوپر والا ڈاہڈا ہے مرضی والا ہے۔ ہماری کب سنتا ہے بھلے آدمی۔ اس نے پیغمبروں کی نہ سنی ہم کس گنتی شمار میں؟...... بارش آئے آئے نہ آئے...... بال ہٹ چھوڑ دے کملیا کچھ نہیں ملنا اوپر والے سے۔"

کسان اتنی سختی جھیلنے کے باوجود ربّ کی پوالی سے بندھا کھڑا تھا۔ صبر کی صدری اس کے تن سے کبھی جدا نہ ہو پاتی...... "سنتا ہے سنتا ہے...... تیرا اور ربّ کا بیر تو ازلی ہے کم عقل' میرا ابا کہا کرتا تھا جب کسان آسمان پر بادلوں کو کھوجتا نہیں تو بارش نہیں آتی...... اوپر والے کو ہماری کھوج سے پیار ہے......"

توے پر بڑی سی مکئی کی روٹی ڈال کر گھروالی نے حقارت سے کہا...... "جانے دے...... اسے کسی کی پروا نہیں...... کیا وہ انجان ہے ڈھور ڈنگر مر گئے...... کھیتیاں سوکھ گئیں...... اس کو ہماری بے آس زندگی سے مطلب؟ کیا دیا ہے اس نے آج تک بھیڑے چندرے انسان کو بتا کیا دیا ہے......"

پرتل کے ٹٹو نے لمبی آہ بھری۔ "نہ بکی جا نہ بکی جا...... پھر جو میں ڈنڈا سوٹا اٹھاؤں گا تو گھر گھر بتاتی پھرے گی۔ دیکھتی نہیں بندے کو کیا کیا وخت تھے خانہ بدوشوں کی طرح مارا مارا پھرتا تھا...... نہ کوئی گھر تھا نہ گھاٹ...... اس نے ہمیں جانکاری دے دی...... ہم دھرتی کا سینہ کاٹ کر فصلیں اُگانے لگے' اندر باہر اناج ہی اناج ہو گیا...... اس نے ہمیں بُدّھی دی تو یہاں تک پہنچے!"

گھروالی کا سارا پنڈا پت دانوں سے بھرا تھا۔ کھجل کھجل کر پیٹ کی کھال اُدھڑ گئی تھی۔ بچّوں کی بیماریوں نے اس کا کلیجہ پکا دیا تھا۔ نہ جانے دھوپ کا ساتھ تھا کہ توڑی کی پھکار آنکھوں کی لالی اب جنم روگ بن گئی تھی۔ اس کا سارا وقت بُرے دنوں کی جگالی میں کٹتا۔

"دیئے جا اس ڈاہڈے کا ساتھ دیئے جا۔ اسے تو پل پل کی خبر ہے۔ پھر اندر باہر کیوں آگ برسا رہا ہے۔ ہم بجوگی محنت کر کر مر جائیں وہ سارے کیے کرائے پر

پانی پھیر دیتا ہے۔ لے اس زور اور سے کسی کی مجال ہے کہ پوچھے' سمندروں میں کون سی فصلیں اُگ رہی ہیں' وہاں چھلا چھل بارش...... پہاڑوں کے پتھروں پو دھڑا دھڑ بارش......اوئے مت دیکھا کر اوپر...... تیرا ڈھڈا تیرے دل کی نہیں جانتا...... بھینس کٹی دے تو کٹی مر جائے...... بارش برسے تو ایسا جل تھل کہ نہ گھر رہے نہ بوبل...... اولاد دے تو بندہ توبہ توبہ کرتا پھرے نہ دے تو سوانی پٹی پر ہاتھ مارتی مارتی مر جائے' چھپکلی بھی گھر جنم نہ لے...... ہمارا اس کا کیا میل...... چلو میں تو مائی حوا کے قصور کی سزا بھگت رہی ہوں...... تُو تو اس کا پیارا ہے...... مت یاد کر مرضی والے کو ایک قصور کیا ہو گیا معافی ہی نہیں ملتی...... جنم جنم سے کیا مرضی والے سے یاری لگائی ہے...... دے گا تو چھپر پھاڑ دے گا۔ نہ دے گا تو قحط...... مرو...... سسک کر۔"

"نہ منہ کھول کالی آندھی نہ جھٹلا اس کی نعمتوں کو...... ایسی اڑنگی دوں گا لاٹھی لے کر چلا کرے گی ساری عمر...... صبر کی چادر لے سر پر...... وہ نہ ہو اوپر سے جانکاری آنا بند ہو جائے...... بندہ اپنی مت کے سہارے کیا جئے گا؟ کیا سمجھے گا اس جندگی کو؟"

لسّی کا لمبا گلاس ایک ہی سانس میں پی کر دھرتی کے سپوت نے ٹھاہ کچے فرش پر دے مارا۔ "مجھے کھانے دے گی کہ سونٹا مار کر چپ کراؤں۔"

وہ جنم جلی بھی مرنے کے بہانے ڈھونڈ رہی تھی۔ "ہاں ہاں مجھے ہی چُپ کرا۔ تیرا بس جو نہیں چلتا اوپر والے پر۔ کبھی آیا تیری مدد کو؟...... کبھی دکھ درد سمجھا تیرا آسمان پر آنکھیں تاڑے نہ لگایا کر تو تھیا...... نہ پاگلوں کی طرح اس کی رحمت کو بلایا کر ایک ہی ٹانگ پر جم کر...... پہلے لوگ غریب سمجھ کر بے عزت کرتے ہیں پھر پاگل جان کر جوتی بھی نہ ماریں گے۔"

اب تک کسان کے دل میں تھوڑا سا شک کا بیج بویا جا چکا تھا۔ وہ بھی آواز گرا کر بالآخر ایسی آواز میں بولا جس میں بے یقینی تھی۔ "سمجھتا ہے سمجھتا ہے میری ہر ہر بات سمجھتا ہے...... یہاں میری گردن میں جو رہتا ہے کیسے مرے رمز نہ جانے...... پر میں ٹھہرا قطرہ میں سمندر کی بولی کیا سمجھوں؟ میں ہی کبھی اسے سمجھ نہیں پایا کملیئے...... تھوڑے علم والا جو ہوا...... وہ علم دے گا تو آپی سمجھ جاؤں گا...... ہولی ہولی......"

مائی حوّا ایک بار پھر بے قناعتی کی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

نور کا رتھ تمام کائناتوں میں منہ زور گھوڑے کی طرح رواں دواں تھا۔ اس

رتھ سے ٹھنڈے ضیاپاش شعلے جھڑ رہے تھے۔ کبھی یہ مادے میں بدل جاتا کبھی بقعۂ نور بن کر ربوبیت کے بھید کھولتا کبھی سارا کا سارا بلحاظ اپنی حرکت قوت میں بدل جاتا۔ اس رتھ کا روپ سروپ کسی اصول' حادثے نظام کا تابع نہ تھا۔ وہ ہر راستے ہر منزل کا صاحب عرفان تھا۔ جس کائنات کا سفر مطلوب ہوتا شناسندہ رتھ اس کے تمام اصول اپنے تابع کر لیتا اور یوں رازجوئی کرتا کہ ان فرشتوں کو بھی علم نہ ہو پاتا جو اس ضوپاش روشنی میں ہمرکاب شناوری پر مامور تھے۔ اللہ کی پیدا کردہ مخلوق پرے باندھے انحد باجہ بجاتے ساتھ ساتھ تھے۔ ان فرشتوں کا ادراک بھی انسانی ذہن کی طرح ساری بات سمجھ سکتا تھا تو وہ اس رتھ کے یکتا سوار کو کیسے سمجھ سکتا......؟

ازراہِ تفنن باری تعالیٰ نے سوال کیا۔ "بول بتا...... کیا انسان مجھے یاد کرتا ہے؟"

حضرت جبریل نے قدرے توقف کیا اور جھکولا کھا کر گویا ہوا۔ "تو باری تعالیٰ ہر ہر کائنات کے ذرّے ذرّے سے آگاہی رکھتا ہے اے رفیع الشان مرجع خاص و عام...... میں تجھے آدم کی اصلی اور جعلی حالت کی کیا پتا سناؤں' اس کے واژگوں قلب کا کیا منظر پیش کروں؟ تو خود ہی سوال اور آپ ہی جواب دے......"

"خوفزدہ نہ ہو جبریل' اپنی بات سمٹاؤ سے کر!......"

"کیا عرض کروں باری تعالیٰ...... کوئی ایسی بات نہ کہہ دوں جو لم یزل کو ناگوار گزرے' کوئی ایسی کہہ گزروں جو مجھے راندۂ درگاہ بنا دے مجھے علم ہی نہ ہو اور میرے اعمال ضائع ہو جائیں اور میں خردہ بین مقام عبرت بن جاؤں......"

"بول کہہ...... تیری اس گفتگو سے تجھے جانچا نہ جائے گا۔"

حضرت جبریل نے نوری رتھ کا طواف کیا پھر بڑے گیان سے گویا ہوا......

آقا...... حق آشنائی کا تقاضا تو یہی ہے کہ راست کہوں اور صداقت کو شعار بناؤں۔ انسان کمزور ہے...... اس کا علم اتنا ناپختہ ہے کہ وہ فطرت کے عناصر سے نبرد آزما نہیں ہو سکتا۔ وہ ادبار کی چکی میں یوں متحیر رہتا ہے کہ سوائے اپنی موت کے اسے اور کچھ یاد نہیں رہ سکتا......"

"تیرا خیال ہے یہ پراگندگی اس کے قلیل علم کے باعث ہے......؟"

"اس کا علم کم ہے خالق اکبر اور وجدان کم تر اس کے اوقات فقط فکر و پریشانی

میں بسر ہوتے ہیں۔ وہ زمین کا سینہ چیرتا پھاڑتا خود پتھر بن جاتا ہے اور اس کی زن
جانوروں میں گزر بسر کرتی حیوان صورت ہو جاتی ہے۔"

"تو کیا ہم نے اسے نبیوں کا علم عطا نہیں کیا؟ اس کی جانب مرسل نہیں آئے
جو اسے ہماری یاد سے سرفراز کرتے؟...... کیا وہ اپنی ممکنات سے ابھی بھی آگاہ نہیں؟"

حضرت جبریل نے پر پھڑپھڑائے تو فضائے بسیط میں تموج آ گیا۔ وہ انسان
کی شورش پنہاں کا رازداں تھا۔ تمہیدی گفتگو سے پرہیز کرتے ہوئے گویا ہوا......

"انسان کا عرصہ حیات اس کے اپنے تصرف میں نہیں...... وہ نبیوں کے علم کو سچ مانتا
ہے...... تجھے یاد بھی کرتا ہے لیکن اپنی ضرورت کے تئیں وہ اپنی مشکلات کے آگے
مجبور و مقہور ہے۔ اس لیے تجھے صرف داد رسی کے وقت پکارتا ہے...... تجھ سے فقط
کمک حاصل کرنے کو فریاد رس رہتا ہے...... ابھی وہ اس آسائش سے آگاہ نہیں جس
فراغت میں وہ تجھے حمد و ثنا سے یاد کر سکے' اس کی مشکلیں آسان کرائے نور ازل اسے
ایسے علم سے نواز کہ اس کے اوقات خالی ہوں۔ پھر وہ اس فراغت سے تیرا
رطب اللسان ہو گا...... ابھی تو میں سمجھتا ہوں وہ بے قصور ہے...... اس سے داد خواہی'
شکر گزاری' یاد وارفتہ کی آرزو بھی بیکار ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا زباں درازی کروں
کہ تو علیم مطلق ہے۔ یا بصیر و سمیع و یا حکیم۔"

رتھ کا سوار جبریل کی کم آگاہی پر مسکرایا لیکن چپ رہا۔ کائناتوں کا خالق اس
وقت کئی نیبولا گزر چکا تھا۔ اس کی رتھ کے زمزمے سے کئی بلیک ہول ڈول رہے تھے۔
کہکشائیں دم بخود تھیں۔ خالق مطلق کو تخلیق کے کئی سلسلے درپیش تھے۔

حضرت جبریل سرگشتگی کے عالم میں سوچ رہے تھے کہ وہ گفتنی سے ناگفتنی کی
حدود میں پہنچ کر کہیں گستاخی کے مرتکب تو نہیں ہوئے' انہوں نے جلیل القدر میکائیل
سے نظریں چرا کر اپنے پر پھڑپھڑائے تو ان کی نظر اپنے ہی پروں میں پوشیدہ ایک روح پر
پڑی' ایک معصوم بچے کی آواز آئی۔

"دستگیر مجھے یہیں رہنے دینا۔ میں ایک لاوارث کی روح ہوں......"

"تو کب سے یہاں ہے؟"

"جب تو...... اور مولائے کل آپس میں بات کر رہے تھے......"

"تجھے ہمارے قافلے میں گھسنے کی جرأت کیسے ہوئی......"

"جرأت میرے فریاد رس؟...... جب مجھے کچھ کھونا ہی نہیں پھر میرے پاس
جرأت کیسے نہ ہو......"

حضرت جبرئیل پسیج گئے۔

"تو ہمارا کب سے ہم سفر ہے......؟"

بچے کی روح کسمسائی۔ "کئی قرن گزر گئے جلیل القدر جب ساری دنیا ابھی
موسموں کے تابع تھی...... لوگ مشقت سے روزی کماتے تھے...... ساری دنیا کھیتی باڑی
کا علم حاصل کرنے پر خوش ہوئی تھی۔ نبیوں کا علم ابھی کتابی نہیں تھا تب...... تب سے۔"

"اتنی مدتوں تو ہمارے ساتھ چھپا رہا کیا تجھے معلوم نہیں کہ خدائے بزرگ
کی نوری رتھ کے ہمراہ ارضی روحیں ہمرکاب نہیں ہو سکتیں' تجھے اپنے مقام پر ہونا
چاہیے' کیا تجھے علم نہیں اس ملکوتی سفر میں گر کر کبھی بھی آوارہ ہو جاؤ گے۔"

"جانتا ہوں آقا...... اسی لیے تو آپ کے پروں میں پناہ لی ہے۔"

"لیکن مجھے تو انسان کی حالت زبوں بیان کیے بھی کئی قرن بیت گئے۔ کیا تو
جانتا نہیں کہ ارضی روحیں اگر مقام پیشرو میں نہ ہوئیں تو وہ روز قیامت بلائی نہ جائیں گی
اور ہمیشہ کے لیے سیارگان میں بھٹکتی پھریں گی؟"

"میرا ایک سوال تھا......"

تحکم سے حضرت جبرئیل نے کہا۔ "ہاں اجازت ہے بیان کر......"

"میں ایک لاوارث ہوں آقا...... میں آسائش میں پلا لیکن مجھے میری ماں
نے پرورش نہ کیا...... میری ماں کا سایہ جو میرے لیے جنت تھا کبھی مجھ پر نہ پڑا...... میرا
باپ جو باب جنت تھا دروازہ بند کر کے ہمیشہ غائب رہا...... میں تجھ سے اتنا پوچھتا ہوں
میرے ماں باپ نے جیتے جی مجھے لاوارث کیا...... تو کیا اب مجھے میری ماں یاد کرتی ہے
جب وہ بھی مقام پیشرو پر ہے اور فراغت میں ہے۔ میں تو اسے ہر لحظہ یاد کرتا ہوں یہ بتا
کیا وہ مجھے یاد کرتی ہے۔"

حضرت جبرئیل خاموش ہو گئے۔ ان کے لیے نوری رتھ کی حضوری کا حکم تھا۔
وہ اس نئے الجھاؤ میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔

"اچھا یہ بتا...... کیا اب مائیں اپنے بچوں کو یاد کرتی ہیں......"

"اس کے لیے تو کسی کو دنیا میں جانا پڑے گا......"

"تو پھر چلا جا...... میں بہت پریشان ہوں۔"

ایک چھوٹے کیوپڈ نما فرشتے کو حضرت جبرئیل نے اشراقی حکم دیا کہ وہ کرہ ارض کے حالیہ حالات معلوم کر لائے...... فرشتہ پہلے سیال لہر بنا پھر طاقت میں منتقل ہوا اور پھر مادے میں تبدیل ہو کر دنیا کے محور پر گھومنے لگا۔

کئی صدیاں پل بھر میں بیت گئیں۔ وقت کی اساس یہاں مربوط نہ تھی۔ زماں آگے بڑھنا چاہتا بڑھ جاتا۔ لوٹنا چاہتا تو بغیر پس و پیش لوٹ جاتا۔ رکنے پر آتا تو قرن بیت جاتے اور اسے اذن سفر نہ ملتا۔

رتھ اب قیام میں ہلکورے لے رہا تھا۔ پتنگ کی مانند ڈولتا' ہلکورے لیتا' سرمدی نغموں میں گونجتا اس کی آبی شعاعیں ہزاروں نیبولا کے آرپار عجیب الخلقت کو بے نقاب کر رہی تھیں۔

دل لگی کے طور پر باری تعالیٰ نے سوال کیا۔ "یہ تو بتا جلیل القدر فرشتے میں نے تو تیرے آدم کو سارا شعوری علم عطا کر دیا اب وہ دماغ کی زد میں ہے۔ اور تخلیقات اس کی جلو میں رہتی ہیں۔ اب تو اسے فراغت نصیب ہوئی' مشینیں اس کی ہاتھ باندھی غلام اور ایجادات اس کی فضیلیت کی شاہد ہیں۔ اب تو کوئی شے مانع نہیں۔ کیا اب وہ مجھے یاد کرتا ہے؟"

جبرئیل راندۂ درگاہ ہونے سے خوفزدہ تھا۔ "تو علیم مطلق ہے کائناتوں کے فرماں روا میں تیرے علم میں کوئی اضافہ کرنے کا مجاز نہیں۔"

"پھر بھی۔ میں تیری گواہی کو اپنے علم سے مربوط رکھنا چاہتا ہوں' مجھ پر اپنے خیالات آشکار کر۔"

"تو میرے دل کا حال جانتا ہے ربّ المغرب و ربّ المشرق!"

"اپنی آواز میں بیان کر اور ہچکچانے سے پرہیز کر۔"

"آقا تیرے عطا کردہ علم سے اس نے اپنے دماغ کو قلب پر حاوی کر لیا ہے۔ اب اسے ایسے سوال درپیش ہیں جن کا جواب اس کے دماغ کو مطمئن کر سکے۔ اسے ایسے جواب درکار ہیں جن کا تجربی اور استدلالی وجود ہو' وہ ایسے علم پر ایمان نہیں رکھتا جس کا منبع احساس وجدان' یا ایمان سے مشروط ہو۔"

"ہم نے تو تیری منت کشی کے جواب میں اسے ایسا علم عطا کیا تھا کہ بنی نوع

انسان مشقت سے نکلے' اس کی زندگی سہولت اور فراغت کی مظہر ہو...... اور پھر وہ اپنے خالی اوقات میں علم نو کی مہربانی سے ہمیں یاد کر سکے!"

"انسان کے علم کی زد میں صرف مادہ ہے آقا...... وہ اب صرف جسم کی زبان سمجھتا ہے اور جسم کی سہولت ہی اس کی سوچ کا ٹارگٹ ہے...... تیرے عطا کردہ علم نے اب وجدان کی طرف سے اس کی توجہ ہٹا دی ہے۔"

"عجب ہے اس نے اختیاری طور پر قلب کے علم کو کیوں ساکت کر دیا۔"

"اس کی زندگی سے ایک طور کی مشقت ضرور کم ہو گئی ہے۔ ٹیکنالوجی نے اس کے لیے راحتیں پیدا کی ہیں۔ اب گھر آراستہ' عورتیں خوبصورت' بچے صحت مند اور مرد فعال ہو گئے ہیں۔ اب مشین کی بدولت انسان مشقت کی چکی میں نہیں پستا۔ اب اس کا ذہن بیدار ہو گیا ہے۔ انسان شعور کی دنیا میں رہتا ہے۔ اس کا تجسس اس قدر دور مار ہے کہ وہ اب مادے کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہے' وہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کب اور کہاں سے وارد ہوا؟"

"کیا انسان یہ نہیں جانتا کہ ایک پوری کائنات تخلیق کرنے کے لیے ہمیں صرف کُن کا لفظ درکار ہے۔ ادھر ہمارے ارادے سے کُن نکلا ادھر فیکون ہو گیا۔"

حضرت جبرئیل خوف سے لرزے اور انسان کی وکالت میں گویا ہوئے۔ "آقا! انسان بدنصیب ہے۔ اسے تیری نعمتوں کا شکر ادا کرنا نہیں آیا۔ اس کا تجسس بھڑکی ہوئی آگ ہے جو کچھ اس میں پڑتا ہے بھسم ہو جاتا ہے۔ یہ راہگیر ابھی اپنی دھرتی کے متعلق متجسس ہے۔ کائنات کے بارے میں جاننا چاہتا ہے' فضا کی ماہیت جاندار کی حقیقت' وقت کی اہمیت میں الجھا ہوا ہے' وہ بضد ہے کہ دنیائے ارتقا میں انسان بندروں کی ترقی یافتہ شکل میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ اب تجھے تو سب علم ہے آقا میں اس زبوں حال کی کیفیت کیا بیان کروں؟"

"تو کیا وہ حضرت آدم پر ایمان نہیں رکھتا؟"

"جل جلالہٗ کچھ بچھڑے ہوئے لوگ ابھی بھی تیری الہامی کتابوں میں اپنے سوالوں کا جواب تلاش کرتے ہیں۔ لیکن ترقی یافتہ نئی دنیا کا سائنسی انسان تیرے قلبی علم پر اعتماد نہیں رکھتا' اس کا قلب بند اور روح گُم سُم ہے۔"

"پھر یہ تفرقہ پرداز اس فراغت کا کیا بناتے ہیں جو اس علم نو نے عطا کیا

ہے۔"

"اس فراغت نے انہیں آزادی کا احساس دلایا ہے۔ اور آزادی سے تنہائی پیدا ہوئی ہے۔ وہ ہر لمحہ اس تنہائی کے روگ کو مٹانا چاہتا ہے۔ کبھی کلب' کبھی ڈسکو' کبھی سفر' کبھی ہوٹل...... پہلے وہ جسمانی مشقت میں قلعہ بند تھا' اب وہ روحانی خلاء میں محصور ہے......"

"لیکن روح کا علم تو اسے پہلے سے رسید کیا جا چکا ہے۔"

حضرت جبرئیل خدا ترس اور بندہ نواز تھے۔ "یا باعثُ! وہ دریوزہ گر ہے خود آگاہ نہیں کہ اسے اپنی فلاح کے لیے کیا درکار ہے؟ اس نے اپنے قلب کا دریچہ بند کر کے ہی ذہن کے شعبدے کو وا کیا ہے۔"

"ہم نے انسان کو ہمیشہ علم نافع عطا کیا جس سے وہ آسانیاں پیدا کرتا اور آسانیاں تقسیم کرنے کا علم عام کرتا لیکن اس مشکل پسند نے ہماری عطا کردہ آگاہی سے اپنے لیے ایسی باریکیاں نکالیں کہ خود نافہمی کے سمندر میں غوطہ زن ہو گیا۔"

حضرت جبرئیل نے پر پھڑپھڑائے تو دور تک نور کی لہریں شعلہ زن ہوئیں۔ وہ خوفزدہ تھا کہ باری تعالیٰ کو آدم کی مطلوبہ سرگزشت کے درپردہ اسی کا امتحان مطلوب نہ ہو۔

"میں اس سے زیادہ کچھ عرض نہیں کر سکتا یا باسطُ۔"

"تجھے وضاحت کرنے سے کیا چیز مانع رکھتی ہے۔"

"ربّ العزت کہیں میں ابلیس کی طرح یہ کہنے پر مجبور نہ ہو جاؤں کہ یہ مٹی کا پتلا دنیا میں فساد پھیلائے گا۔"

نوری رتھ کے انجد باجہ میں قلقاری کی آواز آئی۔ وہ زمان' مکان' حرکت' حرارت سبھی کچھ تھی۔ ربّ العزت نے لوح محفوظ کو فرشتوں سے بھی مخفی کر رکھا تھا اسی لیے کبھی کبھی وہ معلوم کرتا کہ اپنی کم علمی کے باعث فرشتے کس نہج پر سوچ رہے ہیں۔ نوری رتھ کی رفتار کائناتوں کو پھلانگتی چلی جاتی وہ قیام سے ناآشنا تھی۔

"ہاں تو بتا پھر حضرت انسان کے متعلق تیرا کیا خیال ہے؟ میں تیری اس وضاحت پر تجھے سزا وار نہ سمجھوں گا۔"

"اے قادر مطلق...... تو نے انسان کو آگ اور پانی کے امتزاج سے

بنایا...... مٹی اور نور سے گوندھا۔ تو نے اسے تضاد کی صلیب پر چڑھا دیا ہے۔ یہ جسم و روح میں بٹا ہے۔ درماندہ حال کے اندر ہر لحظہ حق و باطل کی جنگ چھڑی رہتی ہے۔ اس جنگ کے ساتھ ساتھ اسے امن کی بھی خواہش ہے۔ ہر بہشت جو انسان تخلیق کرتا ہے اس میں کسی نہ کسی سوراخ سے خواہش کا سانپ تضاد لے کر داخل ہو جاتا ہے' اور ایک ہی پھنکار سے سارے میں زمستانی یخ بستہ ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔"

"تو کہتا ہے نئی دنیا میں نئے علم نے آزادی کو جنم دیا ہے...... تو اب بتا اس آزادی کے خواہش مندوں نے وہاں کیسا معاشرہ بنایا ہے۔ کیا اس معاشرے میں لوگ مجھے یاد کرتے ہیں؟"

حضرت جبرئیل نے تذبذب بھری آواز میں جواب دیا۔ "اس معاشرہ میں بھی خواہش کا سانپ تضاد کی پھنکار لے کر داخل ہو چکا ہے مولیٰ...... وہاں حکومتیں چلتی ہیں' نظام رواں دواں ہیں لیکن فرد گومگوں کے عالم میں تنہا سرگرداں ہے۔ وہ حکومت کی خاطر' نظام کے لیے ہر قربانی قبول کرتا ہے۔ جب وہ اچھا شہری بن جاتا ہے تو اس کو تضاد بُرا فرد بننے پر مجبور کرتا ہے۔ فرد کی سطح پر اسے ہر طرح کی شخصی آزادی درکار ہوتی ہے۔ وہ پھر نہ تیرا حکم مانتا ہے نہ ماں باپ کی اطاعت اختیار کرتا ہے۔ اسے کسی مرشد' گرو' استاد کی فرماں برداری کی ضرورت نہیں رہتی' یہ شتر بے مہار اپنی ذات پر پابندی قبول نہیں کرتا۔ اسی لیے وہ **Anti Christ** والے اب **Anti Love** معاشرے کی تشکیل دے رہے ہیں۔ دنیا کا فرد اپنی ذاتی زندگی میں کسی مداخلت کو در آنے نہیں دیتا۔ تیرے علم نے اس کی سوچ کو یہ جلا بخشی ہے کہ وہ فضائے بسیط میں تیر سکے' باغ بابل سے اونچے سکائی سکریپر تعمیر کر پائے۔ لیکن جس آزادی کا پرچم لہراتا تضاد سے بھرپور وہ نئے عہد میں داخل ہوا ہے وہ اسے پرانے گناہوں کی زد میں لے گیا ہے۔ اس کی حسیات اسے حضرت لوطؑ کے گناہ کی طرف گھسیٹے لے جا رہی ہیں۔ اب وہ کھلم کھلا بد چلن ہے وہاں ایسی کلبیں موجود ہیں جو بے لباس ہونے کو آرٹ سمجھتی ہیں۔ لباس' خوراک' آسائش و زیبائش تفریح و راحت ایسا کوئی راستہ نہیں جو اس آزاد نے اختیار نہ کیا ہو۔ اس کی عیاش طبیعت نے ایسی بد مستی اور خرمستی ایجاد کر رکھی ہے کہ ان کے ذکر سے بھی فضا بوجھل ہو سکتی ہے۔"

"لیکن تو نے ہی کہا تھا کہ انسان جسم کی مشقت سے نڈھال ہے۔ موسموں کی

ترشی نے اسے تاراج کر دیا ہے۔ تپتے صحراؤں میں، بھیگتے جنگلوں میں سفر کرنا انسان کے لیے صعوبتوں کا باعث ہے، میں نے تیری بات سن کر اسے علم بخشا اور خرسند کیا...... کیا اب بھی یہ شکر گزار نہ ہوا؟...... مجھے یاد نہ کیا؟"

"کرتا ہے...... تجھے یاد کرتا ہے جب کسی نئی تخلیق پر مسرور ہو کر تکبر کی سیڑھی چڑھتا ہے، مور کی طرح چنور پھیلا کر اپنی انا کو چھپانے کے لیے تیرا نام پل دو پل کو برت لیتا ہے لیکن......"

حضرت جبرئیل نے چپ سادھ لی۔

"ہاں...... مجھ سے ماضی اور مستقبل کے احوال مخفی نہیں پر میں تیری گواہی چاہتا ہوں۔"

"جن قوموں کو تو نے نبیوں کے علم سے سرفراز کیا تھا اب تیری رحمت نے وہاں دولت کے دریا بہا دیے ہیں۔ وہاں تیل بہتا ہے جیسے سمندر میں پانی...... لیکن وہاں دولت نے تیری عطا کردہ بشری مساوات کا گلا گھونٹ دیا ہے...... مشرق کا مسلمان بھی تیری یاد سے غافل ہے، باری تعالیٰ وہاں سیلابِ حرص، خود غرضی اور ذات کی محبت کے سیلاب میں لوگ بہتے جا رہے ہیں۔ مذہب کی پیروی کا پاکھنڈ زیادہ ہے 'لوگوں نے اسے دکانداری، سیاست اور ذات کے مفاد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے...... وہ اندر ہی اندر آرزومند ہیں کہ نئی دنیا کا علم چرا لیں حالانکہ تو نے انہیں علم کی مشقت اور ابتری سے بچانے کے لیے دولت عطا کی تھی۔ وہ ماحولیات کو ویسا ہی بنانا چاہتے جیسا نئی دنیا کے لوگ مقتضی ہیں۔ حالانکہ مشرق میں موسموں اور ماحولیات کے وہ مسائل نہیں جو نئی دنیا میں ہیں۔ وہ تقلید میں اس درجہ اندھا دھند پیش پائی کر رہے ہیں کہ اپنے ماحول کی انہیں سوجھ بوجھ ہی نہیں رہی...... انہوں نے نئی ترقی کو تیری ذات سے بھی اوپر تصور کر رکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جو علم حقیقت سے وابستہ نہیں شعور جس کا احساس نہیں رکھتا، حواس خمسہ جس علم سے بہرہ ور نہ ہو وہ ساری جانکاری بلائے ناگہانی ہے۔ میں کیا کہوں آقا نئی دنیا کے لوگ کس مخمصے میں پھنس گئے ہیں، وہ اپنی آزادی کی گرفت میں اس درجہ جکڑے گئے ہیں کہ اب وہ اس کرہ ارض پر ہی رہنا نہیں چاہتے۔ انہیں ایسے مقاموں کی تلاش ہے جہاں آزادی خود ان کی ذات کے لیے آزار کا باعث نہ ہو...... وہ دوسری کائناتوں کے سفروں پر آمادہ ہیں آقا...... کیا بتاؤں کہ انہیں

ارتقائے انسانی کہاں کھینچ رہی ہے؟"

ربّ ارض و سما نے چپ سادھ لی۔ نوری رتھ اپنے آفاقی سفر پر آمادہ تھا۔ کبھی وہ مادے میں ڈھلتا، کبھی حرارت میں بدل جاتا، کبھی زمان، کبھی نورِ کل میں منتقل ہو جاتا۔ کبھی پل بھر میں قرن سما جاتے۔

ایک بار پھر ننھی روح نے پروں سے سر نکال کر پوچھا۔ "اے مقدس فرشتے آخری بار بتا دے کیا میری ماں مجھے یاد کرتی ہے۔"

"سر اندر رکھ جانتا نہیں کہ اس سفر میں انسانی روح کا گزر نہیں؟"

"پھر......"

"تجھے فرشتہ دکھا تو لایا کہ تیری ماں بھی مقام ارواح پر موجود نہیں۔"

"اب میں اسے کہاں تلاش کروں اے قابلِ عزت......"

"چھوڑ اس بیکار تلاش کو...... وہ وقت قریب ہے جب پہاڑ بھربھری ریت کے ٹیلے بن جائیں گے۔ کرہ ارض دھنکی ہوئی روئی کی طرح آوارہ و پامال ہو جائے گا، تو کس ماں کی تلاش میں ہے...... صبر کر اور لوٹ جا...... روزِ قیامت اپنی ماں کو شناخت کر لینا۔ لیکن...... تجھے کیا بتاؤں...... اب تو انسان حیاتیاتی طور پر بچہ تخلیق ہی نہیں کرتا۔ پھر کیسا باپ اور کیسی ماں...... لوٹ جا...... مشینی دور تو کبھی کا ختم ہو چکا...... لوٹ جا......"

"ایک بار بتا دے۔ وہ جہاں بھی ہو۔ کیا مجھے یاد کرتی ہے۔"

حضرت جبرئیل چپ رہے۔ انسانی روح نے ان کے پروں سے علیحدہ ہو کر ایک چھوٹی سی آہ بھری اور مقام پیشرو پر جانے سے پہلے کہا۔

"اگر کبھی تجھے میری ماں ملے تو اسے بتا دینا کہ وہ مجھے ملے نہ ملے میں اسے یاد کرتا ہوں......"

چھوٹی روح مزید اصرار کیے بغیر رخصت ہو گئی۔

فضائے بسیط میں زمزمہ بلند ہوا۔ فضا میں جگنو سے بکھرے پڑے تھے۔

"تو جانتا ہے یہ روشنی کے نقطے کیا ہیں؟" نورِ کل نے سوال کیا۔

حضرت جبرئیل نے سر جھکا لیا۔ "ہاں آقا۔"

"بیان کر۔ کیا یہ تفرقہ پرداز جھٹلانے والوں کی نشان دہی کرتے ہیں؟"

حضرت جبرئیل گویا ہوئے۔ "تو مجھ سے بہتر جانتا ہے۔"

"پھر بھی گواہی دے اور احوال بیان کر حضرت انسان کا۔"

حضرت جبرئیل کو شبہ تھا کہ کہیں وہ کسی گستاخی کے مرتکب نہ ہو جائیں۔ محتاط انداز میں بولے۔"مولائے کل...... انسان اب نہ ذہن کے تابع ہے نہ قلب کے۔ وہ علم کی وارفتگی میں دور نکل گیا ہے۔ کہیں سے اس نے علم کل میں سے پوشیدہ راز چرالیا ہے۔ اب وہ سائنسی حقیقتوں کا زیر بار نہیں...... نبیوں کے علم سے تو وہ مدتوں پہلے فارغ ہوا۔ ربّ العزت اب تو وہ ہو جا کہتا ہے اور کائنات میں چل کھڑا ہوتا ہے۔ اسے ہو جانے کا بھی انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ اس سراغ رساں کے لیے کیا کہوں' یہ نکتہ نکتہ روشنیاں جو کائناتوں میں بکھری پڑی ہیں' انسان ہی تو ہیں۔"

"اور اب جب اس کی آخری آرزو پوری ہو چکی وہ مکمل طور پر آزاد ہو گیا۔

کیا اب وہ میرا شکر گزار ہے؟ مجھے یاد کرتا ہے؟"

"اب وہ خود چھوٹا سا ربّ بنا کھڑا ہے آقا......"

خدائے لم یزل نے چپ سادھ لی...... وہ آدم سے مایوس نہ تھا۔ اسے علم تھا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہر دور میں موجود تھے جن پر ابلیس کا اغوا ممکن نہ تھا۔

دلِ یزداں نے اپنے آپ سے کہا۔

"تو نہیں جانتا جلیل القدر فرشتے...... وہ مجھے یاد نہیں کرتا...... لیکن میں ابھی اسے بھولا نہیں۔ وہ سرگرداں ہے جانتا نہیں قطرہ جب تک سمندر کا جزو نہ بنے مطمئن نہیں ہو سکتا...... اس کی بے قراری جب تک مجھ میں ضم نہیں ہوتی قرار نہیں پا سکتی...... تو نہیں جانتا جو میں جانتا ہوں۔ ابھی بھی حضرت آدم کا علم الاّ قلیلا ہی ہے۔"

کھڑاویں

موسیٰ کبھی اپنی بات کسی کو سمجھا نہ سکا۔ نہ تو اس کی زبان میں لکنت تھی نہ انداز بیان میں پھڑکن لیکن جب بھی کسی سے گفتگو کرتا رنجش' ناراضگی' نافہمی' الجھاؤ ہی پیدا ہوتا۔ پہلے موسیٰ بات کر بیٹھتا پھر اپنی بات کے جواز میں دلائل اور توجیہات پیش کرنے لگتا...... رفتہ رفتہ اس نے خاموشی اختیار کرلی۔ بہتر یہی تھا کہ بھڑاس نکالنے کے لیے' اپنا عندیہ سمجھانے کی خاطر کسی کو رازدان بنائے۔ اپنے ڈھب پر لانے کے لیے کوئی بات ہی نہ کی جائے۔ پھر موسیٰ کا پیشہ بھی ایسا تھا کہ اسے لوگوں کے پاس ٹھہرنے اور جم کر بات کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی...... وہ مجاز ایجنسی سے اخبار اٹھاتا۔ گنتا' رسید دیتا اور اپنی سائیکل پر رکھ کر انہیں گھر گھری بانٹنے چلا جاتا۔ کبھی کبھی وہ منہ اندھیرے ایجنسی نہ پہنچ پاتا اور اخبار بانٹنے میں سورج نکل آتا تو ایجنسی کا منیجر اسے چھوٹی موٹی ڈانٹ پلا دیتا۔ موسیٰ سر لٹکا کر بس اتنی بات کہتا "بس عبداللہ صاحب دیر ہو گئی معاف کر دیجئے......" موسیٰ ساٹھ سے اوپر تھا نہ تو اس کی سائیکل چھوٹی تھی نہ ہی اخباروں کو اپنی Beat پر لے جانا۔ اخبار بانٹنے کے بعد وہ سیدھا جرنلسٹ خورشید احمد کے گھر چلا جاتا۔ یہاں وہ اوپر کے کاموں پر مامور تھا۔ لیکن سب سے اہم کام یہ تھا کہ وہ خورشید صاحب کے لکھے ہوئے کالم "سرگوش" اخبار کے دفتر لے جاتا۔ ایڈیٹر صاحب سے کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی لیکن علیک سلیک سے آگے بڑھنے کی نہ تو ضرورت پیش آتی نہ ہی موسیٰ بھی جرأت کرتا کہ اپنا عندیہ بیان کرے۔ وہ جانتا تھا اس کی بات اندھیرے میں چلے ہوئے تیر سے زیادہ نہیں۔ کوئی اس کے اندر کی بات سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔

جس روز موسیٰ نے اپنی کھڑاویں مریم کی قبر میں اتار کر ربڑ کی چپلی پہنی اس کا دل بے قرار تھا۔ جب خورشید جرنلسٹ نے اسے لفافہ تھمایا تو موسیٰ پر نہ جانے کیا بات غالب آ گئی اس نے ہچکچا کر کہا...... "سر کسی روز ایک کالم میری کھڑاووں پر بھی لکھ دیں؟......"

"کھڑاووں پر؟ وہ کیا چیز ہے بھئی......"

"وہ جی کھڑاویں نہیں ہوتیں لکڑی کے سلیپر؟...... ہندو لوگ پہنا کرتے تھے......وہ جی......وہ میں نے مٹی کے ساتھ 'اس کی قبر میں اتار دیں......"

"بھائی میرے جوگرز کی بات کرو...... اب کون کھڑاویں پہنتا ہے نئی جنریشن......میں آج کے نوجوان تو اس لفظ سے بھی آشنا نہیں......وہ کالم کیوں پڑھیں گے بھلا......"

موسیٰ ہمیشہ کی طرح اندر بکھر گیا......اس کی بات میں کوئی پاپ روگ سی خرابی تھی اس لیے خورشید صاحب اس کی بات نہ سمجھ پائے؟ موسیٰ کو منظر دھندلا سا نظر آیا اور وہ سائیکل نکال کر مال روڈ کی طرف روانہ ہو گیا جہاں "سرگوش" اخبار کا ہیڈ آفس تھا۔ عجیب اتفاقی معاملہ تھا کہ اس روز چپڑاسی رمضان دفتر کے سامنے موجود نہ تھا اور اندر جھاتی مارنے پر یہ بھی پتہ چلا کہ تلمیذ صاحب بھی سیٹ پر نہ تھے۔ ذرا سی چق اٹھا کر موسیٰ نے اندر نگاہ کی تو ایک دوشیزہ نما خاتون صوفے پر بیٹھی اپنے بائیں ہاتھ کے ناخن فائیل کرنے میں مشغول تھی۔

"کون ہے بھئی؟......"

"جی میں ہوں موسیٰ......کالم لایا ہوں خورشید صاحب سے......"

"آ جاؤ......آ جاؤ......" خاتون نے خوش دلی سے کہا۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ تقدیر اس پر مہربان رہی تھی۔ موسیٰ نے اندر گھس کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تلمیذ صاحب کمرے میں موجود نہیں تھے۔

"آ جاؤ بھئی وہ ابھی آ جاتے ہیں۔ بازو والے کمرے میں گئے ہیں۔"

ابھی خاتون کا جملہ بھی مکمل نہ ہوا تھا کہ ایڈیٹر صاحب آ گئے۔

"سلام علیکم......سر" موسیٰ پچھل پا سرکنے لگے۔

"بھائی کچھ آج دیر نہیں ہو گئی۔ بیٹھو...... خورشید صاحب سے کہنا کالم ذرا

جلدی بھیج دیا کریں۔"

آج تک موسیٰ کو کبھی انہوں نے کرسی پیش نہیں کی تھی۔ یہ اس خاتون کا اعجاز تھا کہ موسیٰ کو آج ایڈیٹر صاحب بدلے بدلے سے لگے۔ کچھ کھلے کھلے کچھ شرمائے سے تھوڑے سے مونچھوں تلے مسکراتے ہوئے تلمیذ صاحب نے موسیٰ سے لفافہ پکڑتے ہوئے کہا......"کیوں موسیٰ آج کل کیا خبریں ہیں شہر میں...... لوگوں کا ری ایکشن کیا ہے اس نئی تبدیلی پر......"

"کونسی تبدیلی سر؟......"

"بھائی اس نئے مارشل لاء کے متعلق لوگ کیا سوچ رہے ہیں......"

موسیٰ نے اپنے ارد گرد کے لوگوں کو نظر میں پینوراما کی طرح پھرایا......وہاں مدتوں سے کوئی رد عمل کہیں موجود ہی نہ تھا......ملک میں ہونے والی تبدیلیوں کو وہ اس قدر جانتے تھے جس قدر وہ کاسوو' چیچنیا' سوڈان' الجیریا کے حالات کے متعلق انفرمیشن رکھتا تھا۔ وہ تو یہ بھی سمجھ نہ پایا تھا کہ کشمیر میں جو کچھ ہوتا رہا یا ہوتا چلا جاتا ہے اس کا ان کی زندگی سے کیا تعلق ہے......؟

"لوگ اپنے اپنے غموں سے بوجھل ہیں سر...... کوئی کسی کے متعلق نہیں سوچتا سب اپنے میں گم ہیں۔"

خاتون مسکرائی وہ ایسے جملوں کو کلیشے سمجھتی تھی۔

"تم تو خورشید صاحب کے پروردہ ہو تمہیں تو اپنی رائے دینی چاہیے ہم ایک سروے کر رہے ہیں کہ عام آدمی اس مارشل لاء کے متعلق کیا سوچتا ہے؟......"

موسیٰ گڑبڑا گیا۔

"میری تو جی بیوی مر گئی...... پچاس سال کا ساتھ تھا...... میں نے اس کے ساتھ اپنی کھڑاویں دفن کر دیں جی مریم کے ساتھ...... اب سوچتا ہوں میں نے اچھا کیا......کہ بُرا......؟"

"کھڑاویں؟ واٹ از کھڑانویں؟......" خاتون نے پوچھا۔

ہمیشہ کی طرح موسیٰ اپنی بات کا عندیہ سمجھانے سے قاصر تھا نہ اس کی زبان میں لکنت تھی نہ ہی الفاظ کی کمی لیکن ہمیشہ کی طرح وہ پھر مغالطوں میں پڑ گیا۔ تلمیذ صاحب خاتون کو کھڑاویں سمجھانے میں مصروف ہو گئے......

"لکڑی کے سلیپروں کو کھڑاویں کہتے ہیں۔"

"لکڑی کے سلیپروں کو......؟" عبیرہ نے پوچھا۔

"جس طرح آج کل ہوائی چپل نہیں ہوتے ایسے ہی پرانے زمانے میں کھڑاویں ہوتی تھیں۔ ربڑ کی جگہ نواڑ استعمال کرتے تھے۔ کبھی کبھی نواڑ بھی استعمال نہ کی جاتی بلکہ ایک بڑا سا لکڑی کا کیل انگوٹھا اور انگلیاں علیحدہ کرنے کے لیے ٹھونک دیا جاتا۔ چلتے وقت بڑی ٹک ٹک کی آواز آتی۔"

"لوگ ہر زمانے میں اذیت پسند رہے ہیں۔ لکڑی کی چپلی میں کوئی کمفرٹ نہ ہو گی......"

"بادشاہ لوگ تک کھڑاویں پہنتے تھے۔ راجہ رام چندر جب بن باس کو گئے تو ان کے پیروں میں کھڑاویں تھیں۔ جب ان کے سب سے چھوٹے بھائی بھرت نے راج پاٹھ سنبھالا تو اس نے راجہ رام چندر کی کھڑاویں تخت پر رکھ دیں اور خود ان کا سمبل بن کر راج کرنے لگا......"

"ھاؤ فولش...... ھاؤ سلی یہ دیو مالائی باتیں عموماً بڑی For Fetched ہوتی ہیں!" خاتون بولی۔

"میں چلا جاؤں......جی؟" موسیٰ نے پوچھا۔

"ہاں بھئی ضرور...... تلمیذ ایڈیٹر نے کالم پکڑ لیا اور ایک بار پھر خاتون کو اپنے تبحر علمی کے گھیرے میں لے کر بولتا چلا گیا۔ عبیرہ سے بات کرنے کا یہ بہانہ اسے پسند آگیا اور وہ دیر تک اس مضمون کا سہارا لے کر اپنا آپ سمجھاتا رہا کہ کھڑاویں کیسے بدھ مت کے بھکشوؤں کا سمبل، ہندو پجاریوں کی سادگی اور برصغیر میں صدی بھر پہلے مسلمان گھرانوں میں بھی وضو کے بعد استعمال کی چیز تھی۔

موسیٰ کے پاس یہ کھڑاویں پورے باون سال پہلے آئی تھیں۔ وہ بٹالے سے پناہ گزینوں کے ہمراہ بالکل تنہا آیا تھا۔ جس لٹی پٹی بس میں وہ سوار ہوا اس میں زخموں سے چور، خاندانوں سے بچھڑے ہوئے، نادار جاہل لوگ ٹھسا ٹھس بھرے تھے۔ سب کی زبانیں گنگ اور دماغ چل رہے تھے...... اس سفر میں اسے ایک جوڑی کھڑاویں اور مریم اکھٹے ملے۔ کوئی شخص بس میں یہ سلیپر بھول گیا تھا اور موسیٰ ننگے پاؤں تھا۔ اسے پتہ نہیں کتنے دنوں سے جوتی میسر نہ آئی تھی۔ کھڑاویں پہن کر اس کے پیروں سے دعا نکلی

اور موسیٰ نے محسوس کیا کہ اس کی زندگی میں اس قدر آرام دہ جوتے کبھی آئے ہی نہ تھے......

مریم سے بھی بڑی جلدی ناطہ طے ہو گیا وہ بھی تن تنہا پاکستان پہنچی تھی۔ راستے میں اس کے سنگی ساتھی قتل کر دیئے گئے۔ مریم خالی آنکھوں سے سہارے تلاش کرتی موسیٰ کی لاٹھی بن گئی۔ دونوں بڑی خاموشی، رضامندی اور خوش دلی سے غریبی، بیماری اور کسمپرسی کی زندگی گزارتے گزارتے سفید بالوں، ٹوٹے دانتوں اور درد کرتے جوڑوں تک آ پہنچے۔

مسجد سے چار مکان چھوڑ کر بائیں طرف جو چھوٹا سا گھر تھا اس میں مریم رہتی تھی۔ ساری گلی میں یہ سب سے چھوٹا مکان تھا۔ صحن میں بغیر چھت والا باورچی خانہ جس سے معلق ایک کمرہ اور غسل خانہ تھا...... محلے کے لوگ کافی امیر ہو چکے تھے لیکن موسیٰ اور مریم ابھی تک اپنے حالات نہ سدھار سکے۔ وہ دونوں اپنے اپنے ماضی کو بھول کر ہمیشہ مستقبل میں حج کرنے کا خواب دیکھتے اور آہستہ آہستہ اس فریضے کے لیے رقم جوڑتے رہتے۔ مریم سوچتی کہ شاید مدینے جا کر اپنی عرضی ڈالنے پر اس کے گھر میں کہیں سے ہنستا کھیلتا بچہ آجائے گا۔ مریم محلے والیوں سے ملتی رہتی باتیں کرتی لیکن پتہ نہیں باتوں کی کس سٹیج پر اسے علم ہو جاتا کہ مریم کے دل کی بات کو سننے کے لیے کوئی تیار نہیں...... سب اپنی سنانے اور اپنی منوانے کے چکر میں ہیں۔ وہ کبھی کبھی ساتھ والے گھر میں شیخانی جی کے پاس جا بیٹھتی۔ اس گھر میں سارے کام کر لوگ بستے تھے۔ لڑکے کھڈی سے کپڑا بناتے۔ ماں ہر وقت کچھ پکانے ریندھنے کاٹنے میں مشغول رہتی۔ بہو بیٹیاں مشین پر پائینچے بنانے، بیڈ کور کاڑھنے، آرڈر پر کڑھائی کا کام کرتی رہتیں...... یہ بڑا سلیقے والا سگھڑ کماؤ گھر تھا۔ دنوں میں یہاں لہر بہر دکھائی دینے لگی۔ دس مرلے والے گھر پر ڈبل سٹوری پڑ گئی۔ کچھ افراد کھلے گھروں میں چلے گئے۔ باقی محنتوں میں جتے رہے۔ مریم کا دل کبھی بھائیں بھائیں کرتا۔ بات کرنے کو کوئی نہ ملتا تو وہ شیخانی جی کے پاس جا بیٹھتی۔ ان کی چھری مانگ کر مریم سبزی بنانے لگتی۔ مسالے صاف کرنے یا لہسن ادرک پیسنے میں مشغول ہو جاتی۔ وہ خدمت کے ذریعے شیخانی جی کے دل میں گھر کرنا چاہتی تھی...... شیخانی نے اپنا جسم، روح، دماغ سب کچھ کام کے ہاتھوں بیچ کر رکھا تھا۔ وہ کام کے سہارے زندہ تھی، وہ ترقی کے خواب میں گم تھی۔ اپنوں کی سیڑھی پکڑے کھڑی

تھی جس پر اس کے افراد خانہ دھڑا دھڑ اوپر چڑھتے نظر آتے تھے۔

شیخانی اوور ٹائم سے تو واقف تھی لیکن انڈر ٹائم کو نہ جانتی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ انڈر ٹائم اندر ہی اندر کاٹنے والی ایک چیز ہوتی ہے۔ کام کی توانائی کو سارے وقت کو کھا جاتی ہے لیکن اندر ہی اندر انڈر ٹائم سرنگ سے مشابہہ' دیمک کی طرح رستا بستا اور اندھیروں میں پھلنے پھولنے والا ایک چھوٹا سا آبدوزی راستہ بیرونی وقت کے نیچے بہتا رہتا ہے...... کبھی کبھی جب انڈر ٹائم کی نالی میں کثافتیں زیادہ جم جاتی ہیں اور انسان کو پتہ نہیں چلتا کہ اس کی اداسی' بے چینی' بے یقینی' شک و گمان کی اصل وجہ کیا ہے تو پھر روح کے گٹر کاؤنٹر سے پتہ لگانا پڑتا ہے کہ انڈر ٹائم میں کس مقام پر کہاں آلائشیں جمع ہو گئی ہیں اور انڈر ٹائم کے بہاؤ میں کہاں رکاوٹ پیدا کر رہی ہیں۔ کئی بار روح راستہ کھول دیتی ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ روح خود بے چین ہو کر باہر نکل جاتی ہے اور کوئی فرحت بخش نیوکلیائی شعاعیں اٹکاؤ کو توڑنے کے لیے نہیں آتیں...... ایسے میں انسان ذہنی مریض بن جاتا ہے۔ وہ اوور ٹائم تو لگاتار رہتا ہے لیکن اس کے نیچے بہنے والا انڈر ٹائم پرانا سوکھا گٹر نالا ان گنت پلاسٹک بیگوں' ہڈیوں' انسان اور جانوروں کے خشک فضلے سے اٹ جاتا ہے۔ اس کو کھولنے کے لیے پھر دوائیں' سائیکلوجسٹ' دوست' رشتہ دار' مواقع زیر استعمال آتے ہیں۔ لیکن گٹر نالہ تیز پانی کے بہاؤ اور لمبے بانسوں کے زور سے نہیں کھلتا۔ کبھی کبھی انڈر ٹائم کا بہاؤ محبت کے اعتباری لمس اور محبت کی میٹھی نظر سے چلنے لگتا ہے۔ لیکن مریم کو معلوم تھا کہ اس مصروف دنیا میں ایسی بیکار سی چیز کے لیے کسی کے پاس ٹائم نہیں ہے۔

شیخانی جی سے بددل ہو کر وہ استانی جی کے پاس جا بیٹھتی۔ استانی جی ریٹائر ہو چکی تھیں ساری زندگی کلاس روم میں اونچا اونچا بولتے' چپ کراتے' سزائیں دیتے' سبق پڑھاتے وہ ریڑھ کی ہڈی تک تھک چکی تھیں۔ اپنی دونوں بیٹیاں بیاہ کر اب وہ خالی خالی محسوس کرتی تھیں لیکن انہیں اتنی مشکل سے رشتے ملے تھے کہ اگر کبھی کبھار بیٹیاں ملنے بھی آ جاتیں تو وہ خوفزدہ ہو جاتیں ان کا لڑکیوں کو یہی حکم تھا کہ جب بھی آؤ شوہر کے ساتھ آؤ اور اس کے ہمراہ لوٹ جاؤ...... زیادہ دیر ٹھہرنے کا کوئی مذاق نہیں۔

استانی جی شفیق' خوش شکل نصیحتی عورت تھیں وہ جب بھی مریم سے ملتیں

اسے کھانے پکانے کی ترکیبیں' مجرب طبی نسخے' گھریلو ٹوٹکے' سلائی دھلائی' رنگائی کے ضروری نکتے بتاتی رہتیں۔ مریم تو اپنے خالی اوقات کو بھرنا چاہتی تھی وہ نہ کوئی ہنر جانتی تھی نہ ہی باتونی تھی۔ اخبار بھی وہ کم کم پڑھتی تھی حالانکہ موسیٰ کے گھر میں اخباروں کی کمی نہ تھی۔ انڈر ٹائم کا نالہ سست تھا لیکن اس کو رواں کرنے کا کوئی طریقہ مریم کو نہ آتا تھا...... کدھر جائے کس سے بات کرے...... مشورہ لے تو کس سے لے؟

کبھی کبھی ہمسایوں سے مایوس ہو کر وہ ظہر اور عصر کے درمیان مولوی جی کے گھر چلی جاتی۔ بیوی کے مر جانے کے بعد مولوی جی نے کچھ سال بڑی تنہائی کے کاٹے۔ جب سے مولوی جی کی بیٹی بتول کا شوہر فوت ہوا تھا۔ وہ مولوی صاحب کے گھر کی دیکھ بھال کرتی تھی...... چپ چپ' اجلی سی موٹی آنکھوں والی بتول کا قرینہ تھا کہ وہ دوسرے کی ضرورت بن مانگے پوری کر دیتی۔ شاید یہ مولوی صاحب کی تربیت تھی یا پھر یہ اس کی اندرونی شرینی تھی کہ وہ گلہ آمیز گفتگو کیے بغیر لڑائی جھگڑے میں گھمن گھیریاں نہ کھاتے ہوئے بھی دن پورے کرنے کا علم جانتی تھی۔ اس میں ایک ہی نقص تھا اس کے ہاتھ پاؤں تو چلتے تھے لیکن زبان گفتگو سے پرہیز کرتی رہتی تھی۔ اس روز بتول گھر پر نہ تھی مریم نے دروازہ کھٹکھٹایا تو مولوی جی نے ہی کھولا۔ نظریں نیچی کیے مولوی جی نے کہا...... "بی بی وہ بتول تو گھر پر نہیں ہے......"

پتہ نہیں کیوں مریم گھر جانا نہیں چاہتی تھی حالانکہ یہی موسیٰ کے گھر آنے کا وقت تھا۔

"کہاں گئی ہے مولوی جی؟"

"ذرا قبرستان تک گئی ہے ماں کی قبر کو سلام کرنے......"

"ضرور ضرور وہ آتی ہی ہو گی......"

مریم چارپائی کی پائینتی پائے سے لگ کر بیٹھ گئی وہ اپنے آپ کو اس سے زیادہ کی حقدار نہ سمجھتی تھی۔ مولوی جی نے اس سفید بالوں والی بڑھیا سے کوئی خطرہ محسوس نہ کیا وہ آرام سے بیٹھ کر اپنی لالٹین صاف کرنے لگے۔

بڑی ہمت کر کے مریم نے کہا...... "مولوی جی کوئی ایسا وظیفہ بتائیے جس سے اس دنیا میں دل لگ جائے...... کوئی وجہ ہو زندہ رہنے کے لیے...... مرنے کا خیال نہ آئے بار بار......"

مولوی جی مسکرائے پھر ٹھہر ٹھہر کر بولے......"بڑے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو مرنے سے پہلے مر گئے آپ کیوں دل لگانے کا جھنجھٹ مول لینا چاہتی ہیں......"

مریم نے مولوی جی پر نظر ڈالی اور دل میں سوچا واقعی نیک لوگوں کے پاس بیٹھ کر کوئی راحت نہیں ملتی۔ یہ مشکل پسند لوگ اتنی اذیتی زندگی گزارتے ہیں کہ خوشی کا ست رنگا پرندہ ان کے چوبارے پر کبھی آکر بیٹھ ہی نہیں سکتا اور جو کہیں غلطی سے آ بھی بیٹھے تو یہ تالی مار کر اسے اڑا دیتے ہیں۔

مریم نے پتہ نہیں کیوں کریدنا چاہا۔

"مولوی جی......بتول کے متعلق آپ نے کیا سوچا ہے اتنی پہاڑ سی زندگی یہ بے سہارا تو نہیں گزار سکتی......"

مولوی جی نے بڑھیا کی طرف نظر ڈالی۔ انہیں یاد آیا کہ جب موسیٰ اور مریم اس گلی میں آکر بسے تھے تب مریم پر نظر پڑ کر ٹھہر جاتی تھی۔ جل شانہ، بنانے والے کو ڈھانے کے بھی کتنے طریقے ازبر ہیں؟ اب تو مریم کی شکل کوڑے کا ڈھیر تھی کہ دیکھتے ہی منہ پرے کرنے کو جی چاہتا۔ مولوی جی کو بیٹی کی بیوگی کا بڑا گہرا دکھ تھا۔ لیکن ان کی ٹریننگ ایسی تھی کہ انہوں نے بیوی کے مرجانے پر بھی نفل پڑھے اور داماد کے رخصت ہونے پر بھی سجدہ ہی کیا۔

"جس نے بیوہ کیا ہے وہی اس کے متعلق سوچتا ہوگا بی بی......ہمارے لیے تو یہ خدائی مہمان ہے جو کچھ بس میں ہوتا ہے کر دیتے ہیں......اس کی تقدیر کا تو وہی کرتا دھرتا ہے۔"

مولوی جی بھی اور ٹائم کے آدمی تھے۔ نمازوں سے فارغ ہوتے تو تلاوت میں جت جاتے۔ تلاوت بند ہوتی تو ذکر فکر میں وقت گزرتا۔ اس سے فراغت ہوتی تو بچوں کو قرآن کی تعلیم دینے میں مصروف ہو جاتے۔ ان کو اپنے مالک حقیقی کو راضی کرنے کا اس قدر شوق تھا کہ سارا وقت اس کی نذر کرتے اور جو کبھی اپنا خیال درمیان میں آجاتا تو استغفار اور لاحول پڑھ کر فارغ ہو جاتے۔

"اچھا تو میں چلتی ہوں کون جانے بتول کب آئے؟"

مولوی جی کو بھی بڑھیا سے باتیں کرنے کا کوئی شوق نہ تھا وعلیکم السلام کہہ

کر مریم کو رخصت کر دیا۔

گھر پہنچ کر مریم نے دیکھا موسیٰ ابھی تک نہ لوٹا تھا۔ اس نے کوٹھڑی میں گھس کر کنڈی لگالی۔ سرہانے کے اندر سے چھوٹی سی تھیلی نکالی اور ہزار بار گنی ہوئی رقم گننے لگی۔ پیسوں کی طرف سے تو اسے مکمل تسلی تھی لیکن قرعہ نکلنے کی امید کم کم تھی۔ ساری امیدیں اب ایک نکتے پر مرتسم ہوگئی تھیں......اسے لگتا کہ مدینے پہنچتے ہی وہ اپنے سارے راز، تکلیفیں، محرومیاں ایک ہی بار وہاں ڈھیر کر دے گی۔ انڈر ٹائم کا بند تالا کھلتے ہی اس کی بے چینی، حیرانی، خوف وملال میں سن ہوئی گھڑیاں شفاف ہو جائیں گی۔ اوپر کا وقت اور اندر کا سے گھڑی کی چھوٹی بڑی سویاں بنکر ایک ہی وقت کی شہادت دے گا۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ مریم نے چھوٹی بگچی میں رقم ٹھونسی اسے تکیے کے اندر اڑسا اور دروازہ کھولنے چلی گئی۔

"دروازہ بند کر کے کیا کر رہی تھی مریم......؟" موسیٰ نے پوچھا۔ اس کم گو نے مریم سے سوال جواب کی عادت نہ پالی تھی۔

"بس......اب تو رقم کافی ہوگئی ہے جو ہمارا نام نکل آئے......"

"خورشید صاحب نے کہا ہے کہ اس سال کام ہو جائے گا......"

مریم کئی سالوں سے یہ سن رہی تھی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح وہ اب بھی چپ رہی۔ بھلا موسیٰ کا بھی خورشید صاحب پر کیا اختیار؟ اس کی تو ساری عمر مکان کی قسطیں ادا کرنے میں بسر ہوئی باقی بچی رقم موسیٰ نے ہر مد سے سرکا کر حج کے لیے جمع کی۔ یہ دونوں نہ پکے مسلمان تھے نہ جذبوں کے آدمی......یہ تو اپنے اپنے گٹر نالے کو کھلوانے کے لیے بڑے دربار میں پہنچنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے دل کا خیال کرتے ہوئے اپنی کسی دلی خواہش کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ ہر گلی سڑی خواہش، ناکردہ حسرت، تنگ کرنے والی تمنا کو کہیں اندر ہی اندر دبا لیا تھا۔

مریم باہر نکلی تو باورچی خانے کے سامنے سٹول پر ایک دس بارہ برس کا لڑکا میلی چکٹ قمیض، پھٹی ہوئی جینز پہنے، ننگے پاؤں بیٹھا تھا۔

بڑی لجاجت سے موسیٰ بولا......"اسے کچھ کھانے کو دے دو مریم دو دن سے بھوکا ہے۔"

موسیٰ اور لڑکے کو کھانا دے کر مریم ذرا فاصلے پر ہو کر بیٹھ گئی۔ موسیٰ کا چہرہ

ایک عرصے کے بعد بے نقاب ہوا وہ اپنے سالن کو چوری چوری چھوکرے کی تمام چینی کی پلیٹ میں منتقل کر رہا تھا۔ پھر اپنے حصے کی کھجوریں بھی اس نے لونڈے کو دے دیں......

"اس کو جوتا دلانا تھا...... اگر کچھ پیسے دے دو......؟"

مریم نے تو خود برسوں میں نئے سلیپر نہ خریدے تھے۔ گھر پر ننگے پاؤں اور باہر جاتے ہوئے سلیپروں کو اڑس لیتی لیکن آج جس موسیٰ سے وہ متعارف ہوئی وہ ایک باپ تھا۔ ایسا باپ جو بیٹے کے راستے چوری چوری مستقبل میں داخل ہو جاتا ہے...... وہ چپکے سے اٹھی...... اندر گئی۔ کنڈی لگائی اور تکیے کے اندر سے تھیلی نکال لائی۔ موسیٰ نے جب اس میں سے تین سو روپے نکالے تو مریم نے کہنا چاہا...... "اتنے زیادہ؟" لیکن مریم نے کبھی بغیر ڈھکنا دیئے ہنڈیا نہ پکائی تھی وہ زبان کی لگام پکڑے بغیر بات بھی نہ کرتی تھی، چپ رہ گئی۔

"سکھ نالے کے قریب گرا ہوا تھا۔ شکر ہے کوئی کار اوپر سے گزر نہیں گئی۔"

"ہاں......" مریم نے جواب دیا۔

"کیوں لونڈے گھر کا پتہ ہے ناں...... وہاں چھوڑ آؤں گا تجھے......"

لڑکا کھانا کھا کر تر و تازہ ہو گیا تھا...... "ہاں جی...... میں آپ کو لے جاؤں گا سکھ نالے کے قریب ہی رہتی ہے میری ماں...... بیمار ہے جی کئی مہینوں سے۔"

آنگن میں کھڑی سائیکل کو موسیٰ نے پکڑا۔ بچے کے سر پر تشفی آمیز ہاتھ پھیرا اور ہرا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ مریم نے کہنا چاہا پچھلے ٹائر میں ہوا کم ہے لیکن پھر سوچا کہ آخر جس کی سائیکل ہے اسے بھی تو علم ہو گا...... خواہ مخواہ دخل اندازی سے مطلب؟...... موسیٰ جب لڑکے کو لے کر رخصت ہو گیا تو مریم پہلی بار جاگی اور ایک مشکل فیصلے پر پہنچی۔ اس نے اپنے دکھتے گھٹنے، بوڑھے ہاتھ، بوائی پھٹے پاؤں دیکھے۔ ایک مدت سے وہ گھر کے کام کاج ہونک ہانک کر نپٹاتی رہی تھی۔ آٹا گوندھتے کلائیاں دکھتیں، انگلیوں میں سے کڑک کڑک کی آواز نکلتی...... پر وہ رک رک کر گوندھے جاتی۔ چھوٹے موٹے بخار کے بعد جب دنوں اٹھا نہ جاتا تو بھی وہ موسیٰ کے لیے گوندھتی، رینڈھتی، جھاڑو بہارو دیتی، کپڑے دھوتی۔ اب تو ڈاکٹر نے شوگر کی بیماری بھی تشخیص

کردی تھی اور یہ تنبیہ بھی کی تھی کہ بلڈ پریشر بہت ہائی رہتا ہے۔ اگر بیماری پر توجہ نہ دی گئی تو سٹروک کا اندیشہ ہے...... فالج یقینی ہو گا......

مریم اپنے کندھوں پر مکے مارتی تھی۔ اپنی عقل پر اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے اتنے سال اپنی وجہ سے موسیٰ کو کیسے محروم رکھا؟...... اس کی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ پہلے اس نے لاٹھی اٹھا کر چلنا چاہا۔ پھر لاٹھی واپس رکھ دی اور سوچا کہ لاٹھی کے ساتھ خواہ مخواہ دس بارہ سال عمر میں اضافہ ہو جاتا ہے...... سینے میں رکی ہوئی کھانسی بند بھونرے کی سی آوازیں نکال رہی تھی۔ اپنی تجویز پر وہ مطمئن تھی۔ بڑی دیر کے بعد اسے اپنے شکستہ جسم سے آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔

مولوی صاحب نے بغور مریم کی بات سنی۔ اس صبر کے پہاڑ پر مریم کی تجویز کا کوئی اثر آشکارا نہ ہوا۔

"بات تو آپ کی ٹھیک ہے لیکن......"

"میں...... بوڑھی جان...... نہ کوئی آگا نہ پیچھا مولوی صاحب...... چھوٹی بہن میرے ساتھ آئی تھی اس نے راستے میں ایک کنوئیں میں چھلانگ لگا دی...... اب میرے اپنے بھائی ہیں نہ دودھ شریک بھائی نہ ماں باپ کے سانجھے رشتہ دار...... نہ شوہر کے سنگی ساتھی...... ہم دونوں ہیں بس......"

"الحمد للہ...... جس کا کوئی نہ ہو اس کا خدا ہوتا ہے......"

"یہی بات مولوی جی...... بالکل یہی۔ میں تو بیماریوں کی گٹھڑی ہوں۔ گھر کا کام کاج بوجھ بن گیا ہے...... موسیٰ مجھ سے پانچ سال چھوٹا ہے۔ ابھی ساٹھ کا ہوا ہے پر کاٹھی اس کی مضبوط ہے......"

"وہ تو ہے بی بی...... پر آپ اس سے پوچھ تو لیتیں...... موسیٰ بڑا اصولی آدمی ہے۔"

"موسیٰ سے آج تک میں نے کوئی فرمائش نہیں کی مولوی جی...... اگر آپ کرم کر دیں گے تو وہ مان جائے گا...... کون جانے گھر میں کسی بچے کی آواز سن کر ہم سب جی اٹھیں موسیٰ...... میں...... اور بتول......"

"پر مجھے بتول سے پوچھنا ہو گا بی بی...... یہ شرعی مسئلہ ہے۔"

"پوچھیں پوچھیں ضرور پوچھیں...... میں کب روکتی ہوں؟"

موسیٰ سے جب مریم نے بات کی تو وہ چپ ہو گیا۔ وہ ایسا شوہر تھا جو مدتوں سے
ایک چپ سو سکھ کا سودا کر چکا تھا..... "سوچ لے مریم..... یہ تیرے سوچنے کی بات ہے
میرا تو اس میں کوئی نقصان نہیں۔"

"میری ہڈیاں جواب دے چکی ہیں..... کام کاج بھی سنبھالے گی اور..... تجھے
بھی سکھ دے گی پھر جو اللہ نے سن لی تو۔"

"تو کیا؟....."

نہ مریم نے اپنی بات مکمل کی نہ موسیٰ نے اصرار سے کچھ پوچھا۔ اب مریم کو
محسوس ہوا کہ حج کیے بغیر ہی اس کی دعاؤں نے تکمیل کی دہلیز چھولی۔ بتول سے جب
مولوی جی نے موسیٰ کا ذکر کیا تو اس کے چہرے پر ایک ردا احتجاج کی چھپلی پھر اس کو
ایجاب و قبول کے حجاب نے اتار پھینکا۔ بتول کا نکاح بڑی سادگی اور تکلفی یقین کے
ساتھ ہو گیا..... مریم کو اس نئی بٹوری شادی نے بالکل ہی بیکار کر دیا۔ گھر کے کام کاج
سے فراغت پا کر..... مریم کا انڈر ٹائم بہت بڑھ گیا تھا۔ اب فراغت کے اوقات اس قدر
خطرناک ہو گئے کہ وہ چارپائی دھریک کے نیچے گھسیٹ کر ڈالتی اور چپ چاپ بتول کو
کام کرتے دیکھتی چلی جاتی۔ بتول کے جسم میں نرت کی سی کیفیت تھی۔ اٹھانا' رکھنا'
نچوڑنا' پھیلانا' تہہ کرنا سارے عمل بھارت ناٹیم کی طرح ماتروں کی بانٹ میں تھے۔
بڑی بڑی آنکھوں والی بتول خدمت میں طاق تھی وہ بن مانگے پانی لاتی' کھانا دیتی' بستر
بچھاتی' تکیہ لگاتی' گرم پانی کی بوتل پیش کرتی..... دوسرے کی ضرورت کا ٹیلیفون اس کے
دل میں بجتا اور وہ تعمیل بجا لاتی..... جب خدمت کرواتی مریم پر کچھ عرصہ گزر گیا اور
انڈر ٹائم کی طوالت سے وہ گھبرا گئی تو ایک دن اس نے سوچا کہ دیوار سے ٹنگی چارپائی کو
خود ہی اتار دھریک نیچے لے چلوں۔ خود ہی اپنا بستر ا تکیہ لاؤں اور پھر لیٹ کر اپنے اندر
کی خشک کاریز سے پرانی یادوں' خشک خواہشوں' تعفن پھیلاتی گلہ گزاریوں' قسمت کے
خلاف ابھر آنے والے سیم اور تھور کو صاف کروں..... کبھی آنسوؤں سے کبھی آہوں
کی گرم ہوا سے اس کوڑے کو پاک کروں۔

یہ نہیں کہ مریم کی قوت بالکل ختم ہو چکی تھی یہ بھی نہیں تھا کہ وہ جان بوجھ
کر گری۔ بس یہ بھی ان باتوں میں سے ایک تھی جو ہو جایا کرتی ہے۔ جونہی اس نے ہُچکا
مار کر چارپائی دیوار سے اتاری وہ اور چارپائی دونوں دھڑام سے اوپر نیچے آ گرے۔

روٹی کا پیڑا پرات میں پھینک کر بتول چلّائی..... "ہائے میں مری" چارپائی کو
جب مریم پر سے اٹھایا تو نیچے سے وہ بڑھیا نکلی جس کی کولہے کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی.....
اب بتول کے لیے خدمت بڑھی' مریم چارپائی پر قید ہوئی اور موسیٰ کے لیے خرچ بڑھ
گیا..... لیکن تینوں نے اپنی اپنی مشکلات کا ذکر اپنے آپ سے بھی نہ کیا ایک روز جب
موسیٰ اخبار بانٹنے کے بعد خورشید صاحب سے کچھ قرض مانگ کر گھر لایا تو وہ بیحد تھکا ہوا
تھا۔ گھر میں گھسا تو مریم دھریک تلے منہ سر لپیٹے لیٹی تھی۔ بتول باورچی خانے میں
بیٹھی چھت سے اترتی دھوپ کو دیکھنے میں مگن تھی۔

موسیٰ چپکے سے دبے پاؤں داخل ہوا۔ سب سے پہلے اس کی نظر بھی اس
دھوپ پر پڑی جسے بتول دیکھ رہی تھی۔ وہ سوئی ہوئی مریم کو جگانا نہ چاہتا تھا۔ جوتا اتار کر
باورچی خانے تک پہنچا اور بتول کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے متوجہ کیا۔ اندر والی
جیب سے دو ہزار کی رقم نکالی اور بتول کے ہاتھوں میں اس طرح دی کہ تا دیر بتول کا
ہاتھ اس کے ہاتھوں میں رہا۔

مریم بھی سوئی نہ تھی آنکھیں بند کر کے ٹوٹی ہڈی کے درد کو بہلانے کی
کوشش میں تھی۔ مندی مندی آنکھوں سے جو منظر مریم کی بوڑھی آنکھوں نے دیکھا
اس کا تو اس نے خواب میں بھی سودا نہ کیا تھا۔ موسیٰ گھٹنا بتول کی پشت سے لگا ایسی
باتیں کر رہا تھا جس کی مریم کو توقع نہ تھی..... اچانک مریم کو سمجھ آئی کہ اپنے جسم کو سکھ
دینے اور گھر کو بچوں کی آوازوں سے بھرنے کا جو خواب اس نے دیکھا تھا اس کی قیمت
بہت زیادہ تھی۔ اب اس کے ہاتھوں میں ایسا تڑخا ہوا گلدان تھا جسے وہ بازار لے جا کر
دکاندار کو لوٹانے کا عزم کرنے پر مجبور تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ بتول جیسے بال آئے
کرسٹل واپس نہیں کیے جا سکتے۔ مریم نے بچوں کا خواب ضرور دیکھا تھا لیکن یہ اس کے
وہم و گمان میں بھی نہ آیا تھا کہ موسیٰ کے دل پر بھی بتول کا قبضہ ہو جائے گا۔ پیسے پر بھی
اسے یاوری حاصل ہو گی' ٹکٹ سکہ بھی بتول کا چلے گا۔ جب پاؤں کی جوتی سر کو لگی تو
مریم نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ بھلا اب وہ کسی سے اندر کی بات کیا کرتی؟ پہلے ہی
کوئی اس کے اتنا قریب نہ تھا کہ بات سنتا' اب خود کردہ کا علاج کہاں سے
لاتی؟..... چپ ہو گئی اتنی چپ ہوئی کہ آخر میں چپ کو ڈھانپنے کے لیے اندھیری قبر کا
سہارا لینا پڑا۔

بھلا ایسی باتوں کا ذکر بھی کسی سے کیسے کیا جا سکتا ہے؟ محلے والوں نے موسیٰ سے چند دن افسوس کیا۔ لیکن روزی کی تلاش میں سب بھول بھال گئے۔

موسیٰ نے گو کھڑاویں قبر میں مریم کے ساتھ ہی دفن کر دی تھیں لیکن کبھی کبھی وہ پیڑھی پر خالی الذہن بیٹھ کر سوچتا رہا کہ اس کے اور بتول کے یونین کو مریم کے ساتھ کس طرح تقاطع کرنا چاہیے تھا؟ یہ بات وہ کسی اور سے سمجھنا چاہتا تھا کہ زندگی کیوں ایک ہی کیپسول میں غم اور خوشی کو اکٹھا کر دیتی ہے؟

بڑی بڑی آنکھوں والی حور صفت بتول بھی آج تک کچھ سمجھ نہ پائی تھی۔

اسے اپنے سارے فیصلے کیے کرائے ملتے رہے۔ بڑی بڑی آنکھوں والی بتول ابھی سے جنت میں رہنے والی حور بن گئی لیکن کبھی کبھی اس کے پروں کے سرے انسانی خواہشوں کی حدت سے جلنے لگتے' پھر اندر ہی اندر وہ توبہ استغفار کے چھینٹے دے کر انہیں بجھاتی۔ بیوگی کا دکھ تو اس کے سینے پر منجنیق کی طرح وار کرتا ہی تھا لیکن ایک اور چہرہ ایسا تھا جس کی راب میں اس کے خیال لتھڑے رہتے پتہ نہیں وہ کون تھا؟ کبھی کبھی وہ مسجد کے پچھواڑے سے مغرب کے وقت نظر آتا۔ شفق کی لالی اس کو شرارہ سا بنا دیتی۔ چہرے پر ہمیشہ ازلی خوف و ملال رہتا۔ اس نمازی نے کبھی نگاہیں پھرا کر ادرگرد نہ دیکھا تھا...... بس حزن کی یہ تصویر دھندلکے میں ابھرتی اور مسجد کی جانب مڑ جاتی۔ اس کی چال جہاد پر جانے والے جانباز کی سی تھی۔ چہرے پر قیدی کا حزن تھا۔ پلکیں گالوں پر دلہن کی طرح جھکی تھیں۔ گردن میں اضمحلال' تھکاوٹ اور بے بسی تھی۔ بتول جانتی تھی کہ اس نمازی کا دراصل کوئی وجود نہیں ہے۔ اسے شفق' نیم اندھیرے اور اس کے خواب نے جنم دیا ہے۔ اس لیے بتول نے کبھی اس کا تعاقب نہ کیا...... اور بات کرنا تو وہ سیکھی ہی نہ تھی...... چپکے چپکے...... دیکھتی رہی جیسے بچے آموختہ یاد کرتے ہیں وہ اس نوجوان کے وجود کو رٹتی رہی۔ کسی سے ان باتوں کا ذکر کیا کرتی؟ جب وہ نکاح ثانی پر رضامند ہو ہی چکی تھی تو پھر نوجوان نمازی کے سومناتی حملے کا ذکر کسی سے کیا کرتی؟ وہ بھی چپ چاپ پیڑھی پر بیٹھ کر صحن میں اترتی دھوپ کو دیکھتی رہتی...... اس کے لیے گھر کا کام کاج اتنا کم تھا کہ انڈر ٹائم کی سرنگ بہت لمبی اور دور تک پھیلتی گئی۔ اس کے انڈر ٹائم میں خوبصورت محلاتی خواب رنگین پتنگیں...... جابجا پھول' نامحسوس خوشبو میں رچی انمول مسکراہٹیں' جھرنے جیسے گیت اٹے پڑے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی تیز ہوا کے

جھونکے' پانی کے ریلے یا اپنے اندر کھینچ لینے والے سکشن والے دھو تو سے یہ خواہشوں کے طومار خود بخود اڑنچھو ہو جائیں اور صاف شفاف جھرنا بہنے لگے لیکن ایسے نہ ہو سکا۔ فراغت نے اس اٹے ہوئے انڈر ٹائم کو اور بھی بھرنا شروع کر دیا...... وہ سوچتی کبھی اگر وہ شخص جو عصر اور مغرب کے دوران مسجد کی پشت سے گزرتا ہے سامنے آ گیا تو کیا ہو گا؟...... اگر کبھی اس نے بتول سے اس کا وجود مانگا تو؟ یہ وہ جانتی تھی کہ اس کے اندر پھیلی ہوئی انڈر ٹائم کی سرنگ تو فوراً کھل جائے گی لیکن اس واقعے کا احتمال تک اسے گناہ لگتا...... خیال میں بھی بے وفائی کرنا اس کے نزدیک گناہ کی بدترین شکل تھی۔ کبھی سوچتی کہ موسیٰ سے اس خواب و خیال کی ساری بات کہہ دے اور اس کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لے لیکن اسے معافی مانگنے کا علم بھی نہ آتا تھا...... ساری عمر بڑی احتیاط اور احتیاج کے ساتھ اس نے سب سے ورے ورے کاٹی تھی۔ وہ کسی سنسناہٹ' تر تراہٹ' بلبلاہٹ کا اظہار کیے بغیر گزران کرنے کی عادی تھی۔ پھر اس بات پر تو جوتا برس سکتا تھا زیادہ خوفزدہ ہوتی تو کانوں کو ہاتھ لگاتی' دل پر تسلی کا ہاتھ رکھ کر دلاسہ دیتی کہ ایسے میں تو طلاق بھی ہو سکتی ہے؟ پھر وہ گھر جا کر مولوی صاحب کو کیا جواب دے گی؟ اس کا ابا تو دس سال سے رنڈوا ہو کر بیوگی کاٹ رہا تھا۔ اس نے تو اپنے رب سے بھی اپنی تنہائی کا ذکر نہ کیا تھا۔ پھر ابے کو لوگوں کی باتوں کے حوالے کرنے کا پلید کام ان کی بیٹی ہی کرے' یہ بات بتول کے دل نے گوارا نہ کی......

اندر کی کوٹھڑی کا دروازہ مقفل کر کے موسیٰ نے پیسوں والی گتھلی کھولی تو حنا کے عطر کی خوشبو کہیں سے آ کر اس کے نتھنوں میں گھس گئی۔ مریم کبھی کبھی ان پیسوں کو عطر لگایا کرتی تھی۔ اس کے پاس ایک چھوٹی بند منہ والی عطر حنا کی شیشی تھی۔ اس خوشبو کو وہ اپنے ساتھ مدینے لے جانا چاہتی تھی۔ اپنا کفن اور یہ شیشی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتے۔ مریم کا خیال تھا کہ وہ آبِ زم زم میں اپنا کفن دھو کر لائے گی لیکن کفن دھونے کی نوبت نہ آئی۔ موسیٰ نے اس کے جنازے کی چادر پر یہ ساری شیشی انڈیل دی لیکن اس چھوٹی سی عطر دانی کو پیسوں والی تھیلی میں رکھ چھوڑا......

اس روز خورشید صاحب موڈ میں تھے۔ کالم لکھ کر وہ کافی فارغ محسوس کر رہے تھے۔

"یہ ذرا میرے کندھے تو دبا دے موسیٰ...... تجھے کیا پتہ کالم لکھنا کیا ہوتا ہے؟

اب تو سارا بدن چور ہو جاتا ہے......"

"کیوں جی کیا یہ بھی مشکل کام ہے ؟"

"جب تک عمل اور علم ساتھ ساتھ نہ ہوں ناں بابا موسیٰ ہر کام مشکل ہوتا ہے۔ میں معاشرے کا علم تو رکھتا ہوں بھائی لیکن مسائل کو سلجھانے کے لیے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا اس لیے میرے لیے یہ کالم نویسی مشکل ہے......"

موسیٰ کرسی کی پشت پر چلا گیا۔ بتول کی گپ چپ دیکھ رکھ نے اس کے بڈھے جسم میں پھر سے توانائی پیدا کر دی تھی۔

"اوئے ظالما آہستہ...... آہستہ...... مجھے معلوم نہیں تھا کہ تجھ میں ابھی بھی اتنا زور ہے......"

موسیٰ ہلکا سا مسکرایا اور مٹھی چاپی میں کم زور لگانے لگا۔ جس طرح عورتیں رت جگا میں چرخے کے ساتھ ساتھ گانے بھی گاتی ہیں باتیں بھی کیے جاتی ہیں۔ نائی حجامت بھی بناتا ہے اور مسلسل بولتا بھی ہے۔ پسنہاری آٹا پیتے میں گیت بھی گا سکتی ہے ایسے ہی موسیٰ بولنے لگا...... ایک پنتھ دو کاج قسم کی گفتگو......

"وہ سر جی...... آپ لوگوں تک میری بات کیوں نہیں پہنچاتے......"

"کونسی بات...... اچھا اس بار اخبار پھینکنے والے پر کالم لکھوں گا...... اس کی مشقت پر توجہ دلاؤں گا۔"

"ناں جی...... وہ بات نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے......"

"اندر والی بات سر جی...... کاموں والی بات نہیں کاموں کے نیچے دبی ہوئی...... کاریز کی طرح چلنے والی بات...... دکھوں کے گٹر نالے کی بات...... سر جی اب لوگوں کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ کس کے گٹر نالے میں بانس پھیر کر نالا صاف کر دیں جی۔ آپ ان کو احساس دلائیں سر جی کہ زندگی صرف کام ہی نہیں آرام بھی ہے...... دکھ سکھ کے لیے کان ہی نہیں رہے کسی کے پاس۔"

بڑی دیر تک خورشید صاحب بدلتے زمانے کی رفتار' ترجیحات' مادی زندگی کے تقاضوں پر موسیٰ کو لیکچر اور اپنے آپ کو وضاحتیں پیش کرتے رہے۔

"آپ ایک کالم میری کھڑاووں پر لکھ دیں جی......"

"بابا یہ تم مجھے پہلے بھی کہہ چکے ہو......"

"ہاں جی......"

"کون سمجھے گا کہ کھڑاویں کیا ہوتی ہیں؟"

موسیٰ نے دبانا چھوڑ دیا...... اور اپنی سرنگ کے حوالے ہو گیا۔

"وہ سر جی میں نے وہ پچاس سال پرانی کھڑاویں قبر میں مریم کے ساتھ دفنا دیں...... اور نئی سلیپریں...... ربڑ کی سلیپریں پہن لیں...... بتول مجھے ننگے پاؤں دیکھ کر لائی تھی یہ سلیپر۔"

"اب بھول بھی جا موسیٰ کھڑاویں...... پچاس سالہ پرانی کھڑاویں اپنے طبعی انجام کو پہنچ گئیں...... ہر چیز خاک سے بنی ہے اور بالآخر خاک بن جاتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے خورشید صاحب...... نئی سلیپروں نے مجھے آرام بھی بہت دیا ہے...... لیکن......"

موسیٰ تھوڑی دیر کے لیے ایسا خاموش ہوا گویا مراقبے میں چلا گیا ہو۔

"پھر...... کاہے کا افسوس......"

"وہ...... مریم کے جانے کے بعد مجھے پتہ چلا خورشید صاحب...... میں اسے کبھی خوش نہ کر سکا...... کبھی میں نے اس سے پوچھا ہی نہ تھا کہ وہ کیسے خوش ہو سکتی ہے؟ مرد کفیل جو ہوا...... خورشید صاحب مرد کو تو خوشی لا کر دینی چاہیے کہیں سے۔"

"ایسے مضمون کالموں میں نہیں لکھے جاتے...... آدمی کس کی ضرورت پوری کر سکتا ہے۔ اسے کہیں سے دھنک لا کر نہیں دے سکتا...... خوشی آدمی کے بس کی بات نہیں......"

موسیٰ سراسیما ہو کر پھر دبانے میں مشغول ہو گیا...... خورشید صاحب نے اپنا سارا علم صرف کر کے مرد کی کفالت پر ایک لمبا لیکچر دے دیا......

"وہ جی بتول بھی چپ چپ رہتی ہے مریم کی طرح...... وہ میں کہیں سے بچہ لا کر تو نہیں دے سکتا تھا ناں مریم کو...... اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں...... لیکن میں اسے پوچھ تو سکتا تھا' تسلی تو دے سکتا تھا؟"

"کن وہموں میں رہتے ہو موسیٰ......"

موسیٰ تھوڑی دیر کان کھجاتا رہا پھر گویا اپنے آپ سے بولا...... "وہ خورشید

صاحب میری گلی میں ایک ماڑا سا دمے کا مارا درزی رہتا ہے جی بیس سال سے اس نے صرف مشین کی آواز سنی ہے اور صرف سوئی کی آنکھ دیکھی...... ہے اب جی اسے عینک بھی لگ گئی ہے وہ وقت بے وقت کہتا رہتا ہے...... مجھے وہ پکڑ کر لے جائیں گے مجھے پتہ ہے...... وہ مجھے چھوڑیں گے نہیں......"

"درزی صاحب سے کہو کھلی ہوا میں سیر کیا کریں...... دونوں وقت' دوستوں سے ملا کریں...... رشتہ داروں سے باتیں کیا کریں......"

"کون سے دوست جی کون سے رشتہ دار صاحب جی...... اس کی تو ایک ہی دوست ہے مشین۔"

"سنو...... میرے لیے ایک کپ چائے بغیر چینی بنا کر لاؤ...... اور دیکھو...... مزے کیا کرو' زیادہ مت سوچا کرو......"

"بس جی مجھے بھی لگتا ہے...... وہ مجھے پکڑ کر لے جائیں گے......"

"کون؟......"

"وہ جی مریم کو لے جانے والے......"

"یہ تمہارا وہم ہے...... مریم کو پکڑنے والے اپنے وقت پر آئیں گے ابھی نہیں...... تمہاری کاٹھی ابھی مضبوط ہے ساٹھے پاٹھے کو کون لینے آتا ہے......"

"اچھا سر جی آپ اپنے کالم کے ذریعے رائے عامہ معلوم کر دیں...... آپ کا کالم گھر گھر جاتا ہے ساری عمر کسی نے مجھے رائے دی نہ مجھ سے رائے لی...... اگر آپ کے کالم میں سوال اٹھے گا تو کوئی نہ کوئی کہیں نہ کہیں سے خط لکھے گا...... میری تسلی ہو جائے گی سر جی...... جمہوریت کا زمانہ ہے۔"

"بھائی سوال کیا ہے بکھیڑا کیا ہے ان کھڑاووں کا......"

موسیٰ اب پوری دلجمعی کے ساتھ قالین پر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں بازو کھڑے زانوؤں کے گرد حمائل کر کے دونوں ہاتھوں کی کنگھیاں آپس میں پیوست کر دیں......

"وہ بات یہ ہے سر جی...... مریم نے پورا چالیس ہزار جمع کر کے چھوڑا ہے...... ساری عمر نہ اس نے اچھا کھایا نہ پہنا نہ گھر کی چیز وستو بنائی بس...... روپیہ جوڑتی رہی حج کے لیے......"

"اسے اتنا شوق تھا حج کا......؟"

چند لمحے کے لیے موسیٰ چپ ہو گیا......

"کبھی اس نے مجھ سے بات تو نہیں کی تھی...... پر میرا خیال ہے کہ وہ حج کا بھی کچھ ایسا شوق نہیں رکھتی تھی" سلیپر پیروں سے اتار کر موسیٰ نے پرے رکھ دیئے۔

"پھر؟ پوچھا نہیں کبھی تم نے اس سے؟"

"اس کے اندر کی سرنگ بہت گہری تھی سر جی...... کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ وہ مدینے جا کر بچے کے لیے کوک فریاد کرے گی......"

"بھول جاؤ مریم کو...... بھول جاؤ پچھلی زندگی کو...... جس نے تمہیں صرف کھڑاویں عطا کیں...... نئی زندگی شروع کرو موسیٰ......"

"ہاں جی وہی میں کرنا چاہتا ہوں سر جی لیکن ایک سوال ہے...... آپ مجھے خود جواب نہ دیں اپنے کالم میں لوگوں سے رائے لے لیں...... جمہوریت کا زمانہ ہے ووٹ لینے میں کوئی ہرج نہیں...... رائے معلوم کرنے سے فیصلہ آسان ہو جاتا ہے خورشید صاحب......"

"رائے کس امر میں؟ کیسی رائے جھگڑا کیا ہے......"

"وہ جی بڑی محنت سے مریم نے چالیس ہزار جمع کیے تھے اس سے...... میں بتول کو حج کرا دوں کہ اسے چوڑیاں بنوا دوں...... اس کے ہاتھ بڑے سونے سونے لگتے ہیں۔"

"یہ تو آسان سی بات ہے...... تم سیدھے سبھاؤ بتول سے پوچھ لو...... مسئلے کا حل اس کے پاس ہے' اس کی خوشی کرو۔"

"ناں سر جی...... بتول اپنی رائے دینے والی نہیں ہے...... وہ ایسی عوام ہے جو ووٹ دے کر بھی رائے نہیں رکھتے...... آپ کالم میں لکھ کر پوچھ لیں جی...... چوڑیاں کہ حج؟ آپ کی لوگ بڑی عزت کرتے ہیں ضرور کوئی نہ کوئی جواب دے گا سر جی......"

"یا پھر کھڑاویں اور سلیپر؟......" خورشید صاحب نے دل میں سرخی لگائی لیکن موسیٰ پھیکی چائے بنانے جا چکا تھا اور اس کے سلیپر قالین پر سوال پوچھنے کے انداز میں پڑے تھے......

آخر میں ہی کیوں؟

قاسم فردوس دیوار پر آویزاں دارا شکوہ کے قطعے پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ نہ جانے وہ سوچ کی کن کن منزلوں میں تھا۔ قاسم نے کوئی ہزارویں مرتبہ پڑھا

یک ذرہ ندیدیم زخورشید جدا
ہر قطرہ آب ھست عین دریا
حق راچہ نام کس بتواند خواندن؟
ہر نام کہ ھست است از اسمائے خدا......

کچھ سال پہلے وہ لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں دارا شکوہ کی جمع کردہ تصویروں کے البم سے متعارف ہوا تھا۔ تب اس کے دل میں دارا شکوہ کے لیے عجیب قسم کے جذبات نے جنم لیا۔ ہمیشہ سے وہ مغلیہ بادشاہوں کے متعلق دورخے رویے کا شکار رہا۔ جب کبھی وہ ان کے متعلق سوچتا اس کے دل میں محبت اور نفرت کا دوہرا چکر چلنے لگتا...... ہر بادشاہ ہی قابل ستائش اور ساتھ ہی نفرت کا حقدار تھا۔ دارا شکوہ کی شخصیت پر اگر صوفی کا اطلاق ہوتا تھا تو ساتھ ساتھ بادشاہت کے لیے نبرد آزما ہونے کا چارج بھی تھا بھلا کسی صوفی کا بادشاہ سے کیا سروکار؟ کوئی صوفی ملکیت کا دعویٰ دار کب ہوا تھا؟...... قاسم فردوس کو شیکسپیئر کے کرداروں کی طرح دارا شکوہ ایسے نظر آتا جن کی اپنی ذات کی خنجر نے انہیں قتل کر دیا۔ دارا شکوہ کی خوبیاں ایک ایسے بھاری پتھر کی طرح تھیں جس کے بوجھ تلے کیڑے پلتے تھے۔ خوبیوں کا پتھر سرکتا تو بادشاہت کی طمع کے لال بیگ پتھر سے فرار ہو کر باہر پھرنے لگتے...... کیا واقعی منصور حلاج کی سوچ

دارا شکوہ میں حلول کر گئی تھی؟ کیا وہ مرتد تھا؟ بادشاہت کی طمع غم و غصہ کی آگ میں بدل گئی تھی اور اس کے سفر کا رخ موڑ دیا تھا؟ وہ مغل بادشاہوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ ان بادشاہوں کے اندر کا رخ کدھر تھا؟ حسن پرست آرٹسٹ نے سیاست میں کجی پیدا کی یا پھر کاروبار سلطنت نے ان فن کاروں پر عرصہ حیات تنگ کیا؟

کیا آبائی وطن سے دوری نے مغل شہزادوں کو ایسا منقسم کیا کہ وہ کبھی بھی یک جائی اختیار نہ کر سکے؟...... بکھرے ہوئے شہزادوں میں دارا شکوہ سب سے زیادہ ذات کی خنجر سے خودکشی کرنے والا تھا۔ اسے اورنگ زیب سے کم اور اپنے وجود سے زیادہ تکلیف پہنچی...... وہ ایک ذات میں کئی روپ اکٹھا کر کے الگ الگ سب کی پرورش کرتا رہا۔

قاسم فردوس نے پرگنہ باڑی میں بسنے والے اس صوفی کے متعلق لمحہ بھر کو سوچا جس سے دارا شکوہ کو والہانہ محبت تھی اپنا نام یہ کہہ کر نہ بتاتا تھا کہ ہر نام خدا کے ناموں میں سے ہے تو پھر اپنے نام سے کیا شناخت پیدا ہو گی؟ جب پانی کا ہر قطرہ سمندر ہے تو پھر کسی کا نام کیا معنی رکھتا ہے؟ چند لمحے دیوار پر لٹکے قطعے کو دیکھنے کے بعد قاسم فردوس دیوار کا قرب کو چھوڑ کر کمپیوٹر کے آگے جا بیٹھا۔ کیا دارا شکوہ واقعی مرتد تھا۔ یا پھر خاص لوگوں کی بات عام لوگوں کے روبرو کرنے سے یہ نتائج مرتب ہوئے؟

اصل میں دارا شکوہ کون تھا؟

بھاری پتھر یا پتھر کے نیچے دبا ہوا جان بچانے والا کیڑا؟ یا پھر دونوں مصلوب بھی اور معتوب بھی۔

قاسم فردوس کمپیوٹر کے سامنے اپنی بیٹی کو ای میل دینے کی غرض سے بیٹھا تھا۔ لیکن فی الحال وہ خالی الذہن ہونے کی کوشش میں تھا۔ ایسی باتیں سوچتے ہوئے اسے گھنٹے گزر جاتے اور کبھی کبھی وہ ایک ہی کرسی یا صوفے میں دھنسا سارا دن گزار لیتا۔ اسے اپنا آپ بھلانے میں کافی دیر لگ جاتی۔ وہ بلاوجہ ماضی کی یادداشتوں میں الجھ کر پرانے زخم ادھیڑنے' سہلانے اور کریدنے میں وقت گزارا کرتا۔ کئی یادداشتیں اس کے پاس پرانے خطوں کی طرح محفوظ تھیں۔ اپنے اور پرائے لوگوں کے عطا کردہ دکھ' الزام' بے عزتی اور بدنامی سے معانقہ کرنے پر وہ مجبور تھا۔ دبے پاؤں یہ یادیں اس پر حملہ آور ہوتیں اور وہ ان سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکتا۔ رفتہ رفتہ قاسم کی یہ عادت ثانیہ

بن گئی تھی۔ ادھر وہ فراغت پاتا ادھر دل و دماغ یادداشتوں کا ضمیمہ لے کر حاضر ہو جاتے۔ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے اور دل میں ملال کی کیفیت ابھر آتی۔ وہ اپنی نشست پر کھسکتا کھسکتا نڈھال نیم دراز ہو جاتا اور کھلی آنکھوں کسی پرانے وقت 'گم شدہ شخص بیتے موسم کا زنجیر پا ہو کر مرنے کی آرزو کرتا۔ ایک ہی خیال اس کے دل میں چکر لگانے لگتا۔ آخر میں ہی کیوں؟ اللہ نے مجھ مظلوم پر کیوں اتنے عتاب نازل کیے۔ میں ہی کیوں ہمیشہ ہدف بنا؟ ایسے میں اس کے دل سے ان گنت کلمہ کفر نکلتے۔ وہ اس ایشو رنندا سے نڈھال ہو کر یہاں تک سوچتا کہ خدا کبھی انسان تو رہا نہیں۔ وہ کب سوچ سکتا ہے کہ بندے پر ایک چھوٹی سی زندگی میں کیا کچھ گزر جاتی ہے۔ پراگندہ خیال قاسم فردوس یہ نہ سوچ سکتا تھا کہ قطرہ سمندر سے جدا تو ہے نہیں؟ پھر کہیں انسانوں کے دکھ اس کے دکھ تو نہیں؟...... کیا انسان کے دکھ معکوس راستے سے ربّ کے حضور تو اکٹھے نہیں ہو رہے؟ شیطان کو مدت معین عطا کرنے کی وجہ سے اللہ بھی درمیان میں پڑنے سے معذور تھا؟ رشدی صاحب نے ایک مرتبہ اسے کہا تھا۔ بھائی تم تشکیک کے شکار ہو لیکن تشکیک ایمان کا حصہ ہے۔ جو کوئی خدا کو مانے گا وہی کبھی کبھی شک میں مبتلا ہو گا ناں؟ اصلی گناہ تو دہریہ ہونا ہے سو وہ تم ہو نہیں۔ اللہ کا شکر ہے۔ پھر فکر کیسی ہر راستے سے واپس بھی تو لوٹا جا سکتا ہے؟

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

"آ جاؤ......"

بڑا ہی مودب خانساماں وزیر سامنے کھڑا تھا۔

"سر آپ سے کوئی صاحب ملنے آئے ہیں۔"

"کون؟"

"نام نہیں بتایا سر۔ پہلے کارڈ دے رہے تھے پر اسے بھی جیب میں واپس ٹٹول دیا۔"

قاسم فردوس کو جھڑکنا نہ آتا تھا۔ کئی بار چھوٹی غلطی پر زیادہ پھٹکار اور کئی مرتبہ بڑے قصور پر مکمل معافی مل جاتی تھی۔ قصور بھر سرزنش کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

"یار تمہیں کئی بار کہا ہے کہ اتوار کی اکلوتی چھٹی ہوتی ہے۔ سارا ہفتہ بینک

میں کٹ جاتا ہے۔ تم مجھے فراغت سے بیٹھ لینے دیا کرو۔ لیکن تمہاری اوندھی کھوپڑی میں یہ بات ہی نہیں آتی۔"

مودب وزیر اور بھی باادب ہو گیا۔ "جی صاحب۔"

"مجھے امریکہ ای میل بھیجنا تھی وزیر۔ یہ صاحب چندہ مانگیں گے اور کیا؟"

خانساماں نے ہمت پا کر کہا۔ "نہیں سر وہ کہتے ہیں کہ انہیں آپ سے کوئی کام نہیں بلکہ وہ آپ کے کسی کام آنا چاہتے ہیں۔"

قاسم فردوس اٹھ کھڑا ہوا۔ "میرے کون سے کام آئیں گے؟ میرے کام لوگوں کے بس کے نہیں ہیں۔ پھر بھی تھوڑا سا تجسس اس کے دل میں ابھرا۔"

"میں نے پوچھا تھا سر کہ آپ کو کیا کام ہے تو وہ کہنے لگے "ہم کام کرنے والے ہیں کروانے والے نہیں تم بلا تکلف ملاؤ......"

"اچھا بٹھاؤ۔"

"بٹھا دیا ہے سر جی۔ بڑے خوبصورت ہیں۔ پاؤں تو اتنے گورے ہیں کیا کسی کشمیرن کا منہ ہو گا۔ فرشتے سے لگتے ہیں۔"

"اچھا اچھا...... چلو میں آتا ہوں۔"

"کہنے لگے میں پتہ کر کے آیا ہوں وہ گھر پر ہیں اگر نہ بھی ملنا چاہیں تو بھی ملا دینا ان کے فائدے کی بات ہے۔" وزیر نے بات بڑھائی۔

"چلو میں آتا ہوں۔"

قاسم فردوس اتوار کے دن بڑا ڈھیلا ڈھالا رہنے کا شوقین تھا۔ برمودا نیکر' امریکی سویٹ شرٹ اور ہوائی چپلوں میں وقت گزارنا اس کی عیاشی تھا۔ ٹائی' بلٹ' بوٹ سے رہائی پا کر اسے عجیب قسم کی مسرت ملتی۔ ملاقاتی اس لیے پسند نہ تھے کہ اتوار کے دن وہ کسی قسم کا نارمل لباس پہننا ہی پسند نہ کرتا تھا۔ جلدی جلدی شلوار قمیص پہن کر اس نے حلیہ تبدیل کیا۔ اسے نئے مہمان سے ملنے کا تھوڑا سا اشتیاق پیدا ہو ہی گیا تھا۔

سورج راس الجدی میں پہنچ چکا تھا۔ پنکھے چل رہے تھے لیکن کچھ دیر ہوا میں بیٹھنے کے بعد پنکھا بند کرنے کو جی چاہتا۔ باہر کی ہوا ٹھنڈی تھی۔ لیکن کمروں میں گرمی کا احساس ہوتا۔ جینز پر کلیوں والا کرتا پہنے رائی صفت درمیانی عمر کا ایک آدمی صوفے پر

بیٹھا تھا۔ اس کا رنگ سفید' بال سیاہ' چہرہ روسی' ہاتھ ایرانی اور نشست کا انداز امریکن تھا۔ پاؤں واقعی کسی کشمیرن کے چہرے سے بھی گورے تھے۔

قاسم فردوس نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا "قاسم فردوس......" "جی......جی......السلام علیکم......"

"بیٹھیے......" قاسم نووارد سے اس کا نام نہ پوچھ سکا۔

"چائے پئیں گے کہ ٹھنڈا؟"

"جی کچھ نہیں۔ میں صرف آپ سے ملنے آیا ہوں۔ دراصل میں مشروبات نہیں پیتا......نہ ٹھنڈا نہ گرم۔"

"سگریٹ؟"

"جی نہیں شکریہ......عادت نہیں پڑی۔"

قاسم نے ازراہِ میزبانی پہلے تو بدلتے موسم کے متعلق بات چیت شروع کی۔ کچھ دیر کے بعد قاسم چپ ہو گیا' اسے لگا مہمان سن ہی نہیں رہا۔ پھر سیاست کی جانب رجوع کیا۔ یہ گفتگو بھی بے سود ثابت ہوئی کہ نووارد نہ محظوظ ہوا نہ دل برداشتہ ہو کر کسی جوش کا اظہار کیا بس مسکراتا رہا۔ کچھ دیر وہ پاکستان کے مختلف علاقوں کی زبانوں اور کلچروں کے متعلق اپنی علمیت بگھارتا رہا لیکن دوسری جانب سے گرمجوشی سے شمولیت نہ ہوئی۔ پھر گفتگو میں تھوڑے تھوڑے خاموشی کے وقفے آنے لگے۔

"آپ...... کہاں رہتے ہیں؟"

"رہنا کہاں ہے کبھی افغانستان' کبھی سوڈان' لیبیا...... عراق کبھی صومالیہ۔"

"اچھا اچھا۔"

قاسم نے دل میں اندازہ لگایا کہ شاید یہ شخص دہشت گرد ہے اور کسی طرح اس سے کوئی بڑا فائدہ۔ ناقابل حصول مراعات مانگنے آیا ہے......یا پھر اسلحہ کو غیر قانونی طور پر کہیں پہنچانے کی ڈیمانڈ ہو؟

"کیا آپ جرنلسٹ ہیں؟ جگہ جگہ گھوم پھر کر انفارمیشن جمع کرتے ہیں؟" ٹھہر ٹھہر کر قاسم نے سوال کیا۔ کھلے بندوں وہ مہمان کو دہشت گرد بھی تو نہیں کہہ سکتا تھا؟

"کچھ کچھ...... کسی حد تک۔"

"کس اخبار سے منسلک ہیں؟ کسی نیوز ایجنسی سے۔"

"کسی اخبار سے بھی نہیں......" مہمان زیر لب مسکرایا۔

قاسم فردوس نے دل میں سوچا کہ اس شخص کا تعلق کسی اخبار سے نہیں بلکہ شاید یہ اسامہ بن لادن کا ایجنٹ ہے' یوسف رمزی سے کوئی گہرا تعلق ہے۔ اس کے پاس کچھ ایسے راز ہیں جو وہ قاسم کے توسط سے کہیں پہنچانا چاہتا ہے اور اسی لیے وہ اپنی شناخت ظاہر کرنے میں متامل ہے۔

قاسم فردوس نے فیصلہ کیا کہ جب تک وہ خود اپنا نام پتہ ظاہر نہ کرے گا وہ بھی آ بیل مجھے مار جیسے اصرار کے ساتھ تفتیش میں نہ پڑے گا۔ مہمان کچھ ایسی حکمت عملی تدبر اور ڈھنگ سے بیٹھا تھا کہ قاسم کو شبہ گزرا وہ کسی سفارت خانے کا مندوب ہے اور کسی اہم معاملے میں سراغ پانے کے لیے آیا بیٹھا ہے۔ قاسم بوبک کہن سال کی طرح ٹٹول ٹٹول کر باتیں کرنے لگا۔ دیر تک وہ عراق' لیبیا' فلسطین' ملائیشیا اور دوسرے مسلمان ممالک کے متعلق تھوڑی سی شدبد کی مدد سے باتیں کرتا رہا۔ ایسے مسلم ممالک جو آزاد تھے لیکن پالیسی کے اعتبار سے مجبور بھی تھے اور نقال بھی تھوڑی دیر کے بعد جب مہمان کی چپ اہانت آمیز ہو گئی تو قاسم فردوس نے اہل تدبیر کی طرح کافی دیر تک بات ایسی مسلم تحریکوں کے متعلق کی جو سر پر کفن باندھ جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے پھر اچانک سوال بن کر مہمان کی خاموشی کو توڑا۔

"آپ کا کیا خیال ہے یہ...... شہید لوگ کیا ہوتے ہیں؟"

مہمان گویا پینک سے جاگا۔

"میں زیادہ تو نہیں جانتا اور نہ ہی قطعیت سے بات کر سکتا ہوں لیکن یہ لوگ تبدیلی کے کارپرداز ہوا کرتے ہیں۔ ایسی تبدیلی جو اپنی ذات کے لیے نہیں ہوتی اللہ کی رضا کے لیے لائی جاتی ہے...... عام لوگوں کی ڈکشنری میں یہ اوندھی کھوپڑی کے لوگ ہیں۔ لیکن اصل میں انہیں اپنے لیے کچھ درکار نہیں ہوتا...... بس یہ تبدیلی کے مہرے ہیں۔ ان کے حالات مخدوش ہوں اور ان کا عمل بیم ناک ہو۔ لیکن ان کا ایمان کبھی ڈانواڈول نہیں ہوتا...... اپنے لیے خفتہ اور اللہ کے لیے بیدار رہتے ہیں......"

قاسم فردوس کو یقین ہو گیا کہ مہمان کا تعلق ضرور طالبان سے ہو گا یا پھر وہ فلسطین' کشمیر' بوسنیا' الجزائر یا کسی بنیاد پرست مسلم تحریک کا پنچھی ہو گا......

"آپ...... کسی اسلامی تحریک کے رکن ہیں؟" قاسم نے سوال کیا۔

"حکم نہیں......"

اتنے مختصر سے جواب نے قاسم فردوس کو گڑبڑا دیا۔ کس کا حکم؟ کون سا حکم؟ حکم دینے والا کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ خانہ زاد کی سی آواز نکال کر قاسم نے پوچھا۔ "کس کا حکم......"

"میرا اپنا اور کس کا؟"

"جی......جی...... بالکل اپنے سے زیادہ کس کا حکم پابند کر سکتا ہے۔" خوشامدی لہجے میں قاسم بولا۔

لمبی ہوسی چپ سارے میں پھیل گئی۔ اس دوران قاسم نے اپنے اندر ٹٹولا۔ اب مہمان سے کیا بات کی جائے؟ وہ دونوں ماتم داروں کی طرح سر جھکائے بیٹھے رہے۔ مہمان کا رعب حسن اس درجہ خائف کرنے والا تھا کہ قاسم اب بات کرتے بھی ڈرتا تھا کہ کہیں مہمان کو ناگوار ہی نہ گزرے۔

قاسم شہر کا بہت بلند اقبال بینکر تھا۔ شہر کے امیر ترین 'بیدار بخت' دو بھاشیے اس کے سامنے بکری بن کر بیٹھے رہتے۔ گورنمنٹ کی فنانس پالیسیاں اس کی اعانت کے بغیر بن نہ سکتی تھیں' وہ حکومت کے معاشی منصوبوں کو سبوتاژ کرنے کی پچویشن میں تھا لیکن اس سراپا پندار کے آگے اس کے الفاظ کم پڑ رہے تھے۔ وہ اپنی ناقدری اور کم علمی پر افسردہ سا تھا۔ کیا یہ اپنی بلیک منی میرے بینک کے حوالے کرنا چاہتا ہے اور اپنے پیسے کو لانڈر کرنے کی غرض سے وارد ہوا ہے؟

کیا اسے کثیر رقم کی ضرورت ہے؟ اور بغیر قابل اعتماد سفارش اور سکیورٹی کے خود اپنا منیب بن کر آیا ہے؟

کہیں غیر قانونی اسلحہ درآمد کرنے کا تو مسئلہ نہیں؟ کسی شکتی مان پارٹی نے اسے بلیک میل کرنے کے لیے بھیجا ہو؟

ہو سکتا ہے کہ سرے سے صاحب مال نہ ہو فقط قرض حسنہ مانگنے آیا ہو؟

نیچی نظریں کیے قاسم نووارد کی ٹوہ لینے پر تلا ہوا تھا۔ بڑی سے بڑی میٹنگ میں جہاں صاحب تخت موجود ہوتے قاسم کبھی نروس نہ ہوا۔ اس کی پالیسی تھی کہ تمام ممبروں کی گیس آؤٹ کرنے کے بعد بات کرتا اور ذی جاہ لوگوں کو آخر میں

Lasod ڈال کر ہنکا لے جاتا۔ آخری رائے ہمیشہ اسی کی ہوتی اور معتبر ٹھہرتی لیکن آج وہ اپنے سے بھی بڑے صاحب فن کے سامنے رنکھا سا بیٹھا تھا۔

بڑی دیر کے بعد خوش طالع نے زبان کھولی "آپ فرینکفرٹ سے نیویارک جاتے ہوئے ایک شخص سے ملے تھے؟"

نہ جانے وہ کتنی بار یہ سفر کر چکا تھا؟ کسی مخصوص شخص اور سفر کا ذکر ہو رہا تھا

"شاید آپ کو بھول گیا ہو لیکن رشدی صاحب نے مجھے بہ اصرار کہا تھا کہ میں آپ سے ضرور ملوں' وہ آپ کے لیے بہت ہی متوفش تھے......"

"مجھے کچھ یاد نہیں...... کون سے رشدی صاحب؟"

"لمبا سا قد ہے' فراخ ماتھے پر نمازیوں کی محراب ہے۔ بڑی دھیمی آواز میں بات کرتے ہیں اور مسکراتے رہتے ہیں ہمہ وقت۔"

قاسم کے ذہن میں کوئی رشدی نہ ابھرا۔ نہ فراخ ماتھا نہ محراب۔

"آپ دونوں فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ وہ کھڑکی کی جانب تھے اور آپ گلی کی طرف۔"

یہ کون سی پہچان تھی بھلا؟ وہ تو ایک عرصہ سے فرسٹ کلاس میں سفر کر رہا تھا۔

"شاید آپ کو یاد ہو وہ رامش ٹیکسٹائل کے مالک ہیں۔"

فوراً قاسم کو رشدی یاد آ گیا۔ اس کی طرح وہ بھی پچاس سے اوپر تھا۔ چھوٹی چھوٹی کھچڑی پکی داڑھی۔ کندھے خمیدہ' تھوڑی سی نکلی ہوئی توند' ہاتھوں میں نرت کی سی کیفیت اور چہرے پر عورتوں کی سی ملائمت۔

لمبے سفر کے دوران رشدی نے اپنے رویے سے قاسم کو مکمل طور پر گود لے لیا۔ وہ دونوں سالوں کا سفر گھنٹوں میں طے کر گئے۔ کھانا کھاتے ہوئے' کافی پینے کے دوران وہ مسلسل باتیں کرتے رہے۔ رشدی نے تو اپنی رام کہانی مختصر سی سنائی کہ وہ کیسے فیکٹری کا مالک بن گیا۔ قدم قدم پر وہ اپنی جدوجہد کو اللہ کے فضل' اس کی رحمت اور کرم سے منسوب کرتا رہا' مشکلات کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اور خوش قسمتی کا کریڈٹ اللہ میاں کو دیتا رہا۔

قاسم نے سفر کے دوران رشدی کے سامنے اپنے اندر کے پھپھولے

پھوڑے تھے۔" رشدی ابھی میں تین برس کا تھا کہ والد فوت ہو گئے...... ماں زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی پھر بھی ہمت والی تھی۔ اس نے سکول میں بچوں کو پڑھا کر ہمیں تعلیم دلوائی۔ جس روز میں آٹھویں میں وظیفہ لے کر گھر آیا بھائی کی لاش سامنے دھری تھی...... جس روز کالج میں داخلہ ملا ساتھ ہی بہن اغوا ہو گئی۔ کئی برس اسے ڈھونڈنے میں لگے۔ جب وہ گھر آئی تو گونگی تھی۔ پھر کبھی کسی سے بات نہ کی۔ ماں اور میں غریبی سے چور' حالات کے آگے بے بس بڑھتے چلے گئے۔ دوسرے بھائی پر چوری کا مقدمہ چلا۔ پانچ سال جیل میں گزارے اس دوران میں نے تعلیم مکمل کی۔ بینک میں ملازم ہو گیا۔ شادی کی...... کئی اوگھٹ گھاٹیوں سے نکلا۔ میری ماں کینسر سے روتی چلاتی مری۔ گونگی بہن کو طلاق ہو گئی...... اور جب میں سارے غم کے دریا پار کر کے دوسرے کنارے پہنچا تو اکلوتی بیٹی نے تبدیل مذہب کر لیا اور ایک امریکن سے شادی کر لی۔ بیوی نے سلیپنگ پلز کھا لیں...... اب کبھی کبھی زاہدہ بیٹی سے ملنے امریکہ جاتا ہوں تو بیوی یاد آتی ہے ورنہ میں نے اپنی کوٹھی میں جھاڑو پھیر کر تعلقات کو کوڑے کرکٹ کی طرح باہر نکال پھینکا ہے۔"

"آپ کو رشدی صاحب یاد آ گئے؟"

"جی بالکل اچھی طرح سے...... عجب آدمی تھے۔ ان کی زندگی بھی کچھ آسان نہ گزری تھی لیکن نہ وہ شاکی تھے نہ گلہ گزار۔ مجھے بھی بڑی نصیحتیں کرتے رہے لیکن مجھ پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ آخر اتنی مشقت ایسی صبر آزما مصیبتیں صرف میرے لیے ہی کیوں؟ میں ہی اللہ کا ہدف کیوں ہوں۔ اللہ میاں اس قدر بے انصاف کیوں ہے؟...... کیا وہ دیکھ نہیں سکتا کہ کافی ہو چکی؟ آپ مجھے اس طرح نہ دیکھیں میں اس زندگی میں جہنم پر رضامند نہیں ہو سکتا۔ رشدی صاحب کی آرزو تھی کہ میں اللہ میاں کے خلاف منہ سے کچھ نہ کہوں لیکن میں ان کی بات نہیں مان سکتا۔

ہانڈی کے نیچے آگ جلائیں گے تو گیس نکلے گی...... میں سچا آدمی ہوں۔ جو کچھ میرے دل میں ہے میں اس کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اللہ کچھ لوگوں پر انتہا کا نامہربان ہے اور کچھ کو ایسے ہی بلاوجہ نواز دیتا ہے' یہ بے انصافی ہے سراسر...... کچھ ساری عمر قلاش بے بضاعت تہی دست رہتے ہیں۔ اور کچھ کے پیچھے دولت آندھی بن کر لگ جاتی ہے۔ کچھ اولاد کو ترستے مر جاتے ہیں اور کچھ بچوں کا ریوڑ ہانکتے پھرتے ہیں۔

یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کچھ لوگوں کو وہ ساری عمر کیوں پیٹتا ہے ہمیں انصاف کا حکم دے کر خود بے انصافی کیوں؟ سمجھ نہیں آتی کہ اس کے پیچھے کیا منطق ہے؟"

مہمان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ شعاعوں کی طرح پھیل گئی۔

"کیا کبھی آپ کو اللہ میاں پر ترس نہیں آیا؟ اپنی تخلیق کو آزمائش سے گزارنا کچھ آسان ہے؟"

قاسم فردوس اچنبھے میں پڑ گیا۔

"کیا آپ کو کبھی خیال آیا کہ ابھی وہ بھی ایک معین مدت تک ایک چیلنج کے حوالے سے اپنی مرضی سے کُن کہہ کر آدم کے لیے جنت نہیں بنا سکتا...... جنت سے نکالتے وقت ابلیس کے ساتھ یہی طے ہوا تھا۔ ہے نا...... ایک معین مدت تک......"

"میں آپ کی بات سمجھا نہیں......"

مہمان نے مسکرا کر سارے کمرے کو اجال دیا۔

"بات بڑی معمولی ہے آپ رشدی صاحب سے ہی سمجھ لیتے تو بہتر تھا۔"

"کون سی بات......"

"آپ اللہ کو بے انصاف سمجھ رہے ہیں۔ کچھ لوگوں پر مہربان...... کچھ پر نامہربان ہونے کا الزام لگا رہے ہیں۔ اگر آپ مجھے تھوڑی سی اجازت دیں تو میں رشدی صاحب کے حالات آپ پر ظاہر کروں۔"

قاسم فردوس نے بادل نخواستہ اثبات میں سر ہلا دیا۔

"رشدی صاحب کا ایک اور بھائی بھی تھا۔ توام بھائی تھے...... دونوں جب جوان ہوئے تو والد کی طرف سے بڑی جائیداد ملی۔ کوٹھیاں' دکانیں' مربعے...... بینک بیلنس...... ماں زندہ تھی دونوں کو بے حد انصاف کے ساتھ گویا پائی پائی کا حساب کر کے باپ کا ترکہ دے دیا...... اب ان دونوں کی علیحدہ زندگیاں شروع ہوئیں۔ بھائی راحت نے اپنی دولت سے دوست' محبوبائیں' رشتہ دار راضی کیے۔ راگ رنگ' دلکشی خوشی تکبر کا سودا کیا...... رشدی نے جائیداد کو بڑھایا۔ لوگوں کی مدد کی...... لاوارث خوشیوں سے اجتناب کیا' ذمہ داری کی زندگی بسر کی۔ رشدی کی زندگی میں قہقہے کم آئے آنسو کی روانی زیادہ رہی...... جڑواں بھائی راحت پر بھی خدا مہربان رہا کہ ساری عمر عیش میں گزری۔ رشدی پر بھی نامہربان نہ ہوا...... کہ عمر بھر اللہ یاد رہا...... جب کبھی اللہ بھولنے

لگتا کوئی مصیبت نازل ہو کر اوپر والے کی یاد دلا دیتی۔ ادھر آسائشوں کا نرغہ گھیرے میں لیتا ادھر رشدی پر کوئی آفت آ جاتی...... پلٹ کے پرانے دوست کا ہاتھ پکڑ لیتا...... حتیٰ کہ دولت ثروت' مدح وذم حب جاہ سب طاقتیں بے اثر ہو گئیں۔ اللہ کے ساتھ وابستہ رہنے کی وجہ سے اسباب کی ضرورت نہ رہی۔ دھن دولت' رشتے ناطے' سنگی ساتھی سب فانی اسباب بے اثر...... دنیا ساتھ تو رہی...... لیکن ہمدم نہ بنی۔"

"لیکن اللہ حساب سے تکلیف دے ناں سب کو بانٹ کر...... برابر برابر۔"

'مشکل یہ ہے قاسم فردوس جی...... سونیو...... پیاریو...... اللہ تو کسی کو بھی تکلیف دے کر راضی نہ کبھی ہوا تھا نہ ہو گا......اس نے تو بابا آدم کو جنت دی تھی جس کی کسی شاخ پر کانٹا نہ تھا۔ پر بابا آدمی نے اپنا اختیار آزمایا...... ابلیس نے اس کے کانوں میں جو سحر پھونکا اس نافرمانی کے تحت آج انسان دنیا میں ہے اور جذبات سے مغلوب ہو جانے پر مجبور...... صاحب اختیار ہے اپنے راستے خود چن سکتا ہے۔ اللہ بھی ایک معین وقت تک پابند ہے کہ ابلیس کو مہلت دے اب حق و باطل کی جنگ میں اللہ میاں کھیل کے اصول توڑ کر کیسے انسان کے لیے یہاں پر جنت تعمیر کر دے؟"

"جیسے کچھ لوگوں کے لیے دوزخ ہر لحہ دہکتا ہے کچھ کے لیے کھلی جنت...... وہ تو ایک کن سے...... سب کچھ ٹھیک ٹھاک کر سکتا ہے؟"

"اللہ ایک معین وقت تک مہلت دینے کا اقرار کر چکا ہے۔ انسان کو صاحب اختیار بنا چکا ہے۔ میں بار بار کہہ رہا ہوں...... جنت سے بابا آدم اپنے فیصلے سے نکلے؟"

"یہ سب باتیں ہیں فرضی...... تاویلیں جواز ہیں بے معنی۔"

"اللہ کی ساری مخلوق نے جو وزن اٹھانے سے انکار کیا تھا وہ وزن کیا تھا قاسم جی؟...... وہ وزن تھا جذبات کی مغلوبیت...... انسان پر کوئی مصیبت آ ہی نہیں سکتی اگر وہ جذبات کے ہاتھوں اس درجہ دباؤ میں چلا نہ جائے اگر جذبات پر قابو ہو تو کیا غریبی کیا امیری' کیا دوست؟ کیا دشمن؟ کون سا رشتہ ناطہ کارگر ہو سکتا ہے؟...... سنو قاسم کپل وستو کے راجہ شدودھن کے گھر مہاتما بدھ پیدا ہوا...... راجہ نے تمام دنیا کی آسائشیں بدھ کے قدموں میں ارپن کیں۔ لیکن ایک رات مہاتما بدھ سولہ سو رانیاں' یشودھرا اور اپنا بچہ پوری جنت چھوڑ کر جنگلوں میں چلا گیا...... اللہ نے اس سے نہ محل چھڑائے نہ رشتے ناطے۔ اپنی مرضی سے سدھارتھ نے جذبات کا جوا اتار پھینکا اور پرندوں کی

طرح آزاد ہو گیا......"

"یہ ساری باتیں فرینکفرٹ سے شکاگو جاتے ہوئے مجھ سے کی تھیں...... رشدی نے...... اور بے کار تھیں۔ لفظوں سے دل کے زخم نہیں بھرتے۔ ہمیں شطرنج کے مہرے بنایا گیا ہے۔ ہماری چالیں مقرر ہیں۔ ہم بساط زندگی پر مجبور و بیکس چلتے ہیں یہ بے انصافی ہے۔" مہمان نے اپنے پاؤں آگے پھیلا دیئے۔ ہوائی چپل میں اس کے پیر اور بھی سڈول اور خوبصورت دکھائی دیئے۔

وہ پھر مسکرایا۔ سارے میں کرنیں سی جھلملائیں۔

"ہم تو جنت کے باسی تھے...... ہمیں تو اللہ نے سوئی بھر دکھ بھی نہ دینا چاہا تھا۔ پھر اپنی مرضی سے بابا آدم خود صاحب اختیار ہوئے۔ اپنی مرضی سے انہوں نے جنت اور دوزخ کو چننا چاہا...... پسند اور ناپسند کو اپنا وطیرہ بنایا...... اپنی پسند سے وہ بوجھ اٹھایا جس کو چرند پرند' نباتات' جمادات' جن فرشتے اللہ کی ساری کائنات نے اٹھانے سے انکار کیا تھا۔"

"بتائیے بتائیے رکیے اور بتائیے۔ میری مرضی سے ماں کو کینسر ہوا۔ میری بہن میری رضا سے گونگی ہوئی؟...... میری بیوی نے مجھ سے پوچھ کر خودکشی کی۔ بھائی پر چوری کا الزام میری وجہ سے تھا۔ بیٹی کو میں نے مرتد ہونے کا مشورہ دیا۔ بتائیے یہ سب کچھ میرے مشورے سے ہوا؟ ان میں کون سا فیصلہ میرا تھا؟"

مہمان نے لمبا سا سانس لیا اور دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ "دکھ کی بھی بڑی اقسام ہیں۔ آپ میری منطق ماننے کو تیار نہیں۔ میں نے کہا ناں کہ اللہ جس کو اپنا آپ یاد دلانا چاہتا ہے وہ دکھ کا الیکٹرک شاک دے کر اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ آپ پر یہ بات بے اثر ہوئی۔ میں نے یہ بھی کہنا چاہا کہ دکھ کی بھٹی سے نکل کر انسان دوسروں کے لیے نرم پڑ جاتا ہے پھر اس سے نیک اعمال خود بخود اور بخوشی سرزد سے ہونے لگتے ہیں۔

کبھی کبھی غم آدمی کو اس قدر پراگندہ کرتا ہے اتنی کڑواہٹ اس میں پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جرائم کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ معاشرے کے لیے اور خود اپنے لیے عذاب کا باعث ہو جاتا ہے۔ اسے سوائے بدلے کے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ قاسم چڑ کر بولا۔

"بینکر صاحب جس روز پہلے دن انسان نے اللہ کے حکم سے سرکوبی اختیار کی اور خود صاحب رائے ہوا اسی روز وہ اپنی مرضی سے غم آشنا ہوا۔ اس لمحے اس میں دو راستے معین اور مقرر ہوئے اب کیا کیا جائے اختیار تو اس کا ہے وہ دونوں راہوں کو یکجا کر سکتا ہے۔ خوشی کی حالت میں 'خوف خدا سے' راستہ ایک رہتا ہے غم میں خدا کا ناشکرانہ رہ کر ایک ہی راستہ چن سکتا ہے لیکن کچھ خوشی یا غم دونوں حالتوں میں اپنے اندر دو راستے بنائے رکھتے ہیں۔ کبھی یکجا نہیں ہوتے۔"

"رشدی صاحب بھی آپ کی طرح بڑے دلائل پیش کرتے تھے۔ لیکن نہ وہ میرا غم کم کر سکتے ہیں نہ ہی میری ناشکر گزاری ان کے دلائل سے متاثر ہوئی؟" بینکر نے جواب دیا۔

"قاسم صاحب۔ بات اتنی سی ہے کبھی آپ نے ہیرے کی قسمت پر غور کیا؟ نکالا جاتا ہے 'تراشا جاتا ہے' انگوٹھی میں سجنے سے پہلے کئی مختلف تکلیف دہ مراحل سے گزرتا ہے۔ مٹی میں بھی پھاوڑا نہ چلے تو فصل اگ نہیں سکتی۔ مہندی توڑی' پیسی گوندھی نہ جائے تو رنگ نہیں لاتی۔ پھر اعلیٰ قسم کی روحوں کو تربیت نہ ملے...... تو وہ ارفع و اعلیٰ کیسے ہوں؟ بلندی اور سر بلندی کے لیے گیند کو زمین پر پٹکنا پڑتا ہے ناں...... خوشی میں تربیت نہیں ہوتی میرے آقا اس مین جسم عیش کرتا ہے روح کی راحت اور بالیدگی کے لیے تو آنسو بہت ضروری ہیں۔" قاسم غصے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"اگر آپ کو مجھ سے کوئی کام ہو تو آپ بتا سکتے ہیں مجھے کل سفر پر جانا ہے اور ابھی میں نے پیکنگ نہیں کی۔"

وہ بھی یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں بھی رشدی صاحب کے حکم پر آیا تھا مجھے ذاتی طور پر صرف ایک کام تھا۔"

"جی فرمایئے۔"

"میں آپ کی توجہ آپ ہی کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔"

"وہ کیوں؟"

"آپ زندگی کا سب سے سنہری موقع گنوا رہے ہیں۔ اڑنے کی بجائے دلدل کا رخ کر رہے ہیں۔ جس شخص نے برے دنوں کو اپنا امتحان سمجھا وہ ہمیشہ پاس ہوا۔

رشدی صاحب کی طرح لیکن جس نے اسے سزا جانا اللہ کی طرف سے اور اپنے آپ کو معتوب اور بے قصور جانا وہ رہا ہو کر بھی قیدی کی طرح احساس جرم کی زنجیر سے بندھا رہا......"

"میں آپ کی بات نہیں مانتا۔"

"کیسے؟"

"چلئے آپ فی الحال یہ سمجھ نہیں سکتے کہ غم کی کٹھالی آپ کی روح کے لیے کیا کر رہی ہے آپ کی شخصیت 'روح' عاقبت کے لیے یہ کس قدر بامعنی ہے چلئے نہ سہی لیکن ایک بات کا مجھے دکھ ہے اس لیے آپ پر ترس آرہا ہے۔"

"دکھ وہ کس بات کا؟"

"دکھ ہوتا ہے۔ ہو...... آپ کے اندر سمایا رہے...... آپ اس موقع کو نہ گنوائیں اور صابرین اور شاکرین میں سے ہو جائیں۔ گلہ نہ کریں کسی سے...... اپنے غم کو اپنے تک محدود رکھ کر کوئی رد عمل نہ پیدا ہونے دیں تو آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کہاں پہنچ جائیں گے۔ دکھ تو روحانیت کی سیڑھی ہے...... اس پر صابر شاکر ہی چڑھ سکتے ہیں آزما لیجئے۔" قاسم نے غصے سے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ انسان کو کم سمجھتے ہیں۔ کانچ کا برتن گرے تو کرچی کرچی ہو گا...... چوٹ لگے تو درد یقینی ہے...... ناکامی پر غصہ آئے گا...... رشتے ناطے ٹوٹیں گے تو غم ہو گا...... آپ طبعی نیچرل باتوں کو کس احمق پن سے رد کر رہے ہیں سر' اصلی دکھ ہو تو کون چپ رہ سکتا ہے۔

"اصلی دکھ ہی تو گم ہونا سکھاتا ہے...... پانی کو نشیب کی طرف جانے سے روک کر بجلی گھر بنانے کا نسخہ بتا رہا ہوں۔ کشش ثقل کے ساتھ گرنے کی بجائے ہوائی جہاز کی طرح اوپر اٹھنے کی ترکیب بتا رہا ہوں۔ **Gravity** کی بجائے **Devitation** کی بات کر رہا ہوں۔ روح کو جسم کا پابند کرنے کی بجائے آزادی کا نسخہ بیان کر رہا ہوں۔ میں تو فقط اتنی عرض کر رہا ہوں کہ غم ہو...... غصہ آتا رہے...... لیکن اس کا اظہار نہ ہو' برداشت کرنے والوں کی طرح اندر ہی اندر سفر بدل جائے...... پھر مسبب کچھ اور اسباب پیدا کر دے گا پہلے سے بھی بہتر...... جب آپ غم کو بے معنی' لاتعلق ہو کر کرب کو جذب کرنے کا فن سیکھ لیں گے۔ جذبات سے مغلوب ہونے کی

عادت چھوڑدیں گے تو یہی دکھ آپ کی کشتی بن جائے گا...... دور بین کا کام دے گا۔ یہی دکھ، کشتی بھی ہو گا ملاح بھی...... آپ آزما کر تو دیکھیں...... اس بوجھ کو تو ہم نے اپنی مرضی سے اٹھانے کا دعویٰ کیا تھا۔ اس رحیم و کریم نے تو ہمارے دعویٰ کو بھی نعمت کی سنہری زنجیر سے باندھ دیا ہے...... ہر وہ شخص جو دکھ میں اپنے آپ کو جذبات کے ہاتھوں مغلوب نہیں ہونے دیتا اس کے لیے تو دکھوں میں بھی جنت کی پروا چلنے لگتی ہے۔"

قاسم فردوس مہمان سے مصافحہ کر کے اندر کی جانب چل دیا۔ مہمان نے چندے توقف کیا پھر آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر چلا گیا...... قاسم کمرے میں پہنچا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی اس نے فون اٹھایا۔ دوسری جانب سے نسوانی آواز ابھری۔

"ہیلو......"

"ہیلو......"

"کون بول رہا ہے جی......"

"آپ کا نام؟"

دوسری جانب ہلکا سا قہقہہ بلند ہوا پھر آواز آئی "میں ہوں آرزو۔"

قاسم فردوس تھوڑا سا گڑبڑا کر بولا۔ "کون آرزو؟"

"میں آرزو۔"

"کیا میں کبھی آپ سے ملا ہوں۔"

"نہیں ایک مدت سے آپ نے مجھے نہیں دیکھا۔ بچپن میں ہم اکٹھے کھیلا کرتے تھے، یاد ہے آپ کے پاس تتلیوں کو پکڑنے کا ایک ریکٹ نما جال تھا...... آپ اس میں تتلیاں پکڑا کرتے تھے......"

"ہاں کچھ کچھ یاد آیا......" قاسم نے مسکرا کر جواب دیا۔

"پھر آپ اس میں روشنی کی کرنیں بھی قید کرنا چاہتے تھے؟ یاد ہے۔"

اس بات کے متعلق وہ کچھ وثوق سے نہ کہہ سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے اقرار کر لیا۔

"آپ کو یاد ہے ایک بار آپ نے کہا تھا آرزو میں تمہیں اس میں پکڑنا چاہتا ہوں، تتلیوں والے جال میں......"

"شاید میں نے کہا تھا۔ شاید......"

"اور میں نے کہا تھا آپ کا جال ناقص ہے......اس کے دھاگے تو ذرا سا بھی بوجھ برداشت نہیں کر سکتے مجھے کیا پکڑیں گے۔"

"ہاں شاید میں نے کہا تھا...... کہ میں بہت صبر والا ہوں...... تمہیں پکڑ کر رہوں گا۔"

دوسری جانب ایک لمبا قہقہہ بلند ہوا۔ کسی ماڈل یا ایکٹریس کا قہقہہ۔ پھر فون بند ہو گیا۔ قاسم فردوس غرابت کا شکار گومگوں کے عالم میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنے متعلق شک وشبے کا شکار تھا شاید یہ وقفہ بہت لمبا ہو جاتا۔ اس کی فیکس سے کاغذ نکلنے لگا۔ ابھی وہ آگے بڑھ کر پیام لینے والا تھا کہ مودب وزیر خانساماں نظریں جھکائے آ کھڑا ہوا۔

"کیا بات ہے؟"

"سر کھانا لگادوں؟"

"کچھ بھوک نہیں ہے آدھے گھنٹہ بعد سہی......"

"اچھا سر......"

"وہ صاحب جو آئے تھے چلے گئے؟"

"جی سر...... بڑے مذاقیہ آدمی تھے سر......"

"تم نے کیسے اندازہ لگایا وزیر۔"

"وہ جی کھڑے کافی دیر مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ جانے لگے تو میں نے پوچھا آپ کا نام کیا ہے سر، کہنے لگے اللہ میاں۔ یاد رہے گا۔"

"اللہ میاں یہ کیا نام ہوا۔"

"میں نے بھی کہا تھا سر یہ کیا نام ہوا تو کہنے لگے یہی تو ایک نام باقی سب کو بھلا دیے ہیں۔"

قاسم فردوس کو پرگنہ باڑی کا فقرہ یاد آ گیا جو اپنا نام نہ بتاتا تھا۔

"میں نے بتایا ناں سر بڑا مذاقیہ آدمی تھا......اگر آپ کھانا کھالیں سر تو بڑی مہربانی ہو گی، آج میاں میر صاحب کا عرس ہے مجھے جانا تھا وہاں ذرا۔"

"اچھا لگاؤ۔" فیکس سارا کاغذ اگل کر خاموش ہوئی۔ قاسم نے اٹھ کر فیکس میں سے کاغذ نکالا۔ فارسی میں اشعار درج تھے پھر

یک ذرہ ندیدم ز خورشید جدا
ہر قطرہ آب ہست عین دریا
حق را بچہ نام بتواند خواندن
ہر نام کہ ہست است از اسمائے خدا

میں تجھے توحید کے بارے میں بتاتا ہوں اگر تو اسے اشارے سے سمجھ جائے خدا کے سوا کبھی کوئی معبود نہیں رہا ہے جن کو تو دیکھتا اور غیر جانتا ہے اپنی ذات میں وہ ایک ہیں اور نام سے جدا جدا ہیں۔

قاسم فردوس کو یوں لگا جیسے یہ فیکس اسے دارا شکوہ نے دی ہو۔ اس نے سر جھٹک کر سوچا کہ کیا روحیں فیکس دے سکتی ہیں۔ پھر خیال آیا کہ فیکس بھی تو کچھ کم حیرت کی بات نہیں ہزاروں میل کا فاصلہ پل بھر میں طے کرتی ہے۔ اگر سائنس ایک معجزہ کر سکتی ہے تو کون جانے روحیں بھی ایک معجزے پر اختیار رکھتی ہوں؟“

قاسم نے سوچا ان مغل شہزادوں کے بارے میں کیا رائے قائم کروں؟ کیا انتہائی غم سے گزرنے والا آخر میں بھی دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے؟ وہ بھی صاحب اختیار ہونے کے ناطہ آخر کو اپنی پسند اور ناپسند کے تابع رہتا ہے کچھ لوگ پکارتے رہتے ہیں میں ہی ہدف کیوں بنا؟ مجھ پر ہی یہ بپتا کیوں آئی؟ گلہ گزاریوں کی پوٹ بنے ایسے لوگ دہریے بن جاتے ہیں اور کچھ کو اس کی رحمت کا راستہ مل جاتا ہے۔ اطمینان سے بھری روح اپنے رب کی رضا میں راضی ہو جاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ غم کی کٹھالی سے نکل کر ہر انسان کو ایک سا جواب ملے۔ چار بچوں کو اپنے ہاتھوں دفن کرنے کے بعد رشدی صاحب نے کبھی Why me نہ پوچھا۔

قاسم فردوس نے سر جھکا کر سوچا۔ آخر زندگی انسان سے چاہتی کیا ہے؟ مسرت کے طالب، غم آشنا دو راستوں پر چلنے والے؟ جذبات سے مغلوب انسان کا اصلی مقصد کیا ہے؟...... وہ یہاں وہاں کیوں بھٹکتا پھرتا ہے؟

قاسم فردوس نے تاسف سے پوچھا۔ کاش میں ان بڑے میاں سے انسان کی معنویت یا بے مقصدیت کے بارے میں پوچھ لیتا۔ یقیناً پرگنہ باڑی کے اس فقیر کو جواب معلوم تھا۔

مفتی جی ”خیمہ ساز“

جب کوئی بزدل بہادر میدان جنگ ہار کر شام کے اندھیرے میں معدوم ہوتا چلا جاتا ہے تو فنا اس کی ناطاقتی کا فائدہ اٹھا کر ایسا بھالا مار کر گراتی ہے کہ دیر تک فضا میں اس کے گرنے کی صدا کبھی آہستہ کبھی Echo بن کر آتی رہتی ہے...... بزدل بہادر بار بار گرتا ہے اٹھتا ہے اور پھر گر جاتا ہے۔

ممتاز مفتی کے جانے کے بعد ابھی تک اس کے گرنے کی دھب دھب سنائی دیتی ہے اور ہم اس جگت استاد کی باتوں سے خالی نہیں ہوئے۔ آپ سب مفتی جی کی شخصی حکومت سے تو واقف ہیں اور انہیں مجھ سے بہتر طور پر جانتے سمجھتے اور پہچانتے ہیں لیکن ایک بات کا شاید آپ کو علم نہ ہو کہ مفتی جی خلاصی تھے۔ پتہ نہیں حرفت سے اتنا گہرا شغف عکسی مفتی نے ان سے اخذ کیا کہ مفتی جی نے لوک ورثہ کے عکسی کی نقالی میں میخچو ہاتھ میں پکڑا اور خیمے، اسارنے اور شامیانے، چھولداریاں کھڑا کرنے کا فن سیکھا۔ شادی بیاہ کی رسومات سے پہلے صبح کے وقت تنبو، قناتیں لگانے والے آیا کرتے ہیں۔ ان کی چال ڈھال سے شبہ نہیں ہوتا کہ یہ میخیں ٹھونک، طنابیں کھینچ رسیوں میں گانٹھیں ڈال یوں شامیانے قناتیں لگائیں گے کہ جنگل میں منگل ہو جائے گا۔

مفتی جی بھی گینا آدمی تھے۔ ان کا بنیادی پیشہ بھی شامیانے، چھولداریاں، قناتیں، دو آشیانے شبنمی سائبان نصب کرنا تھا۔ وہ آہستگی سے میخ ٹھونکتے، پھر ڈھیلے کپڑے کی اٹھان آنکتے اور طناب کو جھٹکا دے کر ایسی گرہ دیتے کہ پل بھر میں شاہی خیمہ

مغلوں کی یاد دلانے لگتا۔ مفتی جی انسانی سرشت کے بڑے نباض تھے۔ انہوں نے داروغہ گھاٹ کی طرح رنگ رنگ کے آدمی کو قریب سے دیکھا تھا۔ ان کے اردگرد وقت ضائع کرنے والے، جھگڑالو، ناکارہ، احساس کمتری میں مبتلا لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ یہ بے جان کپڑے سے ڈھیلے گرے پڑے زمین دوز لوگ مفتی جی کی کاریگری کے منتظر رہتے۔ وہ بڑی آسائش، چابکدستی اور ہنر مندی سے ان لوگوں کو منڈل درباری، شامیانہ عجائبی چھولداری کی طرح کس کساکر قابل دید بنا دیتے۔

مفتی جی نے ساری عمر سکول ماسٹری نہ چھوڑی۔ وہ ڈوبتے کو تیرنا سکھایا کرتے۔ تپ دق کے مریض کو ٹینس کا ریکٹ سیدھا رکھنا سکھاتے۔ کبھی شاباش دے کر کبھی مرغا بنا کر اٹنشن کا کاشن دیتے، کبھی فرائیڈ کی آنکھ مار کر چوری چوری پکڑ لینے کا سبق دیتے۔ کبھی قدرت اللہ شہاب کی لاٹھی تھما دیتے کہ "لے بچہ رام بھلی کرے گا؟" جب تک انسانی سرشت سے واقفیت کم تھی جنس میں پناہ تلاش کی...... وسعت پیدا ہوگئی تو سرنگوں سوالی کا رشتہ غیب سے جوڑ کر آسرا دے دیا۔ بس اس خیمے نصب کرنے والے کا ایک ہی مسلک تھا۔ وہ کسی کو سینے پر سر جھکا کر بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ اس کے اندر رنگ ماسٹر، سکول ٹیچر، ڈرل ماسٹر اکٹھے رہتے تھے۔ اس لیے عموماً جس کی مدد کرتے اس کے جسم میں آنکس ضرور پیوست کر دیتے۔ اسے زندہ کرنے اور رکھنے کے لیے شاک تھراپی بصورت جھڑپ جھنجھٹ اور جھگڑا کھڑا رکھتے۔

خود مفتی جی کو نہ شور پسند تھا نہ جھگڑا، وہ تو ایسی موسیقی بھی پسند نہ کرتے تھے جو اٹھ کر ناچنے پر مجبور کر دے لیکن کسی گری چھولداری، الجھے ہوئے شامیانے کو دیکھ کر وہ فوراً اعلان جنگ کر دیتے۔ میدان جنگ میں گھسیٹ لینے کے بعد انہیں یقین ہوتا کہ اب یہ مردہ اپنا بچاؤ خود کرے گا۔ خوشبو دار پان، ہومیو پیتھک پڑیاں، بحث مباحثہ ان کی Warming up ورزشیں تھیں...... اصل تعلق بہت بعد میں استوار ہوتا۔

پتہ نہیں کیوں اور کیسے جو حقیقتیں خیر گیر اور دیرپا ہوتی ہیں۔ ان کے نزول و ورود کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہوتا۔ وہ جنگ میں چلنے والی پہلی گولی کی طرح اچانک اور نتائج میں دورمار ہوتی ہے۔ قدرت اللہ شہاب کے ساتھ ممتاز مفتی، اشفاق احمد، انشا جی کب اور کس طرح مربوط ہوئے...... منبع کہاں تھا اور کیوں تھا یہ لمبے تجزیے، قیاس پر مبنی ہیں لیکن اتنی بات طے ہے کہ شہاب صاحب کے حضور ممتاز مفتی کاریگر نہ

تھے۔ ان کے ہاتھ سے طنابیں، رسیاں، میخچو سب گر گئے اور وہ خود ایک پھٹی ہوئی چھولداری بن گئے۔ عاشقوں کے مابین ربط باہمی کے علاوہ تھوڑا بہت حسد خفی بھی ہوتا ہے۔ شہاب صاحب سے تو جھگڑے نے کبھی جنم نہ لیا لیکن ان یاروں میں آپس میں بے باکی بڑھ گئی۔

ان دنوں ہم سمن آباد میں رہتے تھے۔ ابھی مفتی جی ہماری طفل تسلیوں میں مشغول تھے۔ ہم دونوں نے پر پرزے نہ نکالے تھے کیونکہ غریبی کے Exposure کا زمانہ تھا۔ آپ جانتے ہیں۔ غریب آدمی یا تو بات نہیں کرتا یا پھر کہہ سن کر پچھتاتا ہے۔ شہاب صاحب سے ابھی مفتی جی کا سمبندھ نہ بنا تھا اور ہم پر یہ چارج تھا کہ ہم ایک بڑے افسر کی خوشامد درآمد میں مبتلا رہ کر اپنی عاقبت خراب کر رہے ہیں۔ اس پر دو چار بار مفتی جی نے ہمیں آنکس مار کر چالو کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ابھی ہم اپنا نکتہ نظر، آرزو اور عندیئے کو سمجھانے کے قابل نہ ہوئے تھے۔ اس لیے چپ چاپ جنم روگی بنے رہے۔

لیکن 1967ء تک ہم بھی کچھ کچھ شتر بے مہار ہوگئے۔ ہمیں بھی نظریاتی بحثوں میں لطف آنے لگا۔ ہم 75 جی میں مقیم تھے اور اظہار برملا کی عادت پڑنے کو تھی۔ یہاں مفتی جی سے پہلی جھڑپ ہوئی۔ ادیب چونکہ ایک ہی مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس لیے۔ آپس میں جھپٹنے کی نا سمجھی ہو ہی جاتی ہے لیکن مفتی جی اور میں تو ہمیشہ مختلف سمت میں دیکھنے کے عادی تھے۔ پھر کیسے نہ جھگڑتے؟ تعجب کی بات یہ ہے کہ ہر اختلاف کے بعد مفتی جی مجھ پر پہلے سے زیادہ مہربان ہو جاتے اور میں اس خیمہ ساز پر پہلے سے سوا اعتماد کرتی۔

75 جی ماڈل ٹاؤن کی ایک پرانی کوٹھی تھی۔ اس کا ڈرائیو وے نصف دائرے کی شکل میں دو پھاٹکوں پر منتج ہوتا تھا۔ راستے کے گھیرے میں ایک کھلا لان تھا۔ شام گزر چکی تھی۔ پورچ کی دھیمی بتی براؤن فوکسی پر پڑ رہی تھی۔ سمن آباد کے دس مرلہ مکان سے یہاں کا کھلا گھر مختلف تھا اور ایک نئے Exposure کا باعث بھی ہوا تھا۔ اب بات کرنے سے پہلے چپ نہیں لگتی تھی۔

مفتی جی نے ڈرائیو وے پر بکھری پڑی اینٹ اٹھائی اور اس پر بیٹھ گئے...... میں نے ان کی نقل میں ایک براؤن اینٹ کو جھاڑ کر رکھا اور اس پر جم گئی۔ اچھا زمانہ تھا

گھٹنے ابھی ایسی نشست کو قبول کرتے تھے۔

مفتی جی گویا ہوئے "تم نے جو خط لکھا تھا اس سے دوستی کی خوشبو ہرگز ہرگز نہیں آتی وہ خیر خواہی پر مبنی ہے اور گو میں کمینہ ہوں لیکن دنیا دار نہیں ہوں۔"

میں اس جرم بکارِ سرکار کی پیشی کے لیے آمادہ نہ تھی۔ میں نے خط کی وضاحتیں پیش کیں، مفتی جی اور میرے درمیان احترام اور تعلق کی جو دیوار حائل تھی اسے بارِ ثبوت کے دوران پیش کرنا میرے بس کی بات نہ تھی، میں نے ڈرتے ڈرتے بارک باسٹر مفتی جی سے عرض کی کہ میرے نزدیک دوستی کی اہم ترین باقی جمع خیر خواہی ہے اور کسی طور بھی اسے ہاتھ سے چھوڑنا بالک چوری ہے۔

مفتی جی کا موقف تھا کہ دوستی میں خیر خواہی قسم کا زہر نہیں ملایا جاتا۔ یہ راستہ سمجھانے کا نہیں ساتھ چلنے کا عمل ہے۔ میں بضد تھی کہ دوست کا اولین فرض دینی بھائی کی طرح گرنے سے بچانا۔ آگ میں بھسم ہوتے نہ دیکھ سکنا اور فقیری گٹکے استعمال کر کے غلط راستوں سے روکنا ہے۔ انہوں نے سختی سے الزام لگایا کہ یہ خیانتِ مجرمانہ ہے اور مجھ جیسے محتسب کا میخانے کی سرمستی سے کوئی سروکار نہیں میں نے ہانک لگائی کہ نیت پر شبہ کرنا دوستی کی توہین ہے، وہ بولے ذاتی جوہر سے محروم کی قیمت آنکنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟

ہم دونوں اپنے اپنے نظریے پر جمے رہے بحث لمبی ہوتی گئی لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچی۔ جب بچوں نے آ کر اینٹوں سے اٹھایا تو مفتی جی میرے بہترین بہی خواہ تھے اور میں نے دوستی کا علم اٹھا لیا تھا۔ اب ہم پھر Juta پوزیشن میں تھے۔ وہ میرے دلائل دے رہے تھے اور میں ان کا علم اٹھائے ہوئے تھی۔ یہ میچ Draw ہو جانے کے بعد کچھ عرصہ فضا بہت خاموش رہی۔

مفتی جی کو شاید نماز اور خوشبو زیادہ پسند نہ تھی لیکن وہ نفسیاتی، جبلی، جذباتی طور پر عورت سے بہت وابستہ تھے۔ وہ عورتوں کے رابن ہڈ تھے اور اپنے اس وَل پر فخر بھی کرتے تھے۔ جب کبھی کوئی شخص کسی سے محبت کرتا ہے تو اس میں بدو بدی محبوب کو مظلوم سمجھنے کی خوبی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مفتی جی کے اعصاب پر اپنی ماں اس درجہ طاری تھی کہ پھر ساری عمر وہ ہر عورت کو مظلوم ہی سمجھتے رہے۔ عورت کے مقدمے کی پیشیاں بھی وہ مفت ہی بھگتتے رہے اور کبھی کسی مقدمے کے لیے کسی عورت سے

مسکراہٹ بھر معاوضہ بھی قبول نہیں کیا۔

ہم دونوں کی جھڑپیں اس سلسلے میں ہوتی رہتی تھیں۔ میں کہتی "مفتی جی سوچ میں ڈنڈی نہ ماریں' ادیب کا یہ کام نہیں' انصاف سے کام لیں' انصاف سے۔ جو صدیوں مرد کا مال کھاتی رہی ہے اس مظلوم نے بھی استحصال کرنے کے کچھ شعوری لاشعوری طریقے سیکھ لیے ہوں گے...... مفتی جی ظلم کے خلاف لکھیں مظلوم تو بدلتا رہتا ہے۔ کبھی مرد ظالم ہوتا ہے کبھی عورت...... یا یوں کہیے دونوں ہی کبھی بیک وقت کبھی الگ الگ مظلوم ہیں۔ ہمیشہ مزدور کو مظلوم سمجھنے سے وہی انجام ہوگا جو روس کا ہوا...... ہمیشہ حکومت کو ظالم سمجھنے سے پاکستان جیسے ناقابل فہم حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔"

مفتی جی سید دعویٰ پیش کرتے "کڑیئے عورت پر مرد نے صدیوں ظلم کیے ہیں وہ اسے مارتا ہے اسے جوتی کی طرح استعمال کرتا ہے۔ اس کی آزادی سلب کرتا ہے۔"

میں عداوت کے انداز میں اپیل کرتی "مفتی جی سوچ سیدھی کریں آپ کی بات درست ہے لیکن ہمیشہ نہیں۔ کبھی معاشرہ ظالم ہوتا ہے کبھی فرد...... زرعی دور کی اپنی مصیبتیں تھیں، مشینی دور کے اپنے ظلم ہیں۔ اب روزی کمانا اور روزی خرچ کرنا اپنی اپنی جگہ ظلم کے مقامات ہیں۔ مرد اور عورت دونوں ان پرنالوں میں بھیگتے ہیں کبھی کم کبھی زیادہ۔"

مفتی جی کی براؤن آنکھیں غصے سے اور بھی پھیل جاتیں "اوئے بیوقوف احمق عورت تو دِکھنا چاہتی ہے پھول ہے پھول۔"

"تو دِکھ تو رہی ہے مفتی جی...... کبھی ماڈل بن کر...... کبھی چھوٹی یا بڑی سکرین پر جگمگا کر...... روک کون سکتا ہے اسے۔ اسے تو اسلام نہیں روک سکا مرد کی کیا مجال ہے؟"

مفتی جی سمجھ نہ سکتے کہتے "مرد کا ظلم یہ ہے کہ وہ عورت کو دکھنے نہیں دیتا۔ اسے چادر اور چار دیواری میں بند رکھتا ہے' اسے اپنا نیچرل ٹیلنٹ استعمال نہیں کرنے دیتا' اسے مشقت کے حوالے کر دیتا ہے۔"

میں بھی کنیر کا پھول بن جاتی "مفتی جی اگر آپ اپنی آنکھوں سے یہ براؤن

Contact Lens اتار دیں تو آپ کو پتہ چلے کہ مرد اور عورتیں بنیادی طور پر دونوں
مشقتی ہیں۔ دکھنا دکھانا بہت کم سالوں کی عیاشی ہے۔ زیادہ وقت دونوں کا مشقت میں
گزرتا ہے مگر بنیادی طور پر دونوں کی مشقت مختلف ہے۔ وہ ساری عمر کفالت کرتا ہے
اور اندھا، کبڑا ناطاقتا ہو کر آخری عمر میں کھانستا رہتا ہے۔ آخر کو اکیلا ہی سدھار جاتا
ہے۔ عورت کی مشقت رنگ لاتی ہے۔ بڑے ہو کر بچے رکشا پر لکھاتے ہیں "ماں کی دعا
جنت کی ہوا"...... مرد ساری عمر جھڑکیاں کھا کر دھکے برداشت کرتا ہوا کفالت کی راہ
نہیں چھوڑتا۔ مکان بنواتا ہے پردیسوں کی مٹی پھانکتا ہے۔ آخر میں جوان بچے کہتے ہیں
اباجی اگر آپ کوئی ڈھنگ کا کام کر لیتے تو زندگی نہ سنور جاتی......"

"تیرے کوئی بیٹی نہیں اس لیے تو کنیا دان نہیں جانتی کٹھور عورت کچھ ظلم
مرد خصوصی طور پر عورت کے وجود، اس کی وفا اور جذبات پر کرتا ہے۔"

"اور مفتی جی ایسے مظالم عورت کبھی بھی مرد کی خاطر برداشت نہیں کرتی۔
اسے بچے کی خاطر ظلم کی بانبی میں ہاتھ دینا ہوتا ہے۔ اگر عورت کا قافیہ مرد تنگ کرے
تو علیحدگی کا راستہ ہے لیکن اگر بچہ عورت پر ظلم کرے تو وہ اس کا کسی سے ذکر نہیں
کرتی۔"

"تم کیا ہو...... دیکھتی نہیں ہو کہ عورت کی جوانی کتنی رائیگاں جاتی ہے باقی
کیا رہتا ہے کچھ سال کے بعد......"

"اس لیے مفتی جی کہ باقی رہنے کے لیے اپنے میں گُن پیدا کرنے پڑتے
ہیں، جب ماڈل بن کر کام چل سکے تو عورت اپنے میں وہ گن کیوں پیدا کرے جس کو
حاصل کرنے کے لیے برسوں درکار ہوتے ہیں۔ اپنے لیے کسی وصف کا تلاش کرنا تو
صحرا کا سفر ہے، مفتی جی پانی ملے ملے نہ ملے نہ ملے۔"

اب نہ مفتی جی رسی کا سرا چھوڑتے نہ میں رسی ڈھیلی کرتی...... بحث طول
کھینچتی وہ حیران ہوتے کہ میں عورت ہو کر عورت کو مظلوم نہیں سمجھتی، میں اس بات
پر بضد رہتی کہ بات صرف ظلم کی ہونی چاہیے، مظلوم بدلتا رہتا ہے...... کبھی مرد ظالم
کبھی عورت...... اور ظلم کا تیسرا کونہ بچہ...... بچے جیسا ظالم تو نہ دیکھا نہ سنا لیکن اس کے
خلاف کون سی عورت ہے جو زبان کھولے؟

آخر مفتی جی میچ فکسنگ کے لیے مشورہ دیتے بحث ہار جیت کے بغیر ختم

ہو جاتی تو مفتی جی کہتے "کا کو ہم دونوں مل کر ایک کتاب لکھیں عورت پر...... ایک باب
تم لکھو...... ایک میں...... کتاب چھپ جانے تک نہ تمہیں علم ہو کہ میں نے کیا لکھا ہے
اور نہ مجھے معلوم ہو کہ تمہارے خیالات کیا ہیں......" ہماری بحثوں کی طرح یہ
منصوبہ بھی ادھورا رہا لیکن مجھے اتنا ضرور علم ہے کہ اگر یہ کتاب لکھی جاتی تو مفتی جی
اس کا سارا Credit مجھے دیتے اور سارا الزام اپنے سر لیتے کہ ان کی محبت میں اولین
ریت ہی یہ تھی۔

آج کے زمانے میں جب ہر انسان کو اپنے متعلق یہ یقین ہے کہ وہ حساس
بہت ہے اور لوگ اس کا دل دکھانے میں مشاق ہیں۔ انہیں شاید یہ علم نہیں کہ اصلی
بڑا ادیب اپنے معاملے میں کبھی حساس نہیں ہوتا۔ وہ چور، ویلن، آوارہ عورت، سمگلر،
دہشت گرد حتیٰ کہ قاتل کے بارے میں بھی حساس ہوتا ہے۔ لیکن مفتی جی کی طرح
اسے اپنی پروا نہیں ہوتی۔ کچھ ادیب تو اشفاق احمد کی طرح اس درجہ دو دلے ہوتے
ہیں کہ اپنی تحریر میں کوئی ویلن ہی تخلیق نہیں کر سکتے اور ہمیشہ کہانی میں خیال، ارادے،
تجویز کو دشمن انسان بنا کر دو زانو ہو کر سارے کرداروں کی ہی آرتی اتارتے رہتے ہیں۔

مفتی جی نے اپنی زندگی کے کسی مقام پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ حساس ہونا چھوڑ دیا
جائے اور لوگوں کا منہ بند کرنے کا بہترین نسخہ یہ ہے کہ انسان اپنے ظاہر اور باطن کے
تمام عیوب خود بیان کرنے میں مصروف رہے۔ مفتی جی بھی میری طرح خوفزدہ
شخصیت کے مالک تھے۔ ایسے پر خوف آدمی جو شدید خوف کی حالت میں تلوار لے کر
میدان جنگ میں اتر جاتے ہیں۔ مجھے ان کے سچ سے بڑی چڑ تھی اور میں اس سلسلے میں
کئی دھرنے دے چکی تھی۔

"مفتی جی...... آپ کو اپنی ذات کے متعلق سچ بولنے کا صرف اتنا حق ہے کہ
آپ اپنے آپ کو گزند پہنچائیں جب آپ سارے گھرانے کو اپنے دوستوں کو سچ کی وجہ
سے آزار میں مبتلا کر دیتے ہیں تو یہ زیادتی ہے۔ ہم سچ ضرور بولیں...... لیکن اپنے حصے
کا۔ مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں اپنے سچ سے کسی دوسرے کی زندگی میں زہر گھولوں۔"

لیکن مفتی جی تو بزدل بہادر تھے۔ ٹین کی تلوار لے کر نکلنے والے سپاہی۔ ان
کی پتلیاں خوف سے پھیل جاتیں اور وہ بضد ہو کر چیختے...... "لیکن سچ سچ ہے...... سقراط
نے سچ کی خاطر زہر پیا...... تم مجھے سچ بولنے سے روکتی ہو۔"

"مفتی جی اگر آپ سقراط جیسا سچ بولیں تو میں کبھی اعتراض نہ کروں' آپ تو ایکٹرسوں جیسا سچ بولتے ہیں۔ ایسے سچ سے شیخی کی بو آتی ہے۔ My Love Life والے سچ کی واقعی کوئی ضرورت نہیں...... اس سے صرف سکینڈل پھیلتا ہے اور دوسری زندگیاں محروم و مجروح ہوتی ہیں۔"

"پھر پھیلے سکینڈل پھیلے...... مجھے پرواہ نہیں......"

مجھے جوش آ جاتا "لوگوں کو بیمار پا کر آپ انہیں ہومیو پیتھک پڑیاں پہنچاتے ہیں۔ ساری عمر چھولداریاں' شامیانے' قناتیں استوار کرنے میں بسر ہوئی ہے' آپ کے خاکے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ آپ کی دریادلی اتنی ستر پوش ہے کہ سارے عیوب کو پھولوں کی چادر اوڑھا دیتی ہے۔ پھر اپنے پر یہ ظلم کیسا؟ اپنے تنے سے وابستہ شاخوں کو یوں چھیلنا کیا معنی رکھتا ہے۔ پھر یہ تضاد کیوں؟"

مفتی جی کی زندگی میں مجھے بالکل علم نہ تھا اور اب بھی کم کم مجھ پر یہ حقیقت کھلی ہے کہ تضاد ہی حضرت آدم کے ضمیر کا جزو اعظم ہے۔ جتنی بڑی شخصیت ہو گی اسی قدر بڑا اس کے اندر تضاد بھی رسہ کشی میں مبتلا ہو گا۔ بڑے ادیب' آرٹسٹ' کلاکار کے اندر کی یہ صلیبی جنگیں اسے کبھی قرار سے بیٹھنے نہیں دیتیں۔ یہی جنگ اس کے خون جگر کا باعث بنتا ہے اور اسی سے اس کے فن میں کمال کی چاشنی گھلتی ہے۔

شکر ہے میرے حصے تو ہمیشہ ان کی دریادلی ہی آئی جس میں میرے تمام خس و خاشاک بہہ گئے۔ میں اپنے متعلق سچ سننے کی متحمل نہیں ہو سکتی لیکن اپنے لیے انہوں نے جوگیوں کی طرح کانٹے کا ایک فرش بنا رکھا تھا' جس پر چلنے کی پریکٹس وہ صبح و شام کرتے تھے۔

ان سے میری آخری بحث سیب کے درخت پر ہوئی تھی۔

سن اسی کے شروع میں میری کوتاہی' کمزوری' تساہل پسندی نے مجھ میں ایک خاص قسم کا فرار پیدا کر دیا تھا۔ میں نے پہلے ٹیلی ویژن کو خیرباد کہا پھر آہستہ آہستہ لکھنے لکھانے سے مکمل انحراف اختیار کر لیا۔ مفتی جی سے میرا یہ ڈیپریشن برداشت نہیں ہوتا تھا وہ مجھے کہتے...... "تو سیب کا درخت ہے...... تجھے سیب ہی لگتے رہیں تو ٹھیک ہے تو کس وخت میں پڑ گئی ہے......"

"مفتی جی...... سیب کا درخت کبھی کبھی بانجھ بھی ہو جاتا ہے۔" اگر کچھ سال بارش نہ ہو تو باغ سوکھ جاتے ہیں۔ "درختوں کی کیا مجال ہے؟" مفتی جی بھڑک اٹھتے' میں چپ رہتی۔

"نہیں...... یہ بات نہیں ہے...... تو کہیں گم ہو گئی ہے اور تو اپنا بنیادی کام نہیں کرنا چاہتی بیوقوف...... ہم لوگ صرف لکھ سکتے ہیں۔ ہم یہاں لکھنے کے لیے آئے ہیں یہ نہ سوچ کیا لکھنا ہے کیسے لکھنا ہے بس لکھ...... "باقی سارے کام اضافی ہیں۔"

میں انہیں بحث میں بہت دور لے جاتی۔ وہ جو کلے ٹھونکنے' رسیاں کھینچنے اور شامیانہ کھڑا کرنے کے ماہر تھے بحث میں ہار جاتے...... ممتاز مفتی جو ساری عمر ہار ماننے والا نہ تھا۔ سر جھکا کر بیٹھ رہتا اور سمجھ نہ سکتا کہ اس کی وہ طاقت کہاں گئی جو لمحوں میں ہر بحث جیت جایا کرتی تھی۔

اس کاریگر کو علم نہ تھا کہ زندگی اسی طرح ناطاقتی پیدا کرتی ہے...... پہلے انسان فنا سے ہارتا ہے اور پھر ہر جنگ ہار جاتا ہے۔ آخر چلا جاتا ہے۔ مشن پورا ہو تو بھی ہارتا ہے' ادھورا رہ جائے تو بھی شکست آشنا ہو جاتا ہے...... بہادر انسان جو خوفزدہ بھی ہو اس کے ہار جانے کا منظر بھی عجیب ہے...... شکستہ رو سپاہی کارزار سے چلا تو جاتا ہے لیکن یہ منظر اس کے چاہنے والوں کو کبھی بھولتا نہیں...... جانے والے نے اتنی جگہ آپ کے دل میں گھیری ہوتی ہے کہ مدتوں یہ خلا بھرتا نہیں۔ دیر تک اس کے گرنے کی آواز آتی رہتی ہے...... کبھی سائیں سائیں بن کر کبھی Echo کی طرح پھیلتی ہوئی۔ کبھی گرداب کی طرح اٹھتی بیٹھتی...... یہ آواز ختم ہونے میں ہی نہیں آتی۔

"ڈاہڈے سنگ پریت"

رات گہری ہو چلی تھی' ٹیٹری کی تنہا کوک کالے پڑتے آسمان کو چیر کر کسی ساتھی کو آواز دے رہی تھی۔ گاؤں کا یہ پختہ مکان آبادی سے دور اور کھیتوں سے نزدیک تھا۔ جب بھی ٹیٹری ٹٹکارتی غلام زہرہ کا دل دہل جاتا' اسے لگتا وہ بھی اس دنیا میں صرف آوازیں دینے کے لیے آئی تھی۔

"سو جا...... سارے لوگ باگ سو گئے تو یہاں کھڑی کیا دیکھ رہی ہے آسمان کو۔" ابا نے ٹکا سی جان کو دبکایا۔

"چاند کے گرد چکر پڑ گیا ہے ابا سنا ہے جب بھی یہ چکر پڑے قحط کا سال آتا ہے' لوگوں کو بد نصیبی الگ ستاتی ہے' ملک پر آفت جدا آتی ہے اور۔"

غلام زہرہ کا باپ زمانے کا ستایا' مار سہہ سہہ کر سیانا ہو گیا تھا جب سے دونوں بیٹے قتل کے الزام میں جیل بدر ہوئے اسے کوئی غم چھوتا تک نہ تھا۔ غلام زہرہ لو کی طرح اندر باہر پھرتی تھی لیکن ابا لوہا لوٹ ہو چکا تھا۔ اس دہری تلوار سے اب کاٹ ممکن نہ تھی وہ اجڑی پجڑی بیٹی کو دیکھتا اور بے بسی سے گردن جھکا لیتا۔

"اوئے لونا چماری گھر چلی جا واپس' کہے تو میں پاؤں پکڑ لوں اس سینہ زور کے۔ دھونسیا ہو گا پر دل کا برا نہیں ہے کیوں غلام زہرہ بتا...... میں بات کروں فقیر محمد سے۔"

"ناں تو مجھے طلاق لے دے ابا...... میں فقیر محمد کے گھر بس نہیں سکتی۔ بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے......"

"اور میں بھی تجھے آخری چانس دے رہا ہوں تھتھیئے...... اچھا ہوا تیری ماں وختاں ماری قبروں میں جا گڑی...... جو آج زندہ ہوتی تو اس کی کوئی تھاہ ملنی تھی؟ ایویں وٹ بٹوں پر ٹھوکریں کھاتی پھرتی۔ بیٹی کی طلاق کے بعد کوئی ماں باپ جیاء ہے کبھی۔ لاش بھانویں نظر آئے سب کو۔"

"ابا جو بھی ہے...... تو مجھے فقیر محمد سے چھٹکارا لے دے میں اس کے ساتھ کسی ڈھب پر بھی پوری نہیں اتر سکتی...... وہ بڑا آدمی ہے میں موری کا کیڑا...... ہمارا کیا جوڑ؟"

"اوئے پاگل کی پتر کیا وہ شراب پیتا ہے؟ شرابی کی بیوی واویلا مچائے تو سمجھ آتی ہے شراب پیتا ہے فقیر محمد؟ بتا۔"

"ناں...... نشے کو تو اس نے کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا...... میں نے تو پان بھی اس کے منہ میں نہیں دیکھا ابا۔"

"جواء کھیلتا ہے......؟ گھر کی چیزیں داؤ پر لگاتا ہے...... کونڈا کر دیا ہے گھر بار کا؟"

"ناں ابا ناں...... اس نے تو کبھی پانسہ بھی نہیں کھیلا...... لوڈو کی گوٹی بھی نہیں پہچانتا مورکھ۔"

"پھر کوئی زنانیوں کا چکر ہے؟ غیر عورت کے پیچھے بھاگنے والے مرد کی بیوی کلپتی ہے' تو ٹھیک ہے...... سوتیا ڈاہ کا جلاپا برا۔ لوہا جانے لوہار جانے دھونکنے والے کی بلا جانے مرد کو سوتیا ڈاہ کا کیا پتہ؟ کسی اور عورت کا قصہ ہے تو میں تیرے ساتھ ہوں۔"

"جھوٹ نئیں بولنا ابا تیرے ساتھ وہ مجھ پر نظر نئیں ڈالتا...... دوسری عورتوں سے کیا لینا ہے کوڑ نے......"

مرید حسین نے دو تین منٹ حقہ گڑگڑایا۔ پھر دیر تک پنڈلی کھجلاتا رہا۔ کچھ سوچنے کے بعد ابا مرید حسین نے کہا۔

"بات یہ ہے غلام زہرہ عورت کو سب سے بڑا ٹمک دوسری عورت کا ہی لگتا ہے جو یہ چکر نہ چلے تو میاں بیوی میں آنند ہی آنند ہوتا ہے......"

"اس پلیدی سے بچا ہوا ہے ابا آپی آپ...... یہ میں قسم کھاتی ہوں ابا عورت وورت کا چکر کوئی نئیں۔"

"پھر اور کیا خرابی ہے فقیر یئے میں...... اونچا لمبا' گورا چٹا' اچھے کپڑے پہن لے تو خان بہادر دکھائی دے...... کیا خرچے سے تنگ کرتا ہے......"

غلام زہرہ کو بات سمجھانی مشکل تر ہوتی جا رہی تھی۔ کوئی یہ بات خود نہیں سمجھ رہی تھی باپ کو کیا سمجھاتی۔

"ناں ابا گیارہ بارہ بجے تک ریڑھی پر املی آلو بخارے کا شربت بیچتا ہے۔ پھر سارے پیسے میرے ہاتھ میں پکڑا کر چپت ہو جاتا ہے' میں پیسوں کا سیاہ کروں یا سفید کبھی پوچھتا ہی نہیں...... کہاں مرتی ہے کیا کرتی ہے...... اس کی جیب میں کچھ ہو یا نہ ہو اس کی جانے جوتی۔"

غلام زہرہ کی نظروں میں فقیر محمد گھوم گیا۔ بڑا وجیہہ 'سوہنا من موہنا چہرہ' اوپر والے ہونٹ پر کالا تل' گردن تک رکھے ہوئے پٹے' چلتا تو لگتا ابھی بھنگڑا ڈالنے لگے گا۔ بیٹھ کر کھانا کھاتا تو ایسی چونکڑی مارتا جیسے کوئی برہمن آسن جما کر شلوک پڑھنے والا ہے۔ مزدور کے ہاتھ تھے بڑے بڑے اور سخت مضبوط پر غلام زہرہ کو روئی کی طرح چھوتا کوئی دھینگا مشتی' شور شرابا' سفلہ پن نہ نظر میں تھا نہ نس میں...... ہوں ہاں سے بڑھ کر کوئی بات کرتا ہی نہ تھا۔ بلکہ غلام زہرہ جب شروع شروع میں لڑتی جھگڑتی' طعنے دیتی' صلواتیں سناتی تو وہ اسے خاموشی سے شہ مات دے کر گھر سے نکل جاتا۔ اسی یک طرفہ لڑائی میں لڑتے لڑتے بالآخر غلام زہرہ ہونکنے لگتی' اب تو بیٹا جمیل دس برس کا ہو چلا تھا لیکن فقیر حسین سے لڑنا بھڑنا تو چار پانچ سال پہلے کی گزارشاتیں تھیں۔ اب تو وہ دونوں الگ الگ کوٹھڑیوں میں اپنی اپنی چارپائی پر اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑے رہتے' چپ چپین سکھ شانت...... ہُو کا عالم۔

غلام زہرہ کی آنکھوں میں وہ دن پھر گئے۔

ہوا میں آم کا بُور اُڑتا پھرتا تھا اور بڈھی مائیاں ہولے ہولے کبھی پتوں پر کبھی گھاس پر جالے کی طرح بیٹھ جاتی تھیں نہ سردی تھی نہ گرمی...... موسم آدھا اندر آدھا باہر ہو رہا تھا۔ اس رات جمیل کو اکیلا بستر پر چھوڑ کر غلام زہرہ نے ساتھ والی کوٹھڑی کا دروازہ کھولا۔ چارپائی خالی تھی!

غلام زہرہ کا ماتھا ٹھنکا۔ جب کبھی انسان کی مرضی کے خلاف کوئی کارروائی ہو تو بُرے بُرے خیال دل میں زلزلے اٹھانے لگتے ہیں۔ خوف کی یہ صورت دہلا دیتی ہے۔

غلام زہرہ کی نگاہوں میں شوخ چشم' چندری شوں شاں سے بھری سوڈے کی بند بوتل پنو گھوم گئی۔ کچھ عرصہ سے وہ کچھ نہ کچھ مانگنے اس کے گھر آتی رہتی تھی۔

"بھابی...... پرات بھر آٹا دے دے تھُڑ گیا ہے شام کو لے آؤں گی واپس۔"

فقیر محمد چُپ چاپ اپنی ریڑھی پر گلاس دھو دھو کر رکھتا' شربت کی بوتلیں سجاتا' اس شیخ سدّو کو علم نہ ہوتا کہ کون آئی کھڑی ہے لیکن غلام زہرہ کو یقین تھا کہ ان دونوں کے اندر ٹیلی فون لگا ہوا ہے۔ پنو کبھی ایسے وقت آتی ہی نہ تھی جب فقیر محمد گھر پر نہ ہو۔

"لے جا آٹا پر موڑ دینا۔ میرے پاس آپ کم ہے......" بختوں جلی غلام زہرہ کہتی۔

"لے میں تو ماچس تک موڑ جاتی ہوں...... لے ذرا میری ناک میں کوکا تو ڈال دے بھابی......" وہ کنکھیوں سے مورکھ فقیر محمد کو دیکھ کر کہتی۔

"میرے پاس اس وقت ویل نہیں ہے...... دیکھ ناں میرے ہاتھ لبڑے ہوئے ہیں" وہ آٹے سے سنے ہاتھ دکھا کر کہتی۔

"ہائے ہائے نہ سہی بھابی نہ سہی۔ پر اتنا کھروا کیوں بول رہی ہے......" پنو منہ تھتھا کر بولی۔

سختی سے بات کرنے کے باوجود کسی نہ کسی بہانے پنو آتی رہتی۔ اس رات کوٹھڑی میں فقیر محمد کو نہ پا کر غلام زہرہ کو یقین ہو گیا کہ پنو کا داؤ چل گیا۔ پانچ سال کے جمیل کو کوٹھڑی میں سوتا چھوڑ کر اس نے باہر سے زنجیری لگائی اور چھپتی چھپاتی پنو کے گھر کی طرف چلی...... راستہ تو کچھ لمبا نہ تھا بات بھی محض وہم کی تھی پر نہ جانے کیوں وہ ملیریا کے بخار میں لرزتی سی جا رہی تھی۔ یوں آدھی رات کو باہر نکلنے کا موقع غلام زہرہ کو پہلی بار پیش آیا۔ جس وقت وہ مسجد کی دیوار کے پاس تھی تو اس نے مسجد سے فقیر محمد کو نکلتے دیکھا۔ غلام زہرہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ فقیر محمد سے دس بارہ قدم آگے آگے پنو چل رہی تھی۔ اُس کا جی چاہا کہ پہاڑی کوّے کی طرح اونچی اونچی بین ڈالے۔ پنو نے پیلے رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے جو چاندنی رات میں سفید معلوم پڑتے تھے۔ بڑی ترنگ کے ساتھ بازو ہلا ہلا کر وہ عجیب ڈھب سے چل رہی تھی۔

موڑ سے پہلے ہی فقیر محمد نے اپنا راستہ بدل لیا اور پنو کو ایک اور سایہ ساتھ

لے کر حویلی والے موڑ کی طرف چل دیا...... غلام زہرہ کے پاس اب ایک ہی راستہ باقی تھا کہ وہ فقیر محمد کے تعاقب میں اپنے آپ کو ٹھیلتی رہے۔ بیچاری درختوں کی آڑ لیتی اپنی ثالثی میں یکا و تنہا بڑھتی چلی گئی۔ بڑے جوہڑ سے متصل خانقاہ کے قریب پہنچ کر فقیر محمد نے اپنے جوتے اتارے پٹاخ پٹاخ اُن کے تلے آپس میں بجائے اور خانقاہ میں داخل ہو گیا۔

غلام زہرہ آواز کی جھوک سنبھالتی خانقاہ کے ٹوٹے دروازے کے ساتھ جڑی اندر والے دالان میں جھوٹ سچ نتھارنے کو کھڑی ہو گئی۔ دن کے وقت تو اس خانقاہ پر کافی رونق رہتی تھی لیکن اس وقت وہ گدڑی پوش آسمان کی جانب دونوں ہاتھ اٹھائے کچھ ایسی باتیں کر رہا تھا جن کی سمجھ غلام زہرہ کو نہ آنی تھی، نہ آئی جس فقیر محمد نے کبھی اسے جھوٹوں بھی نہ پوچھا تھا وہ اس فقیر کے قریب پہنچا اور اپنے دونوں جوتے رکھ کر اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

”اوئے دفع ہو جا...... چلا جا...... ہمیں ہاتھ لگاتا ہے...... ہیں ہمارا مال چرانا چاہتا ہے، کنجرا...... ہم بھی کچھ بے دھیانے نہیں...... جا چلا جا...... کیوں اپنا اور ہمارا وقت ضائع کرتا ہے...... یہ تیرے جیسوں کی جگہ نہیں۔“

اپنی سعیٔ سفارش میں فقیر محمد کچھ منمنایا......

”چور کے پیچھے مہاں چور...... اوئے سُسریا تیرے پیچھے تو مہاں پاپی لگا ہوا ہے تو کیا سیندھ لگائے گا...... املی، آلو بخارا بیچ لوگوں کے کلیجے میں ٹھنڈ ڈال...... میرے پاس وہ ڈباؤ پانی نہیں ہے جس میں تو ڈوب جائے......“

”کون ہے میرے پیچھے سائیں جی...... کون؟“

یک دم غلام زہرہ کو پینو یاد آ گئی وہی کھچری ہو گی جو آدھی رات کو گھر سے باہر ڈنگتی پھرتی ہے۔

”کون ہے میرے پیچھے سائیں جی کون؟......“

”دنیا...... حرص...... طمع......“

”آپ قسم لے لیں سائیں جی...... بس روزی کماتا ہوں...... رزق حلال......

جو پائی بھی اپنی ڈب میں رکھوں تو جو چور کی سزا وہ میری...... سارا غلام زہرہ کی جھولی میں...... فقیر ٹس سے مس نہ ہوا، وہ جو گویا فقیروں کی خفیہ پولیس کا بندہ تھا۔ بھید لیتا تھا دیتا

نہیں تھا۔ اُسی طرح دونوں ہاتھ آسمان کی جانب اٹھائے ساکن رہا۔

”اس وقت بھی کوئی تیرے پیچھے ہے کملیا...... اسی ڈھچر پر آتا رہا تو کچھ نہیں ملنا تجھے خالی کاسہ لیکر آ...... سب کچھ پھینک کر آ...... مکان خالی ہو تو مکیں آئے ناں......“

غلام زہرہ اس سے آگے نہ کچھ سمجھی نہ ہی اس نے سننے کی کوشش کی...... سائیں جی تو مکان ہی خالی کروا رہے ہیں۔ ڈاہڈے کے آگے وہ کیا بولتی؟ اس ڈاک چوکی پر تو ہرکارہ ہی بدل جاتا تھا، وہ ڈاک کا تھیلا خالی کر کے واپس چل دی۔

مرید حسین نے اونچا کھنگار کر کہا۔

”اوئے شدین ماں کی پاگل اولاد کیا سوچ رہی ہے آسمان کی طرف منہ کر کے......“

”بس ابا سوچنے سمجھنے کا وقت نکل گیا تو مجھے چھٹکارا لے دے مجھے کچھ نہیں لینا فقیر محمد سے نہ آج نہ کل نہ روزِ قیامت۔“

”خرچ سے تنگ رکھتا ہے تجھے......“

”ناں ابا...... گرمیوں میں املی آلو بخارے کا شربت، برساتوں میں چھلیوں کی ریڑھی، سردیوں میں نان چھولے...... کام تو اس کا کبھی رُکا ہی نہیں...... پائی پائی تلی پر رکھ دیتا ہے...... پیسے کی طرف سے تو میں سوکھی ہوں...... اللہ کو جان دینی ہے۔ خرچ کی تنگی نہیں ہے۔“

”واہی بیجی کیوں نہیں کرتا؟ باپ نے چنگی بھلی زمین چھوڑی ہے......“

”زمین تو کبھی کی میرے نام کر دی ابا مکان بھی میرے ناویں چڑھا ہوا ہے...... اسے کوئی لوبھ نہیں ایسی چیزوں کا۔“

”پھر کس چیز کا لالچ ہے اس تل نظرے کو......“

”کچھ لوبھ بڑے کچے ہوتے ہیں ابا...... لوبھ کی بھلی سنائی۔“

غلام زہرہ سر سے پاؤں تک خوبصورت ہی خوبصورت تھی۔ اسے اپنا دماغ استعمال کرنے کی کبھی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ جہاں جاتی اس کے گورے چٹے رنگ، کھڑے سرو جیسے قد اور پتلی کمر کو دیکھ کر سارے کام آپی ہو جاتے...... پر اب تو اس کے سارے لچھن جھڑ گئے تھے۔ مری مری چھپکلی کی رنگت والی غلام زہرہ کے ہاتھوں پر نیلی

رگوں کا جال نظر آنے لگا تھا۔ اب لڑائی باندھے لڑھکتی پھرتی تھی سامنے کوئی دشمن آتا ہی نہ تھا۔

"ابا تو نہیں سمجھے گا بات میری...... بس ہے اس کے دل میں چور......"

باپ جوانی میں گنجفہ کھیلا کرتا تھا لیکن جب سے غلام زہرہ کی ماں فوت ہوئی اس نے سب انٹ شنٹ چھوڑ دیا۔ کبھی کبھی دل میں سوچتا اگر میں غلام زہرہ کی ماں کی زندگی میں یوں نمازوں کا پابند ہو جاتا تو وہ کتنی سوکھی مرتی۔ اس کے جیتے جی تو زندگی گود پسارے لالچ پر لالچ دے کر اُسے نئے تجربوں پر اکساتی رہی۔ کبھی کوئٹہ چلا گیا کبھی کراچی...... دو سال فوج کی نوکری میں رہ کر بیرکوں میں بھی کاٹ آیا تھا۔ اُسے تبدیلی کی اتنی ضرورت اور خواہش رہتی تھی کہ ٹِک کر کبھی کوئی کام ہی نہ کیا لیکن جنتے نے کفا جفا کر کے ساتھ نبھا دیا۔

"اوئے کسی بدکی اولاد...... تیری ماں نے مجھ جیسے پھرتو کے ساتھ نبھا دی اس کوّے اڑانی کے منہ پر کبھی کوئی رنڈی رونا آیا ہی نہیں...... تجھ سے کیا کہوں ساری عمر بیٹے کے لیے ترستی رہی پر کسی سے ذکر نہ کیا...... تجھے کوئی غم ہی نہیں اور تو مشٹنڈی فقیر محمد جیسے گئو سے طلاق مانگتی ہے' کلیش لگانا چاہتی ہے خاندان کو بات کیا ہے آخر؟"

اب غلام زہرہ اسے کیا بتاتی کہ اس کے اور فقیر محمد کے درمیان کچھ تھا ہی نہیں گلہ کس بات کا کرتی' نہ وہ ہم سخن تھے نہ ہم خیال...... نہ ان کا کھیس تکیہ ایک تھا نہ منجی پیڑھی...... غلام زہرہ تو فقیر محمد کے تعاقب میں راتوں کو گھوم گھوم کر تھک گئی' وہ کہاں تک سائے کے ساتھ سایہ بنی رہتی اسی بھوں بھاں میں اسے قبرستان کی قبریں تک حفظ ہو گئی تھیں۔

خانقاہ سے ملحق گاؤں کا قبرستان ابتر حال جنگلی جھاڑیوں سے آباد مٹی سے لدے الجھے الجھے پتوں والے درختوں کی آماجگاہ نہ دن کو کبھی آباد نظر آتا نہ رات کو۔ یہاں کچھ پکی قبروں کے احاطے تھے جن میں نمبردار' جاگیر دار' بڑے بڑے رقبے والوں کی قبریں تھیں۔ ان ہی قبروں سے ہٹ کر تین کھجوروں والا ایک پرانا سا تکیہ تھا۔ اس چار دیواری کے اندر کسی قلندر کی قبر تھی' گاؤں والے اب فقیر کو بھول چکے تھے لیکن اب بھی ایک پھٹا پرانا سبز جھنڈا یہاں لہرایا کرتا۔ دن کے وقت لوگ کبھی کبھی اس پکی قبر پر پھول چڑھاتے' لیکن اندر کوٹھڑی بے آباد تھی۔ یہاں بلّیاں رہتی تھیں اور گاؤں

والے کہتے تھے کہ اگر کوئی اس کوٹھڑی پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا تو یہ بلّیاں رات کے وقت چڑیلیں بن کر ایسی حملہ آور ہوتیں کہ کوٹھڑی چھوڑنا پڑتی۔ پیر بلّی والے سے کئی کہانیاں وابستہ تھیں۔ ایک وقت تھا یہاں بے اولاد عورتیں منّتیں مانتیں اور منت پوری ہونے پر اپنا موباف چھوٹی دیوار کی اینٹوں سے باندھ جاتیں۔ مرد مقدمے' نامردی' قرضے' بیروزگاری کے لیے دعائیں مانگنے آتے اور مراد پوری ہونے کی صورت میں چراغ روشن کر کے قبر پر دھر کر چلے جاتے۔ رفتہ رفتہ کچھ لوگ بلیوں کے لیے دودھ بھی لانے لگے اور پیر بلّی والے کی بلّیاں رفتہ رفتہ موٹی اور متبرک ہوتی چلی گئیں...... لیکن رات کے وقت کوئی اس قبرستان کا رُخ تک نہ کرتا۔ بلکہ اب تو دن کو بھی کسی کا رخ ادھر نہ ہوتا۔

اُس رات چاند آسمان میں گول مچھلی کی طرح لٹکا ہوا تھا' اپنے معمول کے مطابق فقیر محمد گھر سے نکل کر کچے راستے پر رواں ہو گیا اس کی تہمد کا پچھلا سرا مٹی میں گھسٹتا جاتا تھا اور اس کے لمبے بال کندھے پر اوپر نیچے ہلتے تھے' غلام زہرہ نے ہمیشہ کی طرح اس کا پیچھا کیا وہ بھول گئی کہ اس کا چھوٹا سا بچہ کوٹھڑی میں اکیلا تھا اور سانپ سپونگڑے کی بہار تھی۔ وہ جانتی تھی کہ فقیر محمد کی زندگی میں وہ دخیل کار نہیں پھر بھی اڑنگا دینے سے باز نہ آتی تھی۔

ہولے ہولے سائے کے تعاقب میں وہ قبرستان کی طرف کھسکتی چلی گئی۔ قبرستان کے اردگرد کوئی دیوار نہ تھی۔ ٹبے ٹوئے بہت تھے۔ زیادہ قبریں کچّی تھیں۔ پکی قبروں کی اینٹیں اُتر کر جابجا پھیلی تھیں۔ مسلسل بارشوں نے کئی قبروں کو زمین میں دھنس جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

خودرو کیکر' جابجا جُھنڈ سے بنے کھڑے تھے۔ کچھ قبروں پر گیندے کے باسی پھول اور پانی کا چھڑکاؤ بھی نظر آتا تھا۔ غلام زہرہ اس آؤٹ آف فوکس قبرستان میں داخل ہوئی تو دو نیولے اس کے سامنے لہرا کر ایک قبر میں گھس گئے' خوف کا مقام تو تھا ہی لیکن غلام زہرہ کو اس بات کی تسلی تھی کہ اس کے آگے آگے کچھ فاصلے پر فقیر محمد قبروں میں راستہ بناتا چل رہا تھا۔ تکیے کے پاس پہنچ کر فقیر محمد رُک گیا اور تین جھونجھ شکل کھجوروں کے پاس پہنچ کر اس نے دونوں ہاتھ خانقاہی فقیر کی طرح آسماں کی طرف اٹھا لیے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ کچھ دیر بعد یہ سسکیاں اونچی

ہوتی گئیں اور غلام زہرہ سے فقیر محمد کا رونا برداشت نہ ہو سکا...... وہ اس جھاڑ کنڈ سے سرپٹ بھاگنے لگی۔

"کیوں سبزی پیتا ہے فقیرا......" مرید حسین نے سوال کیا۔

"ناں ابا ناں...... کوئی نشہ نہیں کرتا فقیر محمد...... بس ایک نشہ لگ گیا ہے اسے، سارے نشوں سے آگے...... نہ وہ چھوٹتا ہے نہ میری جان چھوٹتی ہے......"

"کونسا نشہ...... بتا تو سہی میں نے اس جہنمی سے بدلہ نہ لیا تو میرا نام بدل دینا" جھرجھری آواز میں غلام زہرہ کا ابا بولا۔

غلام زہرہ کا بیٹا جمیل اب تو دس سال کا تھا پر تب وہ نیا نیا سکول داخل ہوا تھا۔ اس کی تختی گاچنی میں کچھ دیر غلام زہرہ مصروف رہی لیکن فقیر محمد کی آگ جب بھی پھرولتی اندر سے لالوں لال نکلتی' اس کی ندی کے کڑاڑے ٹوٹ ٹوٹ کر بہہ گئے' اب کوئی کشتی اس کے پانیوں میں نہ بہہ سکتی تھی نہ اس کے ساحل سے بندھ سکتی تھی۔

"فقیر محمد کہاں جا رہا ہے تو؟"

"میں ذرا ایمن آباد تک جاتا ہوں۔ ایک دو دن میں لوٹ آؤں گا۔ تجھے اگر ڈر لگتا ہو تو ماسی ہاجراں کے گھر جا پڑ میں اسے کہہ آیا...... ہوں۔"

غلام زہرہ کو نہ جانے کیا سوجھی وہ چارپائی سے چیتے کی طرح اُچھل کر فقیر محمد کے آگے کھڑی ہو گئی۔

"وہاں تیرا کون ہے ایمن آباد میں...... کیا کام ہے تیرا......"

"کام نہیں ہے غلام زہرہ...... کھوج ہے مجھے...... میں تلاش کرنے جا رہا ہوں...... سچے پیر کو...... جو مجھے اس سے ملا دے...... میں وسیلہ ڈھونڈتا ہوں اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا...... میں ٹھوکریں کھا کھا کر ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں۔"

"میرے ہوتے ہوئے تجھے کونسی کھوج نے گھیر لیا ہے خصماں نوں کھانی نے...... اللہ کی مہربانی سے جمیل تختی لکھنے لگا ہے' کچھ سالوں میں تیرے ساتھ ریڑھی لگانے چل نکلے گا...... بتا ناشکرے اور کیا چیز لوڑی ہے تجھے؟"

فقیر محمد نے لمبی سانس بھری اور زخمی پرندے کی طرح جھول کھا کر بولا......

"ایویں جھگڑا نہ نکال غلام زہرہ...... سنا ہے ایمن آباد میں جو سچا پیر ہے حرص وطمع سے نکال کر ادھر کا راستہ دکھا دیتا...... سب پاپ جھڑ جاتے ہیں...... آدمی سچا اور سُچا ہو جاتا

ہے۔

"کدھر کا راستہ کونسا راستہ؟......" چوہدرانی نے سوال کیا۔

"راستہ تو برسوں ادھر شناخت کر لیا تھا' اس مارگ پر چلانے والے کی تلاش ہے......"

"تو نہیں جا سکتا اس راستے پر میرے جیتے جی...... میں جان پر نہ کھیل جاؤں...... تو جمیل کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا...... میں رانڈ ہو جاؤں یا طلاقن پر تیرے جیتے جی میں جمیل کو بن باپ کا نہ ہونے دوں گی کملیا۔"

"میں کونسا ساری عمر کو جاتا ہوں غلام زہرہ......"

وہ سوچوں سے سنا گئی تھی' اونچی ہچکی میں آواز بدل گئی...... "میں تیرے پاؤں پڑتی ہوں...... فقیر محمد باز آجا...... باز آجا سونیا...... ان چکروں میں کچھ نہیں پڑا...... کس کی تلاش میں یوں مارا مارا پھرتا ہے؟ وہ کسی سے ملا کبھی نظر آیا کسی کو سینے سے لگایا کبھی اس نے...... فقیر محمد چپ ہو گیا...... بڑی دیر بعد بولا...... "اوپر والا ڈاہڈا ہے غلام زہرہ...... نہ دکھائی دے نہ سنائی دے...... سونا چاہوں تو کان میں مچھر بن کر بھنکتا رہے...... میں تو مرنے کو بھی تیار ہوں غلام زہرہ جو کہیں سچا پیر وعدہ کر لے ملانے کا......"

اس کے بعد کئی سال گزر گئے۔

غلام زہرہ اور فقیر محمد کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے...... املی آلو بخارا بیچنے والے کی مسافتیں لمبی ہو گئیں...... ان دونوں کے درمیان ہو کا عالم پھیلتا گیا۔

"میں خود اسے سمجھالوں گا دیکھتی نہیں جمیل دس برس کا ہو گیا' اس عمر میں بیٹے کو باپ کی ضرورت ہوتی ہے جھک جھکوری۔ کل سویرے ہی پہنچا آؤں گا فقیر محمد کے پاس اس کے بیٹے کو۔" مرید حسین بولا۔

"ناں ناں بس ابا بس کئی سال سوتیاڈاہ میں جل لیا۔ کئی سال اَن دیکھی سوتن کے سنتاپ میں جی لیا۔ اب جان ساتھ نہیں دیتی تو مجھے طلاق لے دے فقیر محمد سے' میر چنگے ابا اب اور جیا نہیں جاتا ایسے۔"

"کونسی سوکن؟ کیسی سوتیاڈاہ ہے نا کملی۔"

"اس نے اللہ سے دل لگا لیا ہے ابا...... اب کہاں وہ زورا ور کی کشش کہاں

بد رنگی زہرہ......ناں ابا تو نہیں سمجھتا جس کی سوکن رب بن جائے اس کی کیا چلنی ہے' میں نے ڈاہڈے سنگ پریت لگائی ابا پر اوپر والا تو ہر ڈاہڈے سے ڈاہڈا ہے...... میں لڑوں تو کس سے 'منہ نوچوں تو کس کا' گالی دوں تو کسے ابا...... ایسی سوتن سے میں کیا نپٹوں گی ابا گوشت پوست کی ہاری بچاری ہوتی تو اور بات تھی۔

"کفر کے کلمے نہ بول غلام زہرہ منہ سنبھال کر بات کر......"

"تو نہیں جانتا ابا...... رب اور میرا پرانا بیر ہے...... جنت سے چلا آتا ہے وہاں ایک بار بابا آدم نے اللہ کے حکم کو چھوڑ کر مائی حوا کی مانی تھی تب کا غصہ ہی ختم نہیں ہوا تیرے رب کا ناں ابا...... ناں تو مجھے طلاق لے دے فقیر محمد سے۔ کوئی زنانی ہوتی کوئی پنو ہوتی تو مقابلہ بھی ہوتا...... میں پڑی رہتی یا مار' مر جاتی...... پر اتنے زورا ور سے میرا کیا جوڑ...... فقیر محمد تو اس کا ہو چلا...... اس کا کیا کام مجھ جیسی پھوکٹ عورت سے...... ناں ابا ناں...... میں اس سوکن کا مقابلہ نہیں کر سکتی...... تیرے پاؤں پڑوں مجھے طلاق لے دے...... ہو جانے دے فقیر محمد کو اس کا...... سارے کا سارا اسی کا ہو جانے دے کہیں اوپر والے کو غصہ لگ گیا تو جانے پھر کیا سزا دے غلام زہرہ کو...... ناں ابا ناں...... میرے پاس کوئی گندم کا دانہ نہیں اسے کھلانے کے لیے پھر...... وہ میرے ہاتھوں سے کھاتا بھی کب ہے؟...... ابا...... اس ڈاہڈے رب کی قسم جس نے فقیر محمد کو مجھ سے چھینا مجھے آگ سے نکال...... مجھے طلاق لے دے ابا...... میرے ابا وہ میرے فقیر محمد کو رہا نہیں کرتا...... تو ہی مجھے فقیر محمد سے رہائی لے دے...... میں اس روز روز کی موت سے تو نہ مروں ابا...... مجھے طلاق لے دے ابا...... تجھے تیرے ڈاہڈے رب کا واسطہ طلاق لے دے۔ اپنی فقیرنی غلام زہرہ کو۔"

اسباقِ ثلاثہ

کسیلے گھاس کی دھونی اس کے حلق میں تھی اور آنکھوں سے آنسو بے ساختہ بہہ رہے تھے۔ اُلٹا لٹکے رہنے کے باعث غلام رسول کی آنکھیں سُرخ تھیں وہ صرف قمیض پہنے ہوئے تھا اور کمر سے نیچے اس کے تن پر کوئی کپڑا نہ تھا۔

"سرکار...... میں قصوروار ہوں...... یہ میں مانتا ہوں لیکن ہیجڑا نہیں ہوں حضور......"

"پھر وہی بات...... مرغے کی وہی ایک ٹانگ...... لٹکاؤ الٹا اور طبیعت صاف کردو......"

"ایک بار صرف ایک بار سرکار...... آخری بار میری بات تو سن لیں......"

"لمبی بات کی...... تو پھر دھونی دیں گے جلدی جلدی بتاؤ اور اگر اپنی صفائی میں جھوٹ بولا یا غلط کلامی کی تو یاد رکھنا ہم جن نکالنا جانتے ہیں......"

"ناں سرکار یقین جانیں میں قصوروار ہوں۔ غلطی مجھ سے ہوئی ہے...... لیکن میرا ارادہ اتنی بڑی غلطی کا نہیں تھا جناب عالی...... اچانک...... جیسے فلم میں انسان امریکہ پہنچ جاتا ہے' گاڑیوں میں پھرتا ہے' میموں کے ساتھ شغل کرتا ہے ایسے ہوا...... میں خود اپنے اندر چھپے ہوئے شیطان سے واقف نہیں تھا سرکار۔ میرا سایہ اتنا قریب تھا یہ تو مجھے علم ہی نہ ہو سکا۔"

بیگم صاحبہ کے سرکار مجھ پر بڑے احسانات ہیں جب پچھلے سال میری بیوی بیمار ہوئی تو پورے پانچ ہزار میرے ہاتھ میں پکڑا کر بیگم صاحبہ بولیں"...... یہ لو پانچ

ہزار اگر کچھ اور کی ضرورت پڑے تو فون کر دینا......" انہوں نے اپنے ہاتھ سے نمبر لکھ کر دیا۔ ہماری بیگم صاحبہ بہت اچھی ہیں سرکار دل کی بڑی نرم ہیں...... میرے اندر خدا جانے کب کی ناشکر گزاری چلی آ رہی ہے؟ اللہ کی بھی اور بندے کی بھی۔

"ہوں...... تم حرام زادے ہو...... اوّل درجے کے......"

"نہیں سرکار میں حرام زادہ بھی نہیں ہوں آپ میرے گاؤں چل کر پوچھ لیں سب اس بات کی گواہی دیں گے کہ غلام رسول دل کا نرم اور ہاتھ کا سخی ہے......"

غلام رسول سوچ میں پڑ گیا...... آج تک وہ اپنے آپ کو ایک اچھا انسان ہی سمجھتا آیا تھا۔ باورچی خانے کی چھوٹی موٹی چوری کے علاوہ اس نے کوئی بڑی بددیانتی نہ کی تھی۔ مکھن ملائی، کیک بسکٹ نگاہ بچا کر کھا لینا۔ وقت بے وقت چائے بنا کر پینا...... اپنے لیے پراٹھے تل کر کھانا، پھل کی باسکٹ سجاتے وقت تھوڑا بہت منہ مار لینا...... لیکن دوسرے خانساموں کی طرح اس نے کبھی بازار میں خرید و فروخت کے وقت نہ کمیشن لی تھی نہ ہی سودے میں سے پیسے بچائے تھے۔ جب کبھی وہ باورچی خانے سے نکلتا خالی ہاتھ نکلتا۔

بیگم صاحبہ کے پاس آنے سے پہلے دو تین کوٹھیوں میں خانساماں گیری کر چکا تھا اور ان تین خوشحال گھرانوں میں رہ کر اس نے تین سبق سیکھے تھے۔ پروفیسر صاحب کے گھر میں علم و فضل کے دریا بہتے تھے۔ ہر وقت دانشور، اہل قلم، اخباروں کے نمائندے جرنلسٹ اور پڑھنے کو اوڑھنا بچھونا سمجھنے والے پڑھاکو طالب علم آتے رہتے۔ پروفیسر صاحب کی بیگم اس مہمان داری کے کمپلسری سبجیکٹ سے بہت کھجتی تھیں لیکن ساتھ ساتھ یہ ان کے گھر کا طرۂ امتیاز بھی تھا کہ گھر کی چوکھٹ پر ناصیا فرسا قسم کے لوگوں کا کٹھ رہتا۔ پروفیسر صاحب کے علم و فضل کا دبدبہ دور دور پھیلا تھا۔ وہ کتابوں کے اس قدر رسیا تھے کہ رات گئے تک ان کے بیڈ لیمپ کی روشنی جلتی رہتی اور جتنی بار غلام رسول اٹھ کر باہر جاتا وہ کھنکار کر ان کی کھڑکی کے پاس سے گزرتا تاکہ انہیں پتہ چل جائے صرف غلام رسول آ جارہا ہے۔

پروفیسر صاحب غلام رسول سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ وقت بے وقت چائے بنا کر ان کی اور مہمانوں کی تواضع کرتا۔ بیگم صاحبہ بچوں میں مشغول رہتیں اور رزق کم ہونے کی وجہ سے خست اور احمق پن سے گزارہ کرنے کو سگھڑپن شمار کرتیں۔

ان کا بڑا بیٹا فسٹ ایئر کا طالب علم تھا اور نئے نئے پر پرزے نکالنے کی وجہ سے غلام رسول کو کبھی کبھی تھپڑ گالی سے بھی نواز دیتا لیکن غلام رسول نے ان چھوٹی چھوٹی فرسودہ باتوں کا بُرا نہیں منایا وہ جانتا تھا کہ چاکری میں دل کشادہ رکھنا پڑتا ہے۔ اگر انسان عزت بے عزتی کے مسئلوں میں پڑ جائے تو پھر نوکری چھوٹ جاتی ہے۔ پروفیسر صاحب کی دونوں بیٹیاں چھوٹی تھیں۔ غلام رسول نے انہیں نیم کے درخت پر جھولا ڈال دیا تھا۔ سارا دن ان کا اسی کے گرد کٹتا تھا۔ غلام رسول کے ساتھ انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔

بیگم صاحبہ سارا دن باورچی خانے میں گھسی رہتیں انہیں پکانے کی ترکیب بتانے کا بہت شوق تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ غلام رسول سے بہتر باورچی ہیں۔ اسی لیے ڈوئی چلانا، نمک مرچ چیک کرنا، بوٹی کی گلاوٹ دیکھنا، چپاتی کو توے پر الٹ دینا ایسے آن گنت کام کرتے رہنا جن سے وہ مشغول نظر آئیں ان کے دن بِتائی کے طریقے تھے۔

سرکاری رہائش میں غلام رسول کو دوسرا سال تھا جب اچانک غلام رسول میں ایک تبدیلی آ گئی...... ریڈیو باورچی خانے میں ہمہ وقت رواں رہتا۔ جب سارا خاندان ٹیلی ویژن دیکھتا وہ بھی باورچی خانے سے فارغ ہو کر پائیدان کے پاس جا بیٹھتا۔ پانچویں پاس تھا پروفیسر صاحب سے اخبار رسالے لے جا کر کوارٹر میں پڑھتا...... جب بہت زیادہ انفارمیشن غلام رسول کے کمپیوٹر میں فیڈ کر دی گئی تو اچانک اسے زبان لگ گئی...... پہلے تو وہ موقع محل دیکھ کر بات کرتا تھا پھر ہولے ہولے فیملی کی باتوں میں دو چار لطیفے اور حاضر جوابیاں موقع محل کی مناسبت سے ٹھونک کر اسے اندرونی سرکل میں جگہ مل گئی۔ سب اس کی باتوں سے ایسے محظوظ ہوتے جیسے بندر کا تماشہ دیکھ رہے ہوں۔ اب جب کبھی پروفیسر صاحب سے اہلِ دانش، ادیب، جرنلسٹ ملنے آتے تو غلام رسول ضرور چائے پلاتے وقت طرح مصرع پیش کر دیتا۔ پروفیسر صاحب اردو کے ایک اخبار میں بڑا مقبول کالم لکھتے تھے۔ اس اخبار کی سرکولیشن لاکھوں میں تھی اسی تناسب سے پروفیسر صاحب کے قاری بھی تھے۔ کالم والا اخبار رول کر بغل میں داب پروفیسر صاحب اپنی ایم-اے معاشیات کی کلاس لینے جاتے تھے۔ اس طرح جگہ جگہ کالم کی تعریف وصول کرنے میں انہیں سہولت بھی رہتی۔

غلام رسول کبوتروں کے ڈربے سے نکل کر اونچی اڑانیں لینے لگا۔ تاڑ کا سا قد متناسب جسم، کھلی کھلی آنکھیں، سوپر مین سی تیزی، غلام رسول بڑی بڑی زبانیں بولنے

لگا۔ جب گاؤں سے نیا نیا آیا تھا تو پروفیسرنی صاحبہ کو لگتا پیپل تلے کا بُھتنا ہے۔ اب اس کی حیثیت پیر مغاں کی سی ہو گئی۔

اس روز پروفیسر صاحب کے گھر میں پریس کانفرنس قسم کی کوئی محفل تھی۔ چند ہفتے پہلے پروفیسر امجد نے کچھ ایسی باتیں اپنے کالم میں لکھی تھیں جن پر بڑے دھڑے کی لے دے ہو رہی تھی۔ چند اخباروں کے نمائندے چھوٹے سے سرکاری بنگلے کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ دو کیمرہ مین سٹل تصویریں کھینچ رہے تھے جب غلام رسول چائے کی ٹرالی لے کر اندر داخل ہوا پھر اسی اخبار کے باعث پروفیسر امجد اپنی اہمیت سے اتراتے ہوئے بلا خوف و خطر بازو' ہاتھ 'گردن آنکھیں سارے جسم کو بروئے کار لاتے اپنے نظریئے بیان کر رہے تھے۔

"ہماری فلاح اسی میں ہے کہ ہم جمہوریت کو اپنائیں اور سچے دل سے اس کی پیروی کریں......" ایک نمائندے نے ذرا سا آگے ہو کر پوچھا۔ "سر تیسری دنیا میں خواندگی کم ہے...... غریبی نے ہمارا بُھرکس نکال دیا ہے۔ طبقاتی معاشرہ ہے...... جوائنٹ فیملی سسٹم' برادری سسٹم میں سوسائٹی بٹی ہے۔ کیا ایسی صورت میں بھی جمہوریت ہی کا ساتھ دینا ہو گا...... جمہوریت اور پھر جمہوریت اور پھر جمہوریت......" پروفیسر غرائے "جمہوریت ہمارا واحد علاج ہے لیکن جہاں تعلیم عام نہ ہو...... وہاں ووٹ کون دے اور کیوں دے اور پھر ووٹ کی ان پڑھ آدمی کے ووٹ کی حیثیت کیا ہو؟"

پتہ نہیں غلام رسول پر کیا گزری وہ چائے کی پیالی چھوڑ کر بڑے اعتماد سے آگے بڑھ کر بولا۔ "سرکار...... جمہوریت نہیں چلے گی تیسری دنیا میں...... جب تک مساوات نہ ہو جمہوریت کا بوٹا کیسے لگ سکتا ہے یہاں۔ ہمیں تو ایک شیر شاہ سوری دلا دیں جو کلکتہ سے پشاور تک سڑک بنا دے...... ہمیں تو ایک وڈیرا ایسا دلا دیں جو مزارعوں کا لہو نہ پئے ان سے انصاف کرے...... ہمیں جمہوریت نہیں چاہیے سرکار...... گائے بھینس بکریاں جمہوریت کا کیا بنا دیں گی سرکار ہمیں تو جدھر ہانک لے جائیں گے چلے جائیں گے۔ ہمیں تو ایک اچھا گڈریا لا دیں عالی جاہ جس کے دل میں ہمارا غم ہو ہم جمہوریت کا ڈھونگ رچا کر کیا لیں گے...... جمہوریت کا سرکار تعلیم سے نہیں مساوات سے تعلق ہے۔ آپ سچ مانیں جہاں ووٹ ہی برابر نہ ہوں وہاں جمہوریت کیسی؟ کیمرے مڑ کر غلام رسول کی تصویریں بنانے لگے۔ نمائندوں نے جلدی جلدی غلام رسول کی

باتوں کے نوٹ لینا شروع کر دیئے۔

پروفیسر امجد نے آنکھوں ہی آنکھوں میں غلام رسول کو لتاڑ کر باہر نکال دیا۔

رات کو جب باورچی خانے میں صاحب آئے تو غلام رسول اپنا پہلا سبق سیکھ چکا تھا......

"میں بے انصاف نہیں ہوں ورنہ تیری تنخواہ روک لیتا...... یہ لو اپنے پیسے اور یاد رکھو زبان کھولنے سے پہلے اپنا درجہ مقام ضرور پہچان لینا چاہیے...... اناڑی کی بندوق نہ بنو۔ آدمی بنو اپنی حیثیت پہچانو...... پاؤ ادھ پاؤ میری بھی غلطی ہے...... تم جیسے جوکر کی باتوں پر خوش ہوتا رہا...... اب سمجھ آئی کہ مور پنکھ لگا کر کوّا مور نہیں بن جاتا۔"

"منہ کھولنے سے پہلے سوچو کس سے بات کر رہے ہو' تم کون ہو اور وہ کون ہے؟ گٹ آؤٹ ایٹ ونس۔"

سرکاری بنگلے سے نکل کر غلام رسول کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے پروفیسر صاحب اور ان کا گھرانہ اپنا اپنا لگنے لگا تھا۔ گھر سے نکالتے وقت کسی نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ بھائی غلام رسول کیا تم بھی ہمیں چھوڑنا چاہتے ہو کہ نہیں......؟ ہاں اتنی بات اس کی سمجھ میں ضرور آ گئی کہ برابر کی بات کرنے کے لیے بھی جمہوریت کی نہیں مساوات کی ضرورت تھی اور ابھی...... مالک اور نوکر برابر نہیں تھے۔

یہ نوکری بلا وجہ چھوٹ گئی اس کی حماقت کی وجہ سے۔ چھ مہینے بڑی عسرت اور بیکاری میں گزرے۔ پھر اُڑ جھنبھیری ساون آیا...... غلام رسول ان دنوں ایک بہت بڑی کوٹھی میں مزدوری کر رہا تھا جب اچانک اس کی ملاقات کوٹھی کے مالک سے ہو گئی...... مالک آرکیٹیکٹ کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا "میں بڑی مشکل میں ہوں آج کل...... بیگم صاحبہ یورپ گئی ہوئی ہیں اور خانساماں اچانک بھاگ گیا ہے۔"

اس وقت غلام رسول نے آگے بڑھ کر عرض کی...... "سر میں خانساماں ہوں میرا باپ بھی کرنل ہاکنز کا خانساماں تھا۔ جب کرنل ہاکنز ریٹائر ہو کر لندن گیا سرکار تو میرا ابّا بھی ساتھ گیا تھا۔ پر دل نہیں لگا واپس آ گیا۔ سات کورس کا کھانا اکیلا پکا لیتا ہے جناب عالی بغیر مسالچی کے سر۔"

ملک صاحب اسے کار میں بٹھا کر اپنے ساتھ گلبرگ لے گئے۔

جن دنوں وہ دیہاڑی کرنے ڈیفنس والی کوٹھی جایا کرتا تھا تو وہاں ملک صاحب کے متعلق ٹھیکیدار' مستری اور مزدور لوگ بڑی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ملک صاحب

حال ہی میں اکیسویں گریڈ میں ریٹائر ہوئے تھے۔ ان کی دو کوٹھیاں گلبرگ میں اور یہ تیسری ڈیفنس میں بن رہی تھی۔ واسا میں ڈائریکٹر رہے تھے اور لمبا ہاتھ مارا تھا۔ رشوت اتنی دھڑلے سے لیتے تھے کہ سارے عملے کو خبر تھی لیکن کوئی منہ سے بات نہ نکالتا تھا۔ ملک سے باہر کئی بینکوں میں اکاؤنٹ تھے۔ فرانس میں دو شاندار ولا اور لندن میں ایک اپارٹمنٹ عموماً کرائے پر چڑھے رہتے۔ وہ کہا کرتے کہ تیسری دنیا میں صرف دولت کام آتی ہے۔ یہاں نہ میرٹ راستہ کھولتا ہے نہ شرافت نجابت...... بس ہتھیلی گرم کرنے سے کھل جا سم سم کا اثر ہوتا ہے۔ جب غلام رسول نے اپنی تنخواہ سنی تو اسے چکر سا آ گیا۔ سترہویں گریڈ میں پہنچ کر اس نے دل میں سوچا کہ واقعی دیر آید درست آید......

بڑی تڑپراہٹ کے ساتھ بڑی تیزیوں کے ہمراہ اس نے اپنی اہلیت دکھانا شروع کر دی پہلے اس کے کھانے سادہ اور سروس معمولی تھی۔ اب اس نے چائنیز، کونٹی نینٹل فوڈ اور پیکنگ بھی سیکھ لی۔ بجی بنانے کا بھی ماہر ہو گیا۔ گھر کے پچھواڑے تندور میں خمیری، فطیری روٹیاں لگاتا۔ اس کے نان، کلچے پراٹھے دور دور مشہوری پا گئے۔ اس قدر اعلیٰ خانساماں، تس پر سارا گھرانہ اس کی خاموشی کی تعریف ہر ملنے ملانے والے سے کرتا......

آپس میں سارا خاندان اسے Jewel پکارتا۔ اس بجھے کاگ کی مثال دوسرے ملازموں کو دے کر ڈرایا جاتا، ان کی کارکردگی کو ڈاؤن گریڈ کیا جاتا۔ غلام رسول یا تو فوج کا بیٹ مین لگتا یا پھر کسی انگریز کا ملازم...... وقت کی پابندی، کام کا سلیقہ، صفائی ستھرائی بہت سی خوبیاں غلام رسول میں تعریف ہی سے پیدا ہو گئیں۔

لیکن اس قدر سمپورن خانساماں میں بھی ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ جس طرح کبھی کبھی ثابت سموچہ خوش رنگ سیب اندر سے خراب نکلتا ہے ایسے ہی بیگم صاحبہ پر غلام رسول ایک بھٹ بھیڑیا ثابت ہوا۔ رات کھانے سے فارغ ہو کر کوارٹر میں ڈیزرٹ کولر لگا کر سٹیل چارپائی پر بیٹھا غلام رسول نماز پڑھ رہا تھا۔ رات کے ڈنر پر دس بارہ مہمان بھی تھے جنہوں نے خانساماں کے پکیرے کی بہت تعریف کی تھی۔ ایک صاحب تو چند تندوری پراٹھے پیک کروا کر ساتھ بھی لے گئے تھے۔ اسی وقت بیرا جمیل داخل ہوا اور عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا...... "نماز پڑھ کر اندر چلے جانا بیگم صاحبہ نے فوری طلب کیا ہے......"

پیچ چکر لیے انداز میں بیرے نے بات کی جس ترنت طریقے سے وہ پلٹا غلام

رسول کو تھوڑی سی سنک تو لگ ہی گئی لیکن وہ سمجھ نہ سکا کہ اس نے کہاں ٹھوکر کھائی، کونسی حرکت سے خط ضامنی کو پار کیا۔ پھر نماز ختم کر کے عافیت کی دعا مانگی کیونکہ اتنی اچھی نوکری پا کر وہ بھی بزدل ہو چکا تھا۔ آسائش نے اسے بودا کرنے میں کسر نہ چھوڑی تھی۔ باورچی خانے میں جوتی اتار کر وہ قالینوں پر چلتا، دروازے آہستہ آہستہ بند کرتا، گھٹنے سے گھٹنا ٹکراتا بیگم صاحبہ کے پرائیویٹ ڈرائنگ روم میں پہنچا۔

بیگم صاحبہ بھاری کندھے اور ڈھلے کولہے والی خاتون تھیں۔ ان کا چہرہ ازبکی، ہاتھ پاؤں فرانسیسی اور آواز پنجابی تھی۔

"سلام علیکم سر......"

بیگم صاحبہ کچھ پڑھنے میں مشغول تھیں ان کے ہاتھ میں گھروں کی سجاوٹ بڑھانے والا ایک ضخیم رسالہ تھا۔ معمول کے مطابق وہ سلام کرنے کے بعد خاموش ہو گیا۔ چند منٹ بیگم صاحبہ نے بڑی جانچ پڑتال کی خاموشی اختیار کی پھر بڑے اہتمام سے رسالہ بند کیا۔ دونوں ہاتھ گود میں رکھے اور محاسبے کی آواز میں بولیں...... "مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی غلام رسول......"

خانساماں نے منمنا کر جی سر کہا۔ وہ ابھی تک سمجھ نہ پایا تھا کہ مواخذہ کیوں، کیسے اور کس لیے کیا جا رہا ہے......؟

"میں تو سوچ بھی نہیں سکتی کہ تم اتنے میسنے اور کمینے ہو......" بازپرس کی اصلی وجہ ابھی تک غلام رسول پر نہ کھلی۔

"تم سمجھتے تھے اُلّو کہ مجھے خبر ہی نہ ہو گی۔ حرام زادے تم چوری چوری بالائی آمدنی بناؤ گے اور مجھ تک بات ہی نہ پہنچے گی چور آدمی تم سو مرتبہ رازداری سے پیسے بناؤ۔ مالک کو لوٹے جاؤ تمہارا کیا خیال ہے کبھی بھید نہیں کھلتا......"

وہ پھر لیس سر کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"کل میں پھل والے کے پاس گئی تو...... مجھے پتہ چلا کہ انگور تو ساٹھ روپے کلو ہیں تم نے مجھے سو پیہ کلو لکھوائے۔"

"جی سر غلطی ہو گئی......"

"اب تو ڈرائیور...... بیرا صفائی والی مریم سارے لوگ گواہی دیتے ہیں کہ تم نے ہر دکان پر کمیشن مقرر کر رکھی ہے...... تم کو ہم نے اتنی بڑی تنخواہ پر رکھا۔ ایسا کوارٹر

دیا جس میں ہیٹر، ڈیزرٹ کولر اور پنکھا لگا ہے...... استری مفت، گرم ٹھنڈے پانی کی سہولت موجود...... میڈیکل فری...... اور تم نے ہم کو ہی لوٹنا شروع کر دیا......"

غلام رسول کو اپنی نوکری کی آخری گھڑیاں نظر آ گئیں......

نظریں جھکا کر وہ شائستگی سے بولا...... "سر غلطی ہو گئی معاف کر دیجیے آئندہ سے یہ غلطی نہیں ہو گی۔"

"پاکستان کے عوام ہی سارے چور ہیں۔ اسی لیے اوپر کوئی درست آدمی نہیں آتا۔ حکومت کیسے چلے جب بے ایمانی کا یہ عالم ہو...... ہر چیز مل رہی ہے پھر بھی بے ایمانی سے باز نہیں آتے۔ اوپر کی آمدنی کا ایسا چسکا پڑا ہے...... ایسا چسکا پڑا ہے کہ منہ سے چھوٹتی نہیں...... میں تمہیں پولیس کے حوالے کروں گی۔ سوچتے کیا ہو۔ اس کے بعد بیگم صاحبہ نے اپنی شائستگی، تعلیم اور کلچر چھوڑ کر بے تکان گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ غلام رسول کو جب یقین ہو گیا کہ نوکری رہتی نظر نہیں آتی تو اس نے اس پوچھ پچھار سے حوصلہ پا کر کہا...... "بیگم صاحبہ...... ہم غریبوں کی کیا چوری؟...... لوگ تو بینک خالی کر گئے، پاکستان کی معیشت تباہ کر دی...... پہلے ان کا محاسبہ ہونا چاہیے...... ہم غریب کیا چوری کریں گے بیگم صاحبہ...... پہلے اوپر والوں کی خبر لیں...... بڑا مال تو انہوں نے لوٹا ہے۔ انہوں نے ہی غریب آدمی کو چوری کرنے کا حوصلہ دیا ہے۔ بیگم صاحب ہم تو اپنے بڑوں سے سیکھتے ہیں سر جی۔"

بیگم صاحبہ تو طیش میں بُھتنی بن گئیں۔ جھپاک سے اٹھ کر پورے ہاتھ کا وہ تھپڑ رسید کیا کہ غلام رسول اپنے جننے والی کو یاد کرنے لگا......

"تمہاری یہ جرأت! اتنی ہمت۔ الٹا ہمیں الزام دیتے ہو" پھر گالیوں کی بوچھاڑ......

"احمق! جیسے لوگ ہوتے ہیں ویسے حاکم ان پر مقرر کر دیئے جاتے ہیں۔ تم سمجھتے ہو صرف اوپر والوں کا قصور ہے۔ سارا قصور تم غریبوں کا ہے...... یاد رکھو...... چوری چوری ہوتی ہے لاکھ کی چوری اور روپے کی چوری ایک ہی بات ہے؟ خبردار جو اپنی معذرت میں زبان کھولی۔ تم لوگوں نے ہرے پاسپورٹ کی قدر کھوئی...... تم جیسے بے قاعدہ لوگوں نے ہمارے ملک میں بیرونی ممالک کا سرمایہ آنے نہیں دیا...... تم جیسے بدبختوں نے ملک کو قرضوں کے بوجھ تلے نڈھال کر دیا۔ تمہاری غریبی مٹانے کے لیے

حکومتوں کو دشمنوں کے ساتھ تجارت کرنی پڑتی ہے۔ تم جیسے عوام جس ملک کے ہوں اس ملک کی قسمت کیسے جاگ سکتی ہے؟ جس ملک کے عوام چور بے ایمان...... فریبی ہوں اس ملک کا کیا بن سکتا ہے؟...... اوپر کے لوگوں کو کیا دوکھنا دے رہے ہو؟ سارا قصور عوام کا ہے...... بے دین، بداخلاق، دکھ دینے والے ٹنٹے باز...... اس لیے نعرے لگائے تھے قیامِ پاکستان کے وقت۔ لوٹنے کے لیے مانگا تھا پاکستان"...... "دور ہو جاؤ میری نظروں سے...... میں تم جیسے ملک دشمن کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔ منشی جی کے ساتھ حساب کر لینا...... صبح نظر نہ آؤ مجھے...... گٹ آؤٹ ایٹ ونس...... نکلو باہر۔"

غلام رسول اس احتساب کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ ملک صاحب کی کوٹھی میں کسی سمراٹ کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ سارے نوکروں کا حاکم، اندر باہر کی چابیوں کا رکھوالا، ہر فون سننے پر قادر، صاحب اس کا متوالا، بیگم اس کی پکی ووٹ۔ یہ تو اچانک بے موسم کے اولے گرے۔ دنگ رہ گیا۔ صاحب سے معافیاں مانگیں۔ بیگم صاحب سے بار بار کہا کہ جو چور کی سزا وہی میری، ایک چانس اور دیں۔ بیگم صاحبہ کی ڈکشنری میں کوئی آئندہ درج نہ تھا۔ خلاصی پیشہ غلام رسول سے دبتے تھے اب انہوں نے بڑے بن کر تسلیاں دینا شروع کیں۔ دل میں پرسن اوپر سے مسمسے چہرے بنا کر وفد کی صورت بیگم صاحبہ کے آگے پیش ہوئے، معافی مانگی...... جب بیگم صاحبہ نے سب کو نکال دینے کا ارادہ ظاہر کیا تو منہ لٹکائے باہر سرونٹس کوارٹر میں آ رہے اور غلام رسول کو یہی مشورہ دیا کہ چپکے سے راستہ ناپنے میں ہی عافیت ہے۔

غلام رسول کوٹھی سے اس طرح نکلا جیسے کوئی راجہ بن باس قبول کرے اور جنگل سدھارے لیکن ایک بار پھر غلام رسول، قسمت کا دھنی نکلا۔ جس سٹور سے غلام رسول سودے خریدتا تھا اور سامان پر دس فیصدی کٹوتی وصول کرتا تھا، وہ اپنا چھوٹا سا صندوق اور گٹھڑی لے کر وہیں پہنچا۔ اس بار اس کا ارادہ گاؤں لوٹ جانے کا تھا۔ وہ کیک پیسٹری کے سیکشن میں اپنے گاؤں کا ایڈریس لکھوا رہا تھا۔ سٹور والا کافی مصروف تھا اپنی ڈائری میں نام پتہ لکھنے کے لیے اس کے پاس وقت نہ تھا لیکن غلام رسول نے اس سے ہزاروں روپے کی خریداری کی تھی، اس نے چار فون اور کئی سودے بیچنے کے دوران غلام رسول کا پتہ مکمل کر لیا۔ اس وقت مسز مہتاب شوخ و شنگ لباس میں داخل ہوئیں۔

دانش صاحب بڑے پولشڈ بینکر تھے۔ حکومت کے فنانس منسٹر ان کے ذاتی

دوست تھے وہ آئی ایم ایف کی میٹنگوں میں پاکستان کی معیشت سے متعلق پالیسیوں کا دفاع کرتے۔ بنیادی طور پر وہ وکیل تھے۔ ان کو بینک نے پہلے اوپریشن میں رکھا پھر فارن ایکسچینج میں مانجھا پھر Litigation کے ڈیپارٹمنٹ میں ان کی کلا جاگی...... چڑھتے چڑھتے وہ وائس پریذیڈنٹ ہوگئے۔ اب شہر کے تمام قابلِ ذکر وی آئی پی ان کے ذاتی دوست تھے۔ ان کا سوشل سرکل بڑے قابلِ ذکر صنعت کاروں' سیاسی لیڈروں اور دانشوروں کا گلدستہ تھا۔

جس وقت مسز مہتاب شام کی چائے کے لیے پیسٹری کیک منتخب کر رہی تھیں غلام رسول شیشے کا دروازہ پُش کر کے باہر نکلنا چاہ رہا تھا۔

"بھئی تم نے مجھے خانساماں تلاش کر کے نہ دیا...... بڑی تکلیف ہے ہمیں...... تمہیں پرواہی نہیں۔" اسی وقت غلام رسول کی قسمت نے آواز دے کر دربدری سے بچایا۔ چھوٹی ٹرنکی اور گٹھڑی ڈگی میں ڈال وہ بیگم مہتاب دانش کی کوٹھی پر راج ہنس کی طرح پہنچا۔ پہلی ہی پارٹی میں غلام رسول کی واہ واٹیسو کے پھول کا سا رنگ لائی۔ ایسا سلیقہ' سگھڑپن دکھایا کہ بیگم مہتاب نے رات کے وقت دانش صاحب سے کہا کہ پتہ نہیں آج تک ہمیں ایسا آدمی کیوں نہ ملا۔ یہ تو گویا کسی نیک کام کا اجر ہے۔ سارے رونے دُھل گئے۔ دوسرے دن دبے پاؤں غلام رسول کھانے کے کمرے میں دست بستہ آکھڑا ہوا۔ "سر میں اندر آسکتا ہوں؟" بیگم صاحبہ نے نظرِ تحسین سے دانش کی طرف دیکھا گویا وہ اس کے Manners کی تعریف کر رہی ہوں۔

"آجاؤ...... بھئی۔"

غلام رسول نے قریب آکر سارا حساب اور بقیہ ریزگاری بیگم صاحبہ کے پاس تپائی پر رکھ دی۔

"سر یہ چیک کر لیں......"

بیگم مہتاب دانش نے حساب دیکھا جمع جوڑا ریزگاری گنی اور پرس میں ڈال لی۔

"یہ حساب تم نے خود لکھا ہے......" غلام رسول نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پڑھے لکھے ہو؟......"

"جی سر! پانچویں جماعت تک......"

اس نے پروفیسر صاحب کے گھر ان گنت رسالے' کتابیں' اخباریں پڑھی تھیں۔ پھر مذاکرے مباحثے بھی کانوں سے گزرے تھے۔ وہ ڈگریوں سے تو ناآشنا تھا لیکن انفارمیشن کی حد تک اس کا کمپیوٹر سوفٹ ویئر سے بھرا پڑا تھا۔

"اچھا بھئی غلام رسول اب تم کو میری ذرا مدد کرنا ہوگی۔ جب تک سیکرٹری روما نہیں آتی آپ کو سارے فون بھی اٹینڈ کرنے پڑیں گے۔ میں ذرا اڈے والوں کے پاس جا رہی ہوں تم نیچے آفس میں بھی جھانکتے رہنا۔ آج صاحب اور میرا لنچ باہر ہے...... باہر ملازموں کے لیے بڑے گوشت کے دو پیکٹ نکال کر اس میں کچھ ڈال لو...... ہم رات کو سُوپ اور کچھ لائٹ فوڈ لیں گے......"

"جی بہتر......"

دانش صاحب کی کوٹھی چھ کینال میں پھیلی تھی۔ نچلے پورشن میں بیگم صاحب کا آفس' ڈرائنگ روم اور فارمل مہمانوں کے رہنے کے لیے ایک سوٹ آف رومز تھا۔ آفس کا بڑا کمرہ سامنے تھا جس میں بیگم مہتاب دانش ڈیزائینر کپڑے کمپوز کرتی تھیں۔ آفس سے ملحق کمروں میں درزی خانہ تھا۔ چار درزی اور ایک کٹر کچاکچ کپڑوں پر قینچی چلاتا تھا۔ ان کی چائے کا انتظام بھی نچلے پورشن میں ہی ایک چھوٹے سے کچن میں ہوتا۔ صرف سوپرویژن غلام رسول کرتا تھا۔

ایک روز غلام رسول دست بستہ بیگم مہتاب کے سامنے پیش ہوا۔

"سر وہ درزی خانے کے کچن کا دودھ بھی ختم ہے اور چائے کی پتی بھی۔ اس کے لیے کیا حکم ہے؟"

"تو تم خرید کر لادو غلام رسول اور دوسری بات یہ درزی خانہ نہیں ہے یہ مہتاب بوتیک ہے...... تمہیں معلوم ہے شہر میں میری بوتیک کے شوروم کتنے ہیں؟"

غلام رسول نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"دو شوروم تو گلبرگ میں ہیں۔ ایک پر Casual Wear بکتا ہے اور دوسرے والی میں فارمل کپڑے ہیں۔ ایک ڈیفنس پر شاپ ہے۔ ایک لنک روڈ کی سپر مارکیٹ میں...... ایک ماڈل ٹاؤن میں...... ابھی اس کی ایک برانچ اسلام آباد میں بھی کھلی ہے۔ سوائے جب ہم لوگوں کو Entertain کریں باورچی خانے کا کام زیادہ نہیں ہوگا۔ ہاں مہمانوں کی ٹرالی...... قہوہ' چائے' کافی...... یہ سب چٹکی بجنے پر حاضر کرنا

ہو گا۔ اس میں دیر نہ ہو۔ میں اور صاحب تو زیادہ تر باہر ہی کھانا کھاتے ہیں۔"

بیگم صاحبہ مومولے کی طرح تھیں ان کا جسم ہرنی کا' دماغ پارہ' حرکاتِ مشینی تھیں۔ گھر پر ہوتیں تو ٹریک سوٹ قسم کا لباس پہنتیں۔ اگر باہر سے آکر لباس تبدیل کرنے کا وقت نہ ملتا تو پیٹی کوٹ اور بغیر آستینوں کا بلاؤز پہن کر بھنبھیری کی طرح سارے گھر میں گھومتی پھرتیں۔ ڈریس ڈیزائنر ان کے پاس اوپر والے پورشن میں ہی آجاتا اور بیگم صاحبہ پیٹی کوٹ اور بلاؤز میں ملبوس اس کے پاس بیٹھ کر نئے لباس ڈیزائن کرتیں۔ رنگ میچ کرتیں۔ اس کے علاوہ فوٹو گرافر کا اوپر آنا جانا لگا رہتا۔ رسالے والوں کے نمائندہ لوگ بھی بلا روک ٹوک آتے جاتے۔ اس کام کو بیگم صاحبہ جس بڑے پیمانے پر کر رہی تھیں اس میں دو باتیں واضح تھیں ایک تو ان کے پاس وقت کی کمی تھی دوسرے وہ بلاوجہ جھجک' حیا اور فضول بناوٹی قسم کی شرم کو پسند نہ کرتی تھیں۔ ہر سال وہ اپنے کپڑوں کی نمائش کے لیے یا تو امریکہ جاتیں یا یورپ۔ اس نمائش کی تیاری میں انہیں مہینے درکار ہوتے...... اپنے کپڑوں کے اشتہاروں کے لیے انہیں ماڈل گرلز اور لڑکے بھی تلاش کرنا پڑتے جو گھر پر آکر ان کے لباس پہن کر تصویریں کھنچواتے۔ کئی ماڈل گرلز جنہوں نے شروع میں ان کے لباسوں کے لیے اشتہاروں میں کام کیا اب ٹی وی اور فلم کی قابلِ ذکر فنکارہ بن چکی تھیں۔

میڈیا اور لباس کی دنیا غلام رسول کے لیے نیو یارک سٹی کا سا گھراؤ تھا اس نے کبھی عورتوں کو کھلے بندوں سگریٹ پیتے' فحش لطیفوں پر ہنستے' بال لہراتے' کندھے اچکاتے' اپنے جسم کو نمائش کے لیے پیش کرتے نہ دیکھا تھا۔

غلام رسول کو یہ سب کچھ دل سے پسند آیا......

غلام رسول کو پتہ چلا کہ اصل میں وہ اسی ماحول کا اصلی تیراک تھا۔ وہ یہاں رہ کر اس قدر خوش تھا کہ اس سے پہلے ایسی خوشی کا کوئی خواب بھی اس کے ذہن میں نہ آیا تھا۔ نیچے درزی خانے میں جاتا تو فیشن کے رسالے گرم کڑک چائے اور شاندار گاہک خواتین سے ملاقات ہوتی۔ کچھ اپر کلاس کی بیگمات اپنی بیٹیوں کے پورے پورے جہیز مہتاب بوتیک سے بنوا رہی تھیں۔ وہ دفتر سے کھسکتی درزی خانے میں گھس آتیں۔ دو تین اڈے والے جو گیراج میں سلمیٰ' باولا' ستاروں کا کام کرتے تھے' کشیدہ کاری کے ماہر تھے ان سے اندرون شہر کی گوسپ بھی غلام رسول کو سننے میں آتی۔ شہر کی گلیوں میں

اپنے رنگ کی رنگینی' قتل و غارت' اغوا کے قصے تھے۔ اوپر جاتا تو ہر وقت ٹیلی ویژن پر نظر پڑتی۔ بیگم صاحبہ کو بھی سارا دن ٹیلی ویژن دیکھنے کا وقت نہ ملتا لیکن ٹیلی ویژن ہمہ وقت لگا رہتا۔ اس پر ڈش کے میوزک پروگرام جاری رہتے۔ ذہنی ڈانس اور جنسی ہیجان ابھارنے والے گیت اور ناچ دیکھ دیکھ کر غلام رسول کا دل نہ بھرتا۔ جونہی بیگم صاحبہ کی سپورٹس مرسڈیز گیٹ سے باہر جاتی غلام رسول گیت اور ناچ کی اس بے مہار دنیا میں گم ہو جاتا۔ ان نوجوان گانے والوں کو موسیقی ریاض سے نہ ملتی تھی بس جو گیت تھا تازہ پکے پھل کی مانند تھا۔ تھوڑا ترش تھوڑا میٹھا' تھوڑا قدرتی کڑواہٹ لیے ہوئے......اس موسیقی میں ایک خوبی بدرجہ اتم تھی کہ اسے سنتے ہی آدمی اس کے ردھم میں گم ہو جاتا اور نچلے دھڑ میں ناچنے کی امنگ پیدا ہو جاتی۔ دیکھتے دیکھتے غلام رسول ناچنے کا ماہر بھی ہو گیا۔ وہ بیگم صاحبہ کی عدم موجودگی میں پھڑک پھڑک کر ناچتا۔ ذرا سی پریکٹس سے گلا بھی سُر میں ہو گیا۔ پروفیسر صاحب کے گھر میں اسے باورچی خانے میں بھی محنت کرنا پڑتی تھی اور پڑھنے میں بھی کافی وقت صرف ہوتا تھا یہاں ٹیلی ویژن سے تعلیم حاصل کرنے میں محنت کو کوئی دخل نہ تھا۔ غلام رسول کے بالوں کا سٹائل بھی بدل گیا۔ نیچے ٹیلر ماسٹر سے کف بند شرٹیں اور خوبصورت جیکٹیں سلوا لیں۔ اب وہ آسانی سے دانش صاحب کے گھر کا غریب رشتہ دار لگنے لگا۔

اب جبکہ غلام رسول کا حلیہ عین بیگم صاحبہ کی بوتیک کے مطابق ہو گیا۔

ایک دن عجیب واقعہ پیش آیا اس روز جرمنی کے ایک اخبار کا نمائندہ نچلے آفس میں کچھ تصویریں بنانے کے لیے آیا بیٹھا تھا۔ تینوں ماڈل گرلز آپہنچیں تھیں۔ بیگم صاحبہ تھوڑا سا نروس ہو رہی تھیں کیونکہ ماڈل زبیر نہ جانے کہاں رُک گیا؟ اس کے گھر فون کیے جس ایڈورٹائزنگ کمپنی میں وہ ملازم تھا وہاں بھی کئی فون کھڑکائے۔ تینوں ماڈل گرلز تیار بیٹھی تھیں اور اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جرمن فوٹو گرافر سے کافی فلرٹ کر چکی تھیں اور اب ان کی انگریزی ختم ہو گئی تھی۔ آخری بار جرمن فوٹو گرافر نے اپنی کلائی والی گھڑی سے سویٹر کا کف ذرا اونچا کر کے بیگم مہتاب دانش سے کہا۔

"آئی ایم ایفریڈ...... اب اگر آپ کا ماڈل نہیں آیا تو میں تصویریں نہیں بنا سکتا۔ مجھے ایئر پورٹ پہنچنا ہے......"

بیگم صاحبہ ideas کی عورت تھیں۔ وہ بھاگی بھاگی اوپر والی منزل میں پہنچی

اور پانچ منٹ میں غلام رسول پر مغلیہ عہد کا خوبصورت لباس سجا کر نیچے لے آئیں۔

جب سلیم شاہی جوتی، خوبصورت تاج نما ٹوپی اور لمبے مخملی توب میں غلام رسول گلاب کا پھول سونگھتا ہوا سیڑھیاں اُترا تو تینوں ماڈل لڑکیوں نے سیٹی بجائی اور جرمن فوٹوگرافر نے لمبا سا واؤ کہہ کر کیمرے کا زاویہ بنانا شروع کر دیا۔

"یہ مغلیہ شہزادہ ہے......؟" جرمن فوٹوگرافر نے سوال کیا۔

"ہم نے اسے شہزادہ سلیم بنا کر پیش کیا ہے......" اس کے بعد بیگم صاحبہ نے فرفر انار کلی، نور جہاں اور حرم کی زندگی پر بے جوڑ اور تخیلاتی کہانیاں سنانا شروع کر دیں......

فوٹوگرافر نے اتنی تصویریں لیں کہ شٹر بند ہونے اور کھلنے میں وقفہ ہی مشکل سنائی پڑ رہا تھا۔ جرمن فوٹوگرافر جب کام سے فارغ ہو گیا تو اس نے چھوٹی سی ڈائری میں ماڈل گرلز کے نام پتے اور جسم کے تین بنیادی ناپ لکھے اس کے بعد وہ غلام رسول کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں غلام رسول کا نام پوچھا۔ تو بیگم صاحبہ نے فوراً خود انفارمیشن دینا شروع کر دی۔

"یہ پرنس ہے......اس کا اصلی نام تو غلام رسول ہے لیکن فیملی میں سب اسے پرنس کہتے ہیں۔ تم بتاؤ یہ پرنس سلیم لگتا ہے ناں......"

جرمن نمائندہ لڑکیوں سے بھی زیادہ غلام رسول کا معتقد ہو گیا۔ اور جرمنی میں اپنے گھر کا ایڈریس دیا۔

تینوں ماڈل لڑکیوں نے فلمی انداز میں ایک بار پھر سیٹیاں بجائیں۔ اونچے اونچے "واؤ" کہا اور ہنسنے لگیں۔ یوں لگ رہا تھا گویا کوئی ڈش کا پروگرام ہو رہا ہے......

جھوٹ سچ ملا جلا کر جرمن نمائندے کو ایئرپورٹ چھوڑنے خود بیگم صاحبہ اپنی سپورٹس مرسڈیز میں گئیں۔ غلام رسول کو ماڈلز اپنے ساتھ وین میں لے گئیں۔ سارا راستہ وہ غلام رسول کو پرنس کہہ کر ہی مخاطب کرتی رہیں۔ جب ان ماڈل گرلز کو ڈراپ کر کے غلام رسول گھر واپس آیا تو اس کا دل اور دماغ دونوں ساتویں آسمان پر تھے۔ وہ دیر تک ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑا رہا اور مختلف پوز بنا کر گلاب کا پھول سونگھتا رہا۔ ایسی خوشی سے وہ یقیناً ناآشنا تھا۔

اس دن کے بعد غلام رسول کا نام پرنس پڑ گیا۔ رات کو بیگم صاحبہ نے ہنس ہنس کر دانش کو صبح کے واقعات سنائے اور بار بار غلام رسول کو پرنس کہہ کر پکارا۔ جب

بھی وہ اس سے کافی، ڈرائی فروٹ، قہوہ مانگتی تھیں پرنس کہہ کر ہی آرڈر کرتی تھیں۔

مسز مہتاب کا اکلوتا بیٹا حسن ابدال میں تعلیم پا رہا تھا۔ فون پر اسے بھی بتایا گیا کہ غلام رسول کو اب سب پرنس سلیم کہتے ہیں۔ اور سارے ملنے والوں کو جرمن فوٹوگرافر کی تفاصیل کے ساتھ ساتھ اس واقعے کا حوالہ بھی دیا جاتا جس میں غلام رسول نے مغلئی شیروانی کے اشتہار کے لیے جرمن اخبار کے لیے تصویریں کھنچوائیں تھیں۔

ابھی زیادہ وقفہ نہ گزرا تھا کہ غلام رسول ایک اور شبخون کا شکار ہوا۔ بیگم صاحبہ ایک کزن کی ڈھولک پر گئی ہوئی تھیں۔ دانش صاحب کسی میٹنگ کے سلسلے میں اسلام آباد میں تھے۔ فریج میں سے اپنی پسند کے کھانے نکال کر غلام رسول نے مائیکرو اوون میں گرم کیے۔ پیٹ بھر کر روسٹ، قورمہ، کوفتے، سندھی پراٹھوں کے ساتھ کھائے اور فارغ ہو کر ٹی وی کے آگے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تو اس نے مغربی پاپ موسیقی سنی لیکن اسے کالے امریکن ناچتے گاتے پسند نہ آئے۔ وہ یہ جان نہ سکتا تھا کہ سفید امریکی نے کمال عقلمندی سے نیگرو امریکی کو اپنی سنجیدہ زندگی کے طاقتور بہاؤ میں شمولیت سے روک دیا تھا۔ کالے امریکن کھیلوں اور موسیقی میں خلق کو تفریح مہیا کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور سفید امریکی اس کی موسیقی اور کھیلوں میں شمولیت کو اتنا زیادہ پروجیکٹ کرتا تھا کہ کالے امریکی اتنی شہرت پا کر اپنی علمی، سائنسی اور ملکی ترقی میں پیچھے رہ جانے پر کچھ اتنے افسردہ بھی نہ تھے......ڈش کے سٹیشن ہلا جلا کر وہ ایسے ناچ گانے تک پہنچ گیا جس میں لڑکیاں لڑکے تو مشرقی تھے لیکن موسیقی برصغیر ہندوپاکستان کی نہ تھی۔ لباس مغربی ناچ گانے جنسی ہیجان ابھارنے والے تھے۔

اس موسیقی میں کچھ ایسی لے، تھرک، دف دف تھی کہ غلام رسول پہلے تو صوفے پر بیٹھا تھرکنے لگا پھر اس نے اٹھ کر ناچنے والوں کے ساتھ قدم ملائے اپنے جسم کو آزاد کیا اور جنسی ہیجان میں تڑپنے پھڑکنے لگا۔ اسے علم نہ ہو سکا کب اور کس دروازے سے مہتاب دانش داخل ہوئیں Rap موسیقی کے الفاظ دیسی تھے لیکن حرکات مغربی تھیں جن میں کاؤبوائز اور میکسیکو کا غصہ اور کاما سوترا جیسی جنسی انگیخت نے چار چاند لگا دیئے۔ جب گانا ختم ہوا تو اس نے اکیلے میں تالی بجائی لیکن ساتھ ہی بیگم صاحبہ نے اپنی تالیاں شامل کر دیں۔

"سوری بیگم صاحبہ......" وہ یکدم آسمان سے زمین پر آ گیا۔

"نہیں نہیں...... تم بہت اچھا ناچ رہے تھے غلام رسول...... مَیں تمہارا شو دوبارہ دیکھتی لیکن میری طبیعت بہت خراب ہے۔ مجھے کپکپی لگ رہی ہے۔ ایک قدم اور میں اٹھا نہیں سکتی۔" بیگم صاحبہ کھڑی کھڑی لڑھک گئیں۔

پرنس نے بھاگ کر انہیں سہارا دیا۔ بیگم صاحبہ نے آرگنزا کی آرپار نظر آنے والی پشواز پہن رکھی تھی جس کے نیچے سلک کی سلپ کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ اس قدر سردی کے باوجود ان کے تن پر کوئی گرم کپڑا نہ تھا۔

"ہائے میں مرجاؤں گی پرنس...... صاحب کو فون کرو۔ ڈاکٹر کو بلاؤ...... جلدی جلدی غلام رسول میں مرنے والی ہوں۔"

ایک بار پھر وہ غلام رسول کے بازوؤں میں لڑھک گئیں اور ان کے دانت کٹکٹانے لگے۔ غالباً ڈھولک والے گھر میں انہیں سردی لگ گئی تھی۔ اور دیر تک ناچتے رہنے کی وجہ سے ان کا سٹیمنا بھی ختم ہو گیا تھا۔ ویسے بھی وہ لڑکیوں کی طرح نازک اور دھان پان تھیں۔

بڑے مودب انداز میں وہ بیگم صاحبہ کو اٹھا کر ماسٹر بیڈ روم میں لے کر گیا۔ انہیں ماسٹر بیڈ پر لٹایا۔ پیروں کے کُھسّے اتارے' ہیٹر جلایا' کمبل اوڑھایا۔ بیگم صاحبہ بے ہوش سی تھیں یا کسی اور دنیا میں تھیں انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں غلام رسول کا ہاتھ لے کر کہا...... "ذرا میرے پرس میں سے ڈائری نکالو اور ڈاکٹر عباس کو فون کرو...... وہ فوراً آجائیں......"

ڈاکٹر عباس کو فون کرنے کے بعد...... اس نے اسلام آباد ہوٹل میں دانش صاحب کو فون کیا وہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ بیٹے کو حسن ابدال فون نہ ہو سکا۔

اب مہتاب دانش پر رونے کا دورہ پڑ چکا تھا۔ وہ اونچے اونچے سسکنے' آہیں بھرنے' ہچکیاں لے لے کر کہنے لگیں۔ "سب کو اپنی پڑی ہے...... کسی کو میری فکر نہیں...... دانش کو اپنی میٹنگوں کی زیادہ فکر ہے۔ اس اُلّو کے پٹھے حرام زادے صغیر کو کتنی مشکل سے پالا...... اسے کیا ماما مر جائے یا زندہ بچے...... موج لوٹو...... مزے کرو...... میں کام کر کر کے مر گئی کھپ گئی...... کسی کو کیا...... اللہ کرے دانش مر جائے...... کبھی وقت پر کام نہیں آیا...... ساری ذمہ داری میری...... اوپر سے کماؤ بھی۔"

رونے دھونے' واویلا مچانے کے دوران کبھی کبھی وہ بلبلا کر کہتی...... "اور

مجھے پتہ ہے ذرا میری آنکھ لگی تم نے کوارٹر میں بھاگ جانا ہے۔ تمہارے جیسے لٹیرے میں نے کئی رکھے ہیں احسان فراموش کمینے۔"

غلام رسول نے بار بار اسے تسلی دی کہ وہ بھاگنے والوں میں سے نہیں ہے اور ان ہی تسلیوں کے درمیان کہیں پرنس اپنی اوقات بھول گیا۔

گھاس کی کسیلی دھونی نے اس کے سینے اور حلق میں آگ سی لگا دی تھی۔ اس کے تن پر صرف ایک کرتا تھا جس کی اب دھجیاں بکھر چکی تھیں۔ غلام رسول نے اتنے بید کھائے تھے اتنے مُکّے...... گھونسے تھپڑوں سے نوازا گیا کہ اب اس کی آنکھیں الگ الگ دیکھنے لگی تھیں......

"نئیں نئیں تھانیدار جی بیگم صاحبہ کا کوئی قصور نہیں...... انہوں نے تو مجھے بڑی عزت دی...... مجھے پرنس بلاتی تھیں...... میں ہی اپنی اوقات بھول گیا تھا جی...... ہر انسان کی یہی بیماری ہے سر جی۔ جب اسے طاقت مل جاتی ہے تو پھر اسے یاد نہیں رہتا وہ کون ہے؟ میں بھی' بھول گیا تھا غلام رسول کو...... میں اپنے آپ کو پرنس سمجھنے لگا تھا سچی مچی مائی باپ صرف بادشاہ سبکتگین اپنی پرانی...... پوستین نکال کر دیکھا کرتا تھا...... نہ دیکھتا تو وہ بھی بھول جاتا...... پروفیسر صاحب اچھے آدمی تھے سر...... میں ہی تب بہک گیا تھا۔ مجھے...... کیا لینا تھا جمہوریت سے مجھے کیا لینا ہے مساوات سے...... اوئیں۔ کچھ لوگ تھوڑی سی پی کر بہت زیادہ بہک جاتے ہیں سر میں بھی غلام رسول کو بھول گیا...... اپنی حیثیت ہی بھول گیا......"

"ہمیں دھمکاتا ہے...... ہمیں سکھاتا ہے...... لمبا ڈالو...... اور طبیعت صاف کردو۔"

اس بار اس کی طبیعت اتنی صاف کی گئی کہ اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی نوبت ہی نہ آئی۔

شریکِ سفر

ہم گوجرانوالہ تک ہی تو جا رہے تھے۔

لیکن کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے سفر اس قدر لمبے اور یادگار بن جاتے ہیں کہ سمندر پار کی یاترائیں بھی اُن کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں۔ طلعت، سرفراز اور مَیں بس سے روانہ ہوئے تھے۔ پہلے تو صلاح ٹھہری تھی کہ پسنجر ٹرین سے جائیں گے۔ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیں گے کامریڈ بن کر سفر کریں گے راہ میں گاڑی جہاں کہیں بھی رُکے گی سٹیشن سے کچھ نہ کچھ خرید کر ضرور کھائیں گے۔ لیکن سرفراز کو کچھ کنگھی پٹی کا مستورات کی طرح شوق ہے۔ آئینے میں چو گوشیے ماتھے پر زلفیں سجائے اچھا خاصا وقت گزار دیا۔ گاڑی کا وقت تنگ ہو گیا۔ بھاگم بھاگ سٹیشن کے قریب لاریوں کے اڈے پر پہنچے تو اچھی خاصی شام ہو چلی تھی۔ بہر کیف بس میں بیٹھے اور روانہ ہوئے۔ گھر سے چلے تھے تو بادل کا نام و نشان تک نہ تھا لیکن گھڑی بھر میں اِدھر اُدھر سے آوارہ گرد بدلیاں اکٹھی ہونے لگیں۔ پہلے کچھ سیاہی مائل دھبے آسمان پر چھائے۔ دیکھتے دیکھتے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ ادھر بادل کی گرج بڑھی ادھر پرانی بس کی انتڑیوں میں بلا کا درد اٹھا۔ چار قدم چلتی تھی اور دس قدم ٹھوکریں کھاتی تھی۔ سواریاں کبھی تو کھڑکی کے قریب گھڑیاں لا لا کر وقت دیکھتیں اور کبھی گرم کپڑوں کو اردگرد لپیٹتے ہوئے راہ کی بے سروسامانی پر غور کرنے لگتیں۔

ڈرائیور بے چارے کو شائد گوجرانوالہ میں کسی سے ملنا تھا۔ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ایکسلیٹر پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا، لیکن بس تو بس ہو چکی تھی۔ بالآخر گوجرانوالہ

سے کوئی بیس میل ادھر ہی ڈرائیور کی انتہائی کوششوں کے باوجود بس نے جواب دے دیا۔ سواریاں اتر کر سڑک پر آ گئیں اور کسی اور بس کا انتظار کرنے لگیں۔ ڈرائیور کم حوصلہ نہ تھا۔ بونٹ اُٹھا کر مستقل انجن کی تفتیش میں لگا رہا۔ اُس کی باتیں کچھ ایسی تسلی آمیز تھیں کہ ہم نے باہر نکلنے کے بجائے بس میں بیٹھ کر گپیں مارنا شروع کر دیں۔ جیبوں میں سے چلغوزے نکال کر چھیلتے رہے اور باتیں کرتے رہے، سیانے ہم سفر گوجرانوالے جانے والی بسوں میں سوار ہو کر گھروں کو پہنچ گئے۔ لیکن ہم ڈرائیور کی باتوں پر تکیہ کیے آرام سے بیٹھے رہے بالآخر گھوں گھوں کرنے والا انجن بھی خاموش ہو گیا۔ ڈرائیور نے بیٹری جلائی بتیاں روشن کرنا چاہیں تو اندھیرا ساری بس کے ساتھ لپٹ گیا۔

اب تو کلینر نے ہمیں دبی زبان میں مشورہ دیا کہ کسی آتی جاتی گاڑی سے شہر کا رُخ کریں ورنہ رات اندھیرے میں کاٹنا مشکل ہو جائے گی۔ اب تک طلعت کئی بار دبی زبان سے شکایت کر چکی تھی کہ ہم باتوں میں خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ کلینر کی بات سن کر ہمیں بھی کچھ تشویش ہوئی اور ہم تینوں سڑک پر اُتر گئے۔

سڑک پر گُھپ اندھیرا چھایا تھا۔ سرفراز کے تکلف سے سجائے ہوئے بال ہلکی ہلکی بارش میں نم ہو رہے تھے اور دُور تک کسی چلنے والی گاڑی کا شور تک سنائی نہ دیتا تھا۔ طلعت اس گُھپ اندھیرے سے بہت گھبرا رہی تھی۔ بالآخر جب ایک بس ہمارے پاس رُکنے کے بجائے بتیوں کی پوری روشنی ہم پر ڈالتے ہوئے گزر گئی تو وہ بولی۔

"مَیں نہ کہتی تھی، ہمیں بیابان میں رات گزارنا پڑے گی بس سے نہ چلو، بس سے نہ چلو......"

سرفراز جو اب تک سنگار کے بگڑ جانے سے پریشان ہو چکا تھا چڑ کر بولا۔

"پر گوجرانوالہ جانے کا منحوس پروگرام آخر کس نے بنایا تھا۔ اچھا بھلا مَیں تو پکچر دیکھنے چلا تھا۔"

مَیں نے سمجھوتہ کرانے کی غرض سے کہا۔

"اچھا بھئی لڑنے سے فائدہ؟...... ابھی کل دس بجے ہیں، کوئی نہ کوئی بس آتی ہی ہوگی......"

کلینر اور ڈرائیور آرام سے کمبل اوڑھ کھڑکیاں بند کر پچھلی سیٹوں پر دراز

ہو گئے۔ ہوائیں تیزی سے چلنے لگیں۔ کیکر کے درختوں کی اوٹ بھی کچھ ایسی آرام دہ نہ تھی کہ ہم ان کا آسرا لیتے۔ آخر صلاح ٹھہری کہ تینوں بس ہی میں بیٹھیں اور کسی بس یا کار کا شور سنتے ہی چھلانگ مار کر سڑک پر آ رہیں۔ بادل گرج گرج کر بھیگی ہوئی سیاہ سڑک پر بار بار بجلی کے کوڑے مار رہا تھا۔ بس کے اوپر ترپال پر بارش کے موٹے موٹے چھینٹے بھیانک شور پیدا کر رہے تھے۔ طلعت کی ساری شیخیاں اور رعب ہوا ہو چکے تھے اور وہ بھیگی بلّی بنی ہم دونوں کے درمیان گم سُم بیٹھی تھی۔ پچھلی سیٹ سے ڈرائیور کے خراٹوں کی آواز مسلسل گانے والے جھینگر سے مشابہہ تھی۔ سرفراز اب تک آدھی ڈبیا سگریٹ ختم کر چکا تھا۔ مجھے کھڑکی کے ساتھ بجنے والی بوندوں میں سے کسی روح کی سسکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اپنے پاگل پن کو جھٹلانے کی خاطر میں نے ماچس جلائی اور کھڑکی کی کہر آلود فضا سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ بوندوں نے شیشے پر ایک غیر واضح شکل سی کاڑھ دی تھی اور یہ شکل ایسی تھی جیسے کوئی آوارہ لڑکی بال کھولے سگریٹ پی رہی ہو۔ مَیں نے چہرہ ادھر کرنا چاہا لیکن غیر شعوری طور پر میرا ہاتھ ماچس پر پہنچا اور مَیں نے پھر سے ماچس جلا کر کھڑکی کے باہر گھورنا شروع کر دیا۔ اب یہ کہر آلود شکل شیشے کے چوکھٹے میں سے نکل' باہر سرکنڈوں میں کھڑی بھیگ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر بارش کی بوندیں شہد کے قطروں کی طرح جمی ہوئی تھیں اور وہ سگریٹ پی رہی تھی۔

مَیں نے پریشان ہو کر اپنا کمبل سر پر اوڑھ لیا اور کھڑکی کے سامنے لکڑی کی جھلملی چڑھا دی۔ اسی اثنا میں مَیں نے دیکھا کہ سرفراز بس کی دوسری طرف اُچک کر کھڑکیاں بند کر رہا ہے۔ طلعت نے ہماری کارروائی دیکھ کر کہا۔

"پہلے بیوقوفوں کی طرح اندر بیٹھ کر ساری بسیں گنوا دی ہیں' اب کھڑکیاں بھی بند کرو تاکہ جو اِکّا دُکّا گاڑی گزرنے والی ہے اُس کا بھی پتہ نہ چلے۔"

سرفراز نئی سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ "گاڑی کا شور بہت پہلے پہنچ جاتا ہے' میں جلدی سے سڑک پر اتر جاؤں گا۔"

لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ بارش کی ٹپٹپاہٹ میں بسوں کا شور گھل مل کر کہیں دُور ہی دُور رہ جاتا ہے اور کبھی تو ہم وقت سے پہلے اتر کر سڑک پر بھیگتے اور کبھی بس زناٹے سے چھینٹے اُڑاتی ہمارے اترنے سے پہلے ہی نکل چکی ہوتی۔ طلعت اب ہولے

ہولے رومال سے آنسو پونچھنے لگی تھی اور گوجرانوالہ جانے کی ساری خوشی پچھتاوا بن چکی تھی۔

اچانک بڑی دُور سے ایک بس کی آواز سنائی دی۔ اس کا انجن کچھ خراب تھا۔ ورنہ بارش پر اس کی آواز یوں غالب نہ آسکتی۔ سب سے پہلے طلعت اُچک کر اٹھی اور جلدی سے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کر باہر جھانکنے لگی۔ پھر اس نے کوٹ کے کالر اُٹھائے اور سڑک پر کُود گئی۔

اب ہم دونوں بھی شرمندہ ہو کر بھیگی سڑک پر اتر گئے۔ دُور بارش کا پردہ چیرتی ایک بس آرہی تھی۔ طلعت نے جلدی سے اپنا دوپٹہ نکالا اور جلدی جلدی ہلانے لگی۔ سرفراز نے طلعت کا کندھا تھپتھپا کر کہا۔

"رہنے دو ابھی بس کو آنے میں دیر ہے' مَیں خود کھڑی کروا لوں گا......"

"تم نے بچپن سے آج تک کوئی ڈھب کا کام کیا بھی ہے جو اب کرو گے؟ تمہارے جیسے بھائی کس کام کے؟"

اب مجھے شرم آئی اور چچازاد ہونے کی حیثیت سے میں نے سگا پن جتانا چاہا۔ اس لیے مَیں سڑک کے عین درمیان ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔

ایک انسان کو یوں خودکشی پر آمادہ دیکھ کر بس کھڑی ہو گئی۔ لیکن ڈرائیور نے انجن بند نہ کیا اور کھڑکی سے سر نکال کر بولا۔

"جناب صرف ایک سیٹ ہے۔"

"لیکن ہم تو تین ہیں......"

"مَیں نے آج تک کبھی بس Over Load نہیں کی عالی جاہ۔"

اب بس کی تیز روشنی میں ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ طلعت کی آنکھیں رونے کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے آہستہ سے کہا......

"طلعت تم چلی جاؤ...... بسوں کے اڈے سے گھر فون کر دینا۔ اباجی تمہیں لینے آجائیں گے۔"

اب کلینر نے منہ دکھایا اور غصے سے بولا۔ "زنانی سواری بھیج دیں ورنہ یہ بھی سڑک پر بھیگتی رہ جائے گی۔"

ڈرائیور کچے پر بس اُتار رہا تھا اور مجھے پورا یقین تھا کہ چند لمحوں میں وہ ہوا ہو

جائے گا۔ میں نے طلعت کو بانہہ سے پکڑ کر بس کی طرف روانہ کیا اور جلدی جلدی بڑھ کر بس کا پچھلا دروازہ کھولا۔ طلعت اکیلی جاتے ہوئے گھبرا رہی تھی' لیکن اندھیرے میں یہاں ٹھہرنے کو اُس نے جانے پر ترجیح دی اور پچھلی سیٹ پر ایک کھدر پوش جاٹ سے الگ سی ہو کر بیٹھ گئی۔

بس چلنے لگی تو میں نے جلدی سے ایک نظر اس کے نمبر پر دوڑائی ڈرائیور کا بغور جائزہ لیا اور پھر سرفراز سے باتیں کرتا ہوا واپس اپنی بس میں جا کر بیٹھ رہا۔

جب تک طلعت ہمارے ساتھ تھی کسی نہ کسی طرح باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ اب سرفراز اور مَیں نے کچھ دیر مقامی سیاست' فضا کی خرابی اور ایٹم بم پر گفتگو کرنے کی کوشش کی لیکن بات کچھ نہ بن سکی اور بالآخر ہم دونوں بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگے۔

اپنے اپنے کمبلوں میں بھری بُکّل مارے' ہمیں زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا جب اچانک کسی گاڑی کے بریک لگانے کی آواز سنائی دی' پھر کار کا دروازہ زور سے بند ہوا اور کسی نے اتر کر ہماری بس کی کھڑکی کھٹکھٹائی۔ ہم دونوں چونک کر اُٹھے چونکہ دستک سرفراز کی طرف آئی تھی' اس لیے اصولاً اُسے کھڑکی کھولنا چاہیے تھی' لیکن تب تک میرا ہاتھ کھٹکے تک پہنچ چکا تھا۔

کھڑکی کھولی تو سامنے بال بکھرائے ایک جوان سال سر جھاڑ منہ پہاڑ قسم کی عورت کھڑی تھی' اُس کے ہاتھ میں سگریٹ تھی اور وہ عین مین وہی عورت نظر آ رہی تھی جو رات کے پہلے حصّے میں مجھے سرکنڈوں کی اوٹ میں نظر آئی تھی۔ میں سٹپٹا کر پیچھے ہٹا تو سرفراز بولا۔

"یار اب کسی اور سواری سے کیا جانا' صبح ہونے ہی والی ہو گی اسی بس سے چلیں گے۔"

مَیں انکار کرنے ہی والا تھا لیکن وہ عورت اپنا لال کوٹ گردن پر اٹھاتی ہوئی بالکل کھڑکی کے پاس آ رہی اور آہستہ سے بولی۔

"آپ کو لفٹ چاہیے؟"

"جی نہیں اب دن چڑھنے ہی والا ہے اسی بس سے روانہ ہو جائیں گے صبح۔"

اُس نے اپنی سانولی کلائی پر سے سرخ کوٹ اُٹھایا پھر لال لال نچلا ہونٹ باہر لٹکا کر بولی۔

"ابھی تو کل دو بجے ہیں ساری رات باقی ہے۔ میں گوجرانوالہ جا رہی ہوں اگر آپ چلنا چاہیں تو مَیں لے چلتی ہوں۔"

سرفراز نے کمبل اور بھی سر پر کر لیا لیکن اب تک میں اپنی غلطی پر پشیمان ہو رہا تھا۔ کہاں سرکنڈوں والی عورت کا سر پھرا تصور اور کہاں اس امیر زادی کا پُر تپاک وجود مَیں نے اٹیچی اٹھاتے ہوئے سرفراز سے کہا۔

"چلو یار آدھے گھنٹے میں گھر ہوں گے' یہاں پڑے رہنے سے فائدہ؟"

سرفراز بڑی بے دلی سے اُٹھا اپنا کمبل کندھے پر رکھا' اٹیچی سنبھالا اور میرے ساتھ ہو لیا۔

باہر بادل پھٹ چکے تھے اور بڑی تیکھی چاندنی سڑک اور کیکر کے درختوں کو منور کر رہی تھی۔ سبک رفتار عورت نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا اور سرفراز کو چڑھنے کی دعوت دی۔ اس کے ہاتھ کی نرت اور آنکھوں کی چمک دیکھ کر یک لخت سرفراز کا ہاتھ اپنے چوگوشیہ ماتھے کی طرف بڑھا اور وہ اپنے بال سنوارنے لگا۔ پھر وہ کوٹ کی بلٹ کو کمر کے گرد کستی ہوئی خود چڑھی۔ سرفراز سے کچھ ہٹ کر بیٹھی اور بڑے دل فریب انداز میں مجھے بلایا۔ اس سے پہلے میں مستقل طور پر نیم غنودگی کی حالت میں بھی طلعت کے متعلق سوچ رہا تھا۔ لیکن یک لخت طلعت کا خیال کھڑی ہوئی بس کی طرح نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں اُس کے پاس بیٹھ گیا اور کار آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

چاندنی رات تھی لیکن چاندنی زیادہ اور رات کم تھی۔ کار اندر سے گرم تھی۔ سیٹوں پر سنبل کے نرم تکیے لگے تھے۔ اندر ہلکی نیلی روشنی کا اُجالا تھا۔ ڈرائیور کی پشت پر اطلس کا ایک دبیز پردہ لٹکا ہوا تھا اور آگے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ نہ ڈرائیور نہ سامنے کا شیشہ۔ اس چوکور ڈبے میں سارا سفر ایک رومان بن کر میرے سر پر چھانے لگا۔ اس عورت نے بجھتی سگریٹ کے ساتھ نئی سگریٹ جلائی پھر پرس کھول کر مجھے اور سرفراز کو بڑے قیمتی روسی سگریٹ پیش کیے اور لائیٹر سے سگریٹ جلانے کو پہلے سرفراز کی طرف جھکی اور پھر میری طرف۔ جب اُس نے لمبی لمبی انگلیوں میں لائیٹر جلا کر میری جانب دیکھا تو مستقبل سے وابستہ وہ خواب جن میں طلعت رہتی تھی فضا میں ٹوٹے ہوئے غباروں کی طرح اُڑ گئے۔

گاڑی چلتی رہی...... چلتی رہی...... کئی بار مَیں نے گھڑی نکال کر دیکھی' لیکن

وقت پونے تین سے آگے نہ بڑھائیں نے کلائی جھٹک کر کان سے لگائی۔ ٹک ٹک کی آواز آ رہی تھی اور سوئی متواتر چل رہی تھی۔ گاڑی کیکر کے دو رویہ درختوں کے درمیان خاصی رفتار سے چلی جا رہی تھی' لیکن نہر کا پل آ ہی نہ رہا تھا۔ عورت خاموشی سے کالر اُٹھائے سیٹ سے پشت جمائے سگریٹ پر سگریٹ پیئے جا رہی تھی۔ پھر اچانک مجھے نیند آ گئی اور مَیں پشت سے سر لگا کر سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو گاڑی باقاعدہ اُسی رفتار سے چل رہی تھی۔ کیکر کے درخت ڈالیاں پھیلائے پیچھے کی طرف بھاگے جا رہے تھے اور کار کے دوسرے کونے میں سرفراز کے کندھے سے وہ عورت سر لگائے سو رہی تھی۔ سرفراز کے بڑے ہاتھ میں اس کے دونوں ہاتھ تھے لیکن خود سرفراز گہری نیند سو چکا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر میرا جی بے اختیار چاہا کہ کسی طرح چلتی گاڑی کا دروازہ کھول کر سرفراز کو باہر دھکیل دوں حالانکہ وہ طلعت کا بھائی تھا اور میرا چچازاد۔

ابھی میں اس رقابت کے غصے میں جل بُھن رہا تھا کہ عورت نے مندی ہوئی آنکھیں کھولیں ذرا تعجب سے سرفراز کی طرف دیکھا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"آپ لوگوں نے میری مہمان نوازی کا اچھا بدلہ دیا؟ مجھے سوتی جان کر یہ صاحب مجھ سے ایسی آزادی برتنے لگے۔"

مجھے سرفراز کی حرکت پر بہت غصہ آیا مَیں اُسے جگانے والا ہی تھا کہ ان بیگم صاحبہ نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے منع کر دیا اور آہستہ سے بولیں۔

"پتہ نہیں یہ بیٹھے نیند میں کیا سوچ رہے ہوں گے' رہنے دیجئے...... ایسی بھول کبھی کبھی ہو ہی جایا کرتی ہے۔"

"مَیں بہت شرمسار ہوں بیگم صاحبہ۔"

"سگریٹ پیجئے گا؟" اُس نے سگریٹ کیس میری طرف بڑھایا' پھر آہستہ سے میری بانہہ سے کوٹ اُٹھا کر وقت دیکھا اور بولیں۔ "صرف پونے تین ہوئے ہیں' اب پہنچنے ہی والے ہیں...... رات کا سفر کتنا لمبا لگتا ہے۔"

"مجھے تو احساس ہوتا ہے میری گھڑی تھم گئی ہے۔"

"اگر اپنے ساتھیوں سے ایسی بے پرواہی برتی جائے تو سفر کیسے کٹے؟"

پھر وہ عجیب طرح سے مسکرائی اور میرے قریب کھسک آئی۔

مجھے معلوم نہیں ہم کب تک باتیں کرتے رہے اور ہم نے کس کس موضوع پر گفتگو کی۔ لیکن مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ میرا بازو اُس کی کمر کے گرد تھا اور ہم ایسی باتیں کر رہے تھے جیسے مدتوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ پھر اُس نے اپنا سگریٹ کیس مجھے دیا اور آہستہ سے بولی۔

"یہ میری یادگار رکھیئے گا۔"

"اور تم مجھے پھر کب ملو گی؟"

"دیکھئے...... کوشش کروں گی......"

باتوں باتوں میں اونگھ گیا پھر دیکھا تو سرفراز مجھے جگا رہا تھا۔ میں نے حیرت سے آنکھیں کھولیں دیکھا تو ساتھ طلعت کندھے سے سر جوڑے سو رہی تھی باہر ڈرائیور بس ٹھیک کرنے میں مشغول تھا۔ کیکر کے درختوں کے ہیولے صبح کی روشنی میں اُجاگر ہو رہے تھے۔ تعجب سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا...... "سرفراز رات رات......" میں نے کہا۔

"یہی تو میں بھی سوچتا ہوں رات تو ہم ایک عورت کے ساتھ گوجرانوالہ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔"

"اور یہ طلعت کہاں سے آ ٹپکی اسے تو بس سے بھیج دیا تھا...... مجھے نمبر بھی یاد ہے۔"

"کمال ہے...... لیکن افسوس ہے اُس عورت سے کچھ ایسے وعدے بھی میں نے کیے تھے جو بالکل مہمل سے تھے۔"

مَیں نے اپنی گفتگو کو دہرانا نہ چاہا۔ سرفراز نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر حقیقت چھپاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"یار رات کے شروع میں بھی میں نے اسی عورت کو کھڑکیوں میں سے جھانکتے دیکھا تھا اسی لیے جب اُس کی کار یہاں آ کر رُکی تو میں ساتھ چلنے پر راضی نہ تھا۔"

ہم دونوں انہی واقعات پر تعجب کر رہے تھے' جب بس روانہ ہو گئی۔ مَیں جی ہی جی میں خوش تھا کہ سرفراز اور میں ایک خطرناک دوراہے پر پہنچنے سے بچ گئے۔

جونہی بس اڈے میں داخل ہوئی' میری نظر سامنے کھڑی ہوئی بس پر پڑی'

اُس کا نمبر دیکھ کر مجھے رات والی بس یاد آ گئی' جس میں مَیں نے طلعت کو سوار کیا تھا۔
بس کے رُکتے ہی میں نے اس بس کا رُخ کیا۔ ڈرائیور بونٹ کھولے انجن دیکھ رہا تھا۔

"ڈرائیور صاحب کیا رات آپ نے گوجرانوالہ لاہور کی سڑک پر سے ایک زنانی سواری نہ اُٹھائی تھی۔"

پہلے تو ڈرائیور چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر بڑی دلچسپی سے بولا۔ "جناب رات تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ راہ میں یہ سامنے والی بس رُکی کھڑی تھی مَیں نے خدا ترسی کر کے بس روکی۔ سامنے تین سیاہ پوش اور ایک عورت کھڑی تھی۔ زنانی سواری کو مردوں نے یہ تاکید کر کے ہمارے ساتھ روانہ کیا کہ اسے سول لائینز پہنچا دیں لیکن جناب ہماری بس اڈے میں داخل ہوئی تو وہ بیگم صاحبہ آنکھ بچا کر اڈے سے نکل گئیں۔" مَیں نے بغیر کچھ کہے اپنی بس کا رُخ کیا اور بس سے سامان اتروانے لگا۔

لال گیند

جس علاقے میں ہمیں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا وہاں آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ دور دور چنار کے گھنے درخت ہواؤں میں ہلتے ہری ہری دوب سرسراتی جنگلی پھولوں کے قطعے لہلہاتے لیکن کوئی بھی انسان ایسا نظر نہ آتا' جو ان نظاروں سے لطف اندوز ہو سکتا۔

ہمارے گھر کے عین سامنے ایک قلعہ نما کوٹھی تھی۔ اس کی اونچی اونچی سرخ دیواروں پر جنگلی گلاب کی بیلیں اس طرح منڈھی ہوئی تھیں کہ سارا بنگلہ کسی کرسمس کارڈ کا چربہ لگتا۔ سامنے ڈھلوان پر اترتی ہوئی کیاریوں میں ان گنت رنگین پھول ہولی میں بکھرے ہوئے رنگوں کی طرح شوخ نظر آتے لیکن اس ایوان میں رات کے وقت صرف ایک بتی روشن ہوتی۔ سارا بنگلہ اندھیرے میں اونچا سیاہ دھبہ بن کر ٹھٹھک جاتا۔ اور صرف ایک کمرے میں ولایتی فانوس کی روشنی مریض کے چہرے کی طرح پیلی پیلی نظر آتی!

اس گھر میں کون کون رہتا تھا' اس کے متعلق مجھے عرصہ تک کچھ علم نہ ہو سکا۔ نوکروں سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ ایک امیر کبیر میاں بیوی دنیا سے دُور یہاں اپنی زندگی کے دن گزارنے آئے ہیں۔ بیگم صاحبہ کو جب مَیں نے پہلی دفعہ دیکھا تو وہ اپنے گھر کے پھاٹک کے سامنے کھڑی تھیں' ان کا سارا وجود قیمتی پتھروں کی تجربہ گاہ بنا ہوا تھا۔ ہاتھوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں گلے میں زمرد کا گلوبند کہنیوں تک کندن کی چوڑیاں اور کانوں میں نیلم کے آویزے! لیکن یہ سارے زیورات اُن کے جسم پر ایسے لگتے تھے جیسے پرانی ٹوٹی ہوئی حویلی پر عشق پیچاں کی بیل چڑھی ہو۔ اس قدر قیمتی زیورات کے باوجود وہ کسی غریب روح کی طرح پریشان نظر آ رہی تھیں۔

میں اُنہیں دیکھ کر لمحہ بھر کو ٹھٹھکی' بیگم صاحبہ نے ایک سرسری نظر میری طرف دیکھا اور پھر یوں منہ پھیر لیا جیسے مجھ سے بات نہ کرنا چاہتی ہوں۔ میں اس ویران علاقے میں گو لطفِ ہمسائیگی کو ترس گئی تھی' لیکن بیگم صاحبہ کی بے رخی دیکھ کر ہمت نہ پڑی کہ اُن سے راہ و رسم پیدا کروں۔

دوسری بار بیگم صاحبہ سے میری ملاقات اچانک ہو گئی۔ ننھا جاوید اپنی گیند سے کھیلتا ہوا بیگم صاحبہ کے بنگلے میں داخل ہو گیا۔ میں وہاں جانا تو نہ چاہتی تھی لیکن جاوید کو لینے جانا ہی پڑا۔

ریشم ایسی گھاس بنگلے کی آخری سیڑھیوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور ٹیڑھے ٹیڑھے لکڑی کے جنگلوں پر بیلیں چڑھی تھیں' میں نے گیٹ ذرا سا اور کھولا تو انہی جنگلوں کے سامنے بید کی نیچی کرسی پر مجھے بیگم صاحبہ بیٹھی نظر آئیں۔ آج اُن کا سنگار پہلے سے دونا تھا' اور وہ یاقوتی انگوٹھیوں سے لدے ہاتھ پھیلا کر جاوید کو پچکار کر پاس بُلا رہی تھیں۔ میں خفت بھرے لہجہ میں بولی...... "معاف کیجئے جاوید بغیر اجازت ادھر نکل آیا۔" انہوں نے سامنے پڑی ہوئی میز سے بسکٹ اٹھا کر جاوید کو دیا اور پھر میری طرف دیکھ کر بولیں...... "یہ تمہارا بچہ ہے؟"

"جی!......"

"اور تم اس کی ماں ہو؟" انہوں نے جھریوں بھرے چہرے پر طنز کے آثار پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی!......"

"تمہیں چوروں سے ڈر نہیں لگتا؟" انہوں نے اچانک پوچھا۔"

پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ مَیں اپنے شہر سے دور اجنبی جگہ میں ہوں۔ ان کا مفہوم سمجھنے کے باوجود مَیں نے عاجزی سے کہا۔ "جی ہم کون سے امیر ہیں' جو چوروں سے ڈریں!"

"تمہارا خیال ہے دنیا میں صرف روپیہ پیسہ ہی چرایا جاتا ہے......؟ اٹھائی گیرے اس سے بھی قیمتی چیزیں اٹھا لے جاتے ہیں......" انہوں نے جگمگاتی انگوٹھیوں والا ہاتھ جاوید کے سر پر رکھا۔

"جی!......"

"بیٹھ جاؤ......" انہوں نے ہاتھ سے کرسی کی طرف اشارہ کرتے مجھے حکم سا دیا۔ اور جب میں بیٹھ گئی تو وہ کرسی پر آگے آ کر بولیں...... "معلوم ہے کہ اگر کوئی میرے زیورات اٹھا کر لے جائے تو مجھے اتنا ہی رنج ہو گا' جتنا رنج تجھے اپنے بچے سے بچھڑ کر۔ مجھے چوروں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ وہ انسان کی سب سے قیمتی چیز اُڑا لے جاتے ہیں اور پھر......اور پھر سوچتے ہیں کہ اُن کا دیا ہوا گھاؤ آپ سے آپ مندمل ہو جائے گا۔"

ان کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میرا دل بیٹھ گیا اور میں جاوید کو اپنے قریب کرتے ہوئے بولی "بیگم صاحبہ آپ کا بچہ ایسے بچھڑا کیوں کر؟......"

انہوں نے اپنی ہیرے کی انگوٹھی انگلی میں پھراتے ہوئے جواب دیا...... "امیر لوگوں کے اپنے غم ہوتے ہیں۔ ان کی دولت ایک ایسا ناگ ہے جو اُن کی خوشیوں پر پہرہ دیا کرتی ہے...... ہم اس بنگلے میں جب نئے نئے آئے تھے تو حمید کی چھٹیوں کا اس سے بہتر استعمال اور کوئی نہ تھا۔ وہ کاغذ کے ہوائی جہاز بنا کر اڑاتے اور لالی گرتا سنبھلتا اترائی تک ان کے تعاقب میں چلا جاتا اور میں اسی کرسی پہ بیٹھ کر ان دونوں کے لیے سوئیٹر بنتی رہتی...... پھر اچانک ہمارے قہقہے چوروں نے سن لیے اور انہیں احساس ہوا کہ امیر لوگ بہت خوش رہتے ہیں' انہیں خدا نے روپیہ پیسہ ہی نہیں دیا۔ بلکہ ہر طرح کی مسرت بھی اُن ہی کے لیے وقف کر دی ہے...... اور بہت سے چور ایسے ہوتے ہیں جو دبے پاؤں آتے ہیں اور انسان کی زندگی سے ساری خوشیاں چھین کر لے جاتے ہیں۔"

"جی......"

"ابھی ہمیں یہاں رہتے ہوئے چند روز ہوئے تھے کہ ایک دن میں نے حمید کو بہت پریشان دیکھا وہ لالی کو گود سے علیحدہ نہ کرتے تھے۔ بار بار وہ یہی اصرار کرتے کہ دھوپ سینکنے کے بجائے ہم آگ جلا کر اندر ہی بیٹھیں۔ شام تک تو وہ اپنا اضطراب چھپائے رہے لیکن جب میں بھانپ گئی کہ ان کے جی پر کچھ بوجھ ہے تو اُنہیں بتاتے ہی بن پڑی۔ اُنہوں نے ایک خط میری گود میں پھینک دیا۔"

"خط؟......"

"ہاں خط...... اس علاقے کے چند ڈاکوؤں نے ہمیں دھمکی دی تھی کہ اگر دو دن کے اندر اندر ہم نے انہیں 20 ہزار روپیہ نہ پہنچایا تو وہ لالی کو اٹھا کر لے جائیں گے۔"

"بیس ہزار روپیہ!" حیرت سے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"بیس ہزار روپیہ اتنی رقم نہیں ہوتی کہ اپنے بچے کی عافیت خریدی نہ جاسکے۔ میرا لالی تو جب ایک بار مسکراتا تھا' مجھے لاکھوں وصول ہو جاتے تھے۔ حمید چاہتے تھے معاملہ پولیس کے حوالے کردیں اور رقم نہ بھیجیں۔ لیکن مَیں نے انہیں سمجھایا کہ لالی جیسا لعل کھو کر نہیں مل سکتا اور اس بارے میں غفلت نہ کرنی چاہیے...... سو بڑی عاجزی اور انکساری کے ساتھ ہم نے بیس ہزار روپیہ چوروں کی نذر کیا اور لالی کو اپنے کلیجے سے لگا کر بیٹھ رہے۔"

جاوید کو مَیں نے اپنی گود میں بٹھالیا اور ڈر کر بولی...... "بیس ہزار روپیہ بھی دیا اور انکساری بھی برتی آپ نے...... بہت بڑا ظرف ہے آپ کا؟......"

بیگم صاحبہ نے دُور افق پر نظریں جمالیں۔ ان کا سُتا ہوا چہرہ لمحہ بھر کو بھیانک ہو گیا اور آنکھیں ایسے چمکیں جیسے رات کو اُن کے بنگلے کا واحد کمرہ روشن ہوتا تھا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولیں...... "لیکن افسوس انکساری تو اور بھی ناقابلِ اعتبار چیز ہے' چوروں کو کب اعتبار آسکتا تھا کہ امیر اتنے امیر نہیں ہو سکتے کہ ہمیشہ اتنی بڑی رقمیں خرچ کر کے اپنے بچوں کو بچالیں...... پہلی بار رقم کی ادائیگی کی تو ہم سمجھے معاملہ نپٹا چکے ہیں۔ وہ بیس پچیس دن ہم نے جس مزے سے گزارے اُن کی یاد میرے جی سے کبھی محو نہیں ہو سکتی...... لالی اور میں لان میں نکل سکتے تھے' جنگلوں میں پھر سکتے تھے' تتلیاں پکڑ سکتے تھے۔ تب پہلی بار مجھے اپنی آزادی کا پورا پورا احساس ہوا تھا۔ اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں لالی کو ایک بار پھر جنم دے کر دنیا میں لائی تھی...... لیکن ہماری یہ مسرت چند روزہ تھی...... چند ماہ بعد ہمیں دھمکیوں سے بھرے خط آنے لگے اور روپے کا مطالبہ دوبارہ شروع ہو گیا۔"

"ظالم بڑے بے درد تھے......" میں آہستہ سے بولی۔

"نہیں۔ ظالم کے کلیجے میں بھی درد ہوتا ہے لیکن وہ اُسے مظلوم کے لیے استعمال نہیں کرتا۔"

وہ ڈاکو بھی بال بچوں والے تھے لیکن میری بار انہوں نے اس حقیقت سے منہ پھیر لیا تھا۔ جب ہم اُن کی دھمکیوں کے ڈر سے واپس گھر جانے کا پروگرام بنانے لگے تو ایک دن۔

"جی!......" میں نے دلچسپی سے آگے جھکتے ہوئے پوچھا۔

"ایک دن مجھ سے لالی بچھڑ گیا...... ظالم ڈاکو آئے اور ایسے دبے پاؤں میرا لالی مجھ سے چھین کر لے گئے کہ میں دہلیز پر کھڑی اُسے پکارتی رہی۔ مَیں نے اسے اتنی آوازیں دیں کہ اترائی میں گونجتی ہوئی لالی لالی کی صدائیں سُن کر لوگ جمع ہو گئے۔ لیکن ڈاکوؤں نے میرا لالی مجھے واپس نہ کیا۔ حمید کارنس پر کہنی ٹیکے سگریٹ پیتے رہے اور انہیں اتنی مہلت بھی نہ ملی کہ اپنی ساری دولت دے کر لالی کو بچالیتے۔"

"بڑا افسوس ہے ظالموں نے آپ کے ساتھ یہ سلوک کیا...... لیکن تقدیر کے آگے کس کا بس چلتا ہے؟"

بیگم صاحبہ نے سر جھکا لیا اور گودی میں رکھے ہوئے ہاتھ مروڑتی ہوئی بولیں...... "ہاں تقدیر کے آگے کس کا زور چلتا ہے...... اگر زندگی کے تمام نقصان ہم تقدیر کے سر نہ تھوپ سکتے تو جینا کتنا دوبھر ہو جاتا؟ اگر ہم یہ کہہ کر اپنی تسلی نہ کر سکیں کہ سب کچھ اٹل ہے تو جینے کو کس کا جی چاہے...... اُسی شام ہمیں واپس لوٹ جانا تھا اگر ہم گھر پہنچ جاتے تو شائد لالی ہم سے کبھی نہ بچھڑتا۔ لیکن وہ ہمارے ساتھ جانا ہی نہ چاہتا تھا۔ جبھی تو وہ بار بار کھڑکی میں چڑھ کر نیچے گیند پھینکتا تھا' اگر وہ کھڑکی میں نہ کھڑا ہوتا۔"

"جی ہاں...... اگر وہ کھڑکی میں نہ ہوتا تو شائد وہ اسے اتنی آسانی سے نہ لے جاسکتے۔"

"ظالم چور نے گیند دکھا کر میرا بچہ مجھ سے چھین لیا۔ اگر مجھے علم ہوتا تو میں ویسے درجنوں گیند لا کر لالی کے قدموں میں ڈھیر کر دیتی...... لیکن تقدیر کے آگے بس نہیں چلتا...... اگر مجھے علم ہوتا کہ لالی آناً فاناً مجھ سے علیحدہ ہو جائے گا تو میں اُسے سارا دن سینے سے چمٹائے بیٹھی رہتی۔"

مَیں نے ایک لمبی سانس لی تو اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے پھر چھنگلی سے آنسو کا قطرہ پونچھ کر وہ بولیں...... اگر مجھے علم ہوتا کہ کھڑکی میں سے گیند پھینک کر لالی بھی پیچھے ہی چھلانگ لگادے گا تو میں کھڑکی میں اینٹیں چنوا دیتی' لوہے کی سلاخوں سے منڈھ دیتی' لیکن لالی تو گر چکا تھا...... اور گرتے ہی اُس کی گردن ٹوٹ چکی تھی...... میں بھاگ کر باہر نکلی تو ظالم ڈاکو میرا لالی لے جا چکا تھا۔ بچوں کو لال گیند کتنی عزیز ہوتی ہے' آپ کا بچہ بھی تو اپنی گیند کی تلاش میں یہاں آیا تھا نا؟"

مَیں نے جاوید کو سینے سے چمٹا لیا۔

مُجرا

نگار بائی نے جب درت کی لے میں آگے بڑھ کر تان اُڑائی اور اپنی سفید بانہہ لچکا کر ڈھلکا دی تو پنڈال میں خوشی اور حیرانی کے باعث نعروں کا ایک زمزمہ پھوٹ نکلا۔ لاہور سے منگوائی ہوئی شاہی قناتیں جن میں سرخ' سفید' سبز اور زرد کپڑوں کی بڑی عمدہ کٹاکاری تھی اس شور کے باعث لرزنے لگیں۔ نگار لہک لہک کر بہک بہک کر' تھرکتی پھڑکتی' کبھی سینے پر ہاتھ رکھ کر کبھی کان سے انگلیاں اٹھا کر پاؤں سے ٹھوکریں مارتی ناچ رہی تھی اس کی آواز لوٹ لوٹ کر کہہ رہی تھی "چن دیا ٹوٹیا وے دلاں دیا کھوٹیا......"

اور ہر بار جب وہ لٹو کی طرح گھیرے دار لہنگے کو پھڑکاتی چکر لگاتی تو یوں لگتا کہ اس لٹو کی رسّی رئیس وزیر علی کی اس آنکھ سے بندھی ہے جس میں بینائی نہیں اور جو ابھی پارسال ایک انگریز ڈاکٹر نے پتھر کی بنا کر وزیر علی کی کھوکھلی آنکھ میں فٹ کی تھی۔

یوں تو اس پیپل والی حویلی میں آئے دن مُجرے ہوتے تھے لیکن نگار نے جو جادو جگا رکھا تھا اس کے سامنے پچھلی طوائفوں کے کرتب کسی مبتدی کی کوشش لگتے تھے۔ نگار' وزیر علی کے ساتھ لاہور سے اسی صبح آئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے حویلی کے سامنے جب کار رُکی اور گلی کے بچے میاں وزیر علی کے گرد اکٹھے ہو گئے تو نگار نے اپنی نیلی آنکھوں سے سیاہ چشمہ اُتارا اور بڑی حویلی پر نظر ڈالی۔ پھولے پھولے بھورے بال اور نیلی آنکھیں دیکھ کر شبراتی کی لڑکی چلّائی...... "میم...... میم"

اس وقت پنڈال میں گیس جل رہے تھے اور نیلی آنکھوں والی نگار جسے سب

نگار بیگم کہتے تھے۔ نیلی رگوں والی بانہہ اٹھا اٹھا کر نیلی پیلی لکیروں والی دری پر گھوم رہی تھی۔ اس مجرے کو دیکھنے والے سارے دیہاتی تو مبہوت تھے ہی لیکن ان دو انجینئروں کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی جو وزیر علی کے دائیں ہاتھ بیٹھے سگار پی رہے تھے اور جو مربیانہ انداز میں اس محفل میں شریک ہونے آئے تھے۔

"مارولس......"

"ونڈر فل......"

وزیر علی کو جیسے ان دونوں کی پسند نے پنگ پانگ کے بال کی طرح فضا میں اُچھال دیا۔ اُس نے سیاہ صدری میں سے سو کا نوٹ نکالا اور پھتّے مسلی کو بلا کر اس کے کان پر رکھ کر نگار کی طرف اشارہ کیا۔ میم نے بھورے بالوں کو نازک انگلیوں سے پرے کیا اور کسی منہ زور گھوڑی کی طرح آگے بڑھی۔ ایک جھپٹے میں پھتّے کے سیاہ کان سے سبزے کی چڑیا اڑ کر نگار کی ہتھیلی میں آ گئی۔

"آپ تو بڑے امیر ہیں......!"

"ونڈر فل...... ونڈر فل......" انجینئروں کا کنبہ بولا۔

نواب وزیر علی بھی نگار کے ناچ سے خوب محظوظ ہو رہے تھے اس کی نازک نازک انگلیوں کے جال میں الجھے ہوئے تھے جب وہ اس کی طرف دیکھ کر کہتی "چن دیا ٹوٹیا" تو وزیر علی کا دل راکٹ کی طرح آسمان کی طرف لپکنے لگتا۔ لیکن آج لچھمن پورے کے نواب کے جی میں رہ رہ کر ایک اور نظارہ بھی ابھر رہا تھا۔ لاہور کے ایک بنگلے نے اس سے احساس برتری چھین لیا تھا اور وہ محسوس کرنے لگا تھا جیسے اس کی زندگی ادھوری ہے۔ بنگلے کے سامنے بڑے پھاٹک پر دو سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ جب وزیر علی کی کار پھاٹک پر رُکی تو اس نے اپنا کارڈ پیش کیا لیکن پہرے دار تو فرعونِ وقت تھے جھٹ دندنائے...... "جناب اندر جانے کی اجازت نہیں۔"

وزیر علی نے جی میں دو ایک وزنی گالیاں دیں اور پھر کہا۔ "ہمارے دیرینہ تعلقات ہیں۔"

"ہم مجبور ہیں صاحب منسٹر صاحب سے آپ کی ملاقات کا وقت مقرر ہوتا تو ہمیں اطلاع کر دیتے۔"

دل میں وزیر علی نے سوچا کہ بھلا ان حضرت کو منسٹر کس نے بنوایا؟ ہم

ووٹیں نہ دلواتے تو آج پھاٹک پر یہ سپاہی ہوتے بھلا! لیکن پھر اسی میں عزت سمجھی کہ کسی طرف سے چل کر فون کریں اور پہلے ملاقات کا وقت مقرر کر لیں۔

وزیر علی کا لہجہ فون پر درشتی مائل تھا۔ "جناب خدا کی درگاہ میں تو بلا اجازت پہنچتے ہیں لیکن حضور کی کوٹھی پر حاضر ہونے کے لیے دربانوں سے نپٹنا پڑتا ہے۔"

ادھر سے ہنسی کی آواز کے ساتھ جواب ملا...... "کون؟ مسٹر وزیر علی؟ آئیے آئیے آپ کیوں رُک گئے میں ابھی پھاٹک پر پیام بھجوا دیتا ہوں۔"

جب دوبارہ وہ منسٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچے تو اس بار دربانوں نے بادل نخواستہ اندر جانے کی اجازت دے دی لیکن برآمدے میں اُن کی طرح کئی اور منتظر کرم تھے۔ کونے میں دو برقع پوش عورتیں مردوں کی طرف پشت کئے بیٹھی تھیں اور رومال جھل رہی تھیں۔ برآمدے سے اندر والے کمرے تک کا مرحلہ صرف بیس روپوں میں حل ہوا۔ چھ گز کے گھیرے والی شلوار پہنے اچکن پر سنہری پٹکا باندھے جب اردلی اُن کے پاس آیا تو انہوں نے چاندی کے ٹرے میں اپنا کارڈ رکھنے کے بجائے آہستہ سے بیس روپے اُسے تھما دیئے اور اس طرح وہ اپنے ایک پرانے دوست کے خلوت خانے میں پہنچا۔

نواب وزیر علی کی نگاہوں میں یہ ٹھاٹھ گھوم رہا تھا۔ اُسے انجینئروں کا جوڑا بھی اس وقت زہر لگ رہا تھا۔ نگار کا حسن گیس کی روشنی میں اور گہرے میک اپ سے بہت تابناک ہو چکا تھا لیکن اس وقت وزیر علی کی نگاہوں میں لاہور کی کوٹھی۔ برآمدے میں بیٹھے ہوئے ملتجی حاجت مند اور کونے میں رومال سے منہ جھلتی وہ دو خواتین گھوم رہی تھیں۔ گاؤں کے جاہلوں پر حکومت کی تو کیا کیا؟ ہماری دولت کس کام آئی؟ رنڈی کو پتلی بنا کر نچوا ڈالا تو کونسی خدائی سر کی۔ وزیر علی نے ملتانی کام کی جوتیاں پاؤں میں اڑسیں اور اٹھتے ہوئے پھتے مسلی سے کہا...... "میرا حقہ بھجوا دو میں چلتا ہوں۔"

نگار کولہے اور کندھے مٹکا رہی تھی۔ وزیر علی کو اٹھتے دیکھ کر دونوں حرکتیں ڈھیلی پڑ گئیں اور وہ پاؤں مارتی پیچھے طبلے والے کی طرف جانے لگی۔

پھتے نے جلدی سے پوچھا "ابھی سے سرکار......؟"

انجینئروں کے دستے میں سے ایک بولا...... "ویل مسٹر وزیر علی آپ تو بے ذوق ہیں۔"

"جی تھک گیا ہوں سفر سے آپ بیٹھئے میری کار آپ کو پہنچا آئے گی......"

پنڈال کی روشنیاں اُسے پیپل والی حویلی تک چھوڑنے گئیں......

پھتا وزیر علی کو برابر دبائے جا رہا تھا لیکن وزیر علی کی کروٹیں کم نہ ہو رہی تھیں۔ حقہ بھی اب ٹھنڈا ہو چکا تھا اور کھڑکی میں پچھلی رات کے تارے بہت پھیکے نظر آ رہے تھے۔ پھتا سمجھتا تھا کہ یہ بے قراری شاید نگار کے لیے ہے لیکن وزیر علی کے ذہن میں لاہور کے ٹھاٹھ گھوم رہے تھے۔ اُس نے دوست کو ووٹیں دلوا کر ایسی بادشاہت کا حقدار بنا دیا اور خود اُسی نحوست بھرے ماحول میں رہا۔ یہاں کے دیہاتی اگر اس کے پاؤں چومتے تھے تو ایسے ہی تھا جیسے شیر کے حضور گیدڑ مؤدب بیٹھے ہوں۔ مزہ تو تب ہی تھا اگر منہ زور شہری بھی اُس سے ڈرتے اور اس کے ہاتھوں میں اُن کی ڈوریاں بھی ہوتیں۔

"مجرا ختم نہیں ہوا ابھی......" مندی مندی آنکھیں کھول کر وزیر علی نے پوچھا۔

"کبھی کا سائیں...... ادھر آپ اُٹھے ادھر محفل اُٹھ گئی۔ نگار کو آپ کے بغیر کون دیکھتا......؟"

اس جھوٹ سے وزیر علی کو آج بے طور کوفت ہوئی کیونکہ ابھی دس منٹ پہلے بھی طبلے کی تھاپ اور گھونگھروؤں کی جھنک اس کے کانوں تک آ رہی تھی۔ وزیر علی نے اوب کر منہ پرے کر لیا۔

نگار سرخ سُوٹ میں ملبوس بغیر دستک دیئے اندر آئی...... اُس کا دلہنوں سا سنگار دیکھ کر وزیر علی کہنی کے بل ہو گیا۔

"آ جاؤ رک کیوں گئیں؟......"

"جایئے ہم نہ بولیں گے آپ سے......!"

"ہیں جناب سائیں سے نہ بولیں گی۔ ان سے بولنے کے لیے تو بڑی سرکار نے پیر محل کے فقیر کے سو چکر کاٹے ہیں۔" پھتا بولا۔

نگار اِٹھلا کر چلنے لگی...... "اب یہ پیر محل کے سو چکر کاٹیں گے تو ہم بولیں......"

وزیر علی نے خضاب رنگی ڈاڑھی میں انگلیاں پھرا کر جلدی سے کہا...... "ادھر

تم نے کمرے سے قدم نکالا۔ ادھر ہم نے اپنے سینے میں پستول داغی......"

"ہائے اللہ نہ کرے......" نگار بھاگ کر اُن کے پہلو میں جا بیٹھی۔

"اتنی خفگی کس لیے؟" وزیر نے سوال کیا۔

"آپ کی بلا سے......"

وزیر علی مسکرا کر بولا...... "ارے ہم اتنے ہی بے نیاز ہوتے تو تمہیں لاہور سے ساتھ لاتے؟"

"مجرے سے تو اٹھ کر آ ہی گئے ناں......؟"

وزیر علی نے ٹھنڈے حقے کا کش لگا کر کہا...... "نگار ایک دُکھ کھا گیا ہے ہمیں...... ایک غم......"

پھتے کی سوکھی گردن فٹ بھر اور لمبی ہو گئی اور اُس نے ہونک کر پوچھا......

"خیر ہے سائیں...... خیر تو ہے......؟"

"خیر کہاں؟...... ہم سمجھتے ہیں کہ ساری عمر رائیگاں گئی...... نہ کچھ خدمتِ خلق کا موقع ملا۔ نہ اپنے پیسے سے فائدہ اٹھانے کا؟"

نگار اور پھتے کی نگاہیں لحظہ بھر کو ملیں اور پھر معجوب ہو کر نگار نے پوچھا......

"ہائے؟ یہ کیا بات ہوئی؟"

"اصل زندگی تو لیڈر کی ہوتی ہے نگار......"

"آپ بھی تو لیڈر ہیں مائی باپ......"

نگار نے ادائے دِلربائی سے کہا...... "ہماری خدمت کیا خدمتِ خلق نہیں ہے حضور؟......"

"تمہیں تو مذاق سوجھا ہے...... تمہیں کیا پتہ اس زندگی کا سرور کیا ہوتا ہے اور طاقت کا نشہ کیا ہوتا ہے؟"

وزیر علی کے تیور دیکھ کر نگار اور پھتا سنجیدہ ہو گئے۔

"تو پھر مائی باپ؟"

"اس بار ہم بھی الیکشن لڑیں گے۔"

سو بسم اللہ...... سو بسم اللہ کون ہے سائیں جو سورج کے سامنے کھڑا رہے......"

"لیجیے اتنی سی بات کا اتنا سوگ منایا آپ نے۔"

وزیر علی نے نگار کے سڈول کندھوں پر اپنی بانہہ کا ٹیڑا جماتے ہوئے کہا۔

"مشکل یہ ہے۔"

"کیا مشکل ہے جی؟......" نگار تنک کر بولی۔

"مشکل یہ ہے میں اپنا نام تک لکھنا نہیں جانتا اور......اور......"

نگار نے فلک بوس قہقہہ لگایا اور وزیر کے ساتھ لٹک کر بولی...... "واہ جی! وہ جو اسمبلیوں میں بھرے ہوتے ہیں وہ پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ واہ میاں جی واہ آپ نے تو وہی بات کی کہ جس کے کندھے پر پنکھ نہ ہوں وہ فرشتہ نہیں ہوتا...... ہم تو ایسوں کو فرشتے سمجھتے ہیں ایسوں کو!"

نگار کی انگلیوں میں جونہی وزیر علی کا چہرہ آیا اُسے محسوس ہوا جیسے وہ اپنے علاقے سے منتخب ہو کر لاہور جا رہا ہے۔

شام گہری ہو چکی تھی۔ تخت پوش پر پیلے چوکور والا کھیس پھیکا پھیکا نظر آ رہا تھا قالین پر جا بجا چھوٹے چھوٹے کاغذوں کے گچھا گچھا ڈھیر تھے جن پر ہر جگہ وزیر علی کے دستخط نظر آتے تھے۔ ساری شام نواب صاحب اپنے دستخطوں کی مشق کرتے رہے تھے اور اب تھک کر کھڑکی سے کھڑے بڑے نلکے پر جوان نوراں کو پانی بھرتے دیکھ رہے تھے۔ نوراں کی سیاہ قمیض کہنیوں تک بھیگ رہی تھی۔ سرخ لاچے کے کنارے پر کیچڑ کے چھینٹے تھے اور وہ نلکا چلاتی ہوئی ہولے ہولے کچھ گنگنا رہی تھی۔

پھتے نے کھنکار کر کمرے میں قدم رکھا تو وزیر علی پلٹ کر بولا...... "کیوں تقریر لکھوا لائے......"

پھتے نے مٹی ملے بالوں میں انگلیاں ڈال کر جواب دیا۔

"عجب بے غیرت ہے جی...... جس کا نمک کھایا اُسی سے بیوفائی۔"

"مطلب؟......"

"میں نے کہا منشی جی نواب صاحب نے تقریر لکھنے کو کہا ہے......"

"پھر......"

منشی کی جواں سال بچی نوراں پانی کا منکا ریشم کے تھان کی طرح سر پر لادے حویلی سے رخصت ہو رہی تھی۔

"پھر جی پوچھنے لگا کیوں چاہیے تقریر؟"

اچھا اس کی یہ مجال؟......

"ہاں جی......اور کہتا ہے تقریر لکھنا کسی کے لیے معاذ اللہ یہ تو گناہ ہے...... گناہ......"

"گناہ کا بچہ......" وزیر علی نے زیر لب کہا۔

"ہاں جی......اور کہتا تھا' بھلا جو وعدے نواب صاحب لوگوں سے کریں گے وہ کبھی پورے ہوں گے۔"

"وعدے کوئی پورے کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔" وزیر علی گرجا۔

"بالکل سائیں...... بالکل...... تقریر تو ووٹیں لینے کے لیے کی جاتی ہے نامائی باپ!"

"اور کیا اچھا کوئی کمی نہیں ہے تقریر لکھنے والوں کی لیکن اس منشی سے بھی میں نپٹ لوں گا...... بول پھتے نوراں کیسی ہے؟"

پھتا ریشہ خطمی ہو کر ہنسنے لگا۔

"بس اس کی نوراں تجھے دلوائیں گے۔ ملّا زادہ! تقریر لکھنے سے انکار کرتا ہے!"

وزیر علی نے اپنے لیے شہر سے بیس اُجلی اور نفیس تقریریں بھی لکھوالیں اور پھتے سے کیا ہوا وعدہ بھی پورا کر دیا۔

جس روز نوراں رات کو اٹھوائی گئی اس کی دوسری صبح کنوئیں میں ملّا زادہ منشی جی کی لاش مرے ہوئے مینڈک کی طرح تیر رہی تھی۔

وزیر علی کی تقریروں نے سارے علاقے میں دھوم مچا رکھی تھی۔ گھر گھر اس کی نیکی کا چرچا تھا۔ جس گھر میں تقریریں نہ پہنچ سکیں وہاں وزیر علی کا نقد ناواں پہنچ گیا۔ شکار کھیلنے کو اس موسم جو بھی افسر آئے انہیں ساتھ تحفتہً ایک ایک بندوق بھی دی گئی۔ اس بار جو بھی دورے ہوئے ان کی میزبانی کے فرائض نواب صاحب نے ادا کیے۔ ایک ہنگامہ تھا کہ بگولے کی طرح ہر طرف اٹھ رہا تھا۔ اور وزیر علی اپنی فتح مندی کے خیال سے خوب بہکنے لگے تھے لیکن جب سے انہیں خبر ملی کہ عورتوں کی ووٹوں پر مس اتفاق حسین مامور ہو رہی ہیں غبارے میں جیسے سوراخ ہو گیا۔ یہ محترمہ لاہور

کے ایک سکول میں ہیڈ مسٹرس تھیں اور ان کی دیانت اور راست گوئی کے چرچے بہت دُور دُور تھے۔

پھتے کی معتبری اب اس حد تک ہو چکی تھی کہ گاؤں والے اُسے چوہدری فتح دین کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ اور نوراں بھی نت نئے تحفے پا کر اپنے مرے ہوئے باپ کو بھول گئی تھی۔

نواب وزیر علی مستری اللہ داد کے بنائے ہوئے بیلٹ بکس دیکھ رہا تھا کہ فتح دین کورے لٹھے کی تہبند پھڑکاتا آنگن میں وارد ہوا......

"سائیں آج تو ملیدہ ہو گیا میرا......"

"اچھا...... یہ دیکھو سات بیلٹ بکس بنا کر لایا ہے مستری۔ انہیں الماری میں رکھ لینا سنبھال کر......"

"حضور کا اقبال دن دُونی ترقی کرے موتیوں والے' منظور احمد بھی بڑے زوروں پر ہے...... میرے تو جی میں آتی ہے راتوں رات اُسے زہر دے دوں......"

"ارے جو گڑ دیتے مرے اُسے زہر کیوں دوں۔ ابھی کل مجھے ملا تھا میں نے کہا حضور ہم تو ایم ایل اے ہونا ہی نہیں چاہتے لیکن لبھن پورے والے مانتے نہیں۔ ہماری دعائیں تو آپ کے ساتھ ہیں۔"

فتح دین نے قہقہہ لگا کر کہا......"حضور آپ کا جواب نہیں سیاست تو آپ کے گھر کی باندی ہے۔"

"خوش ہو گیا بے چارہ...... ہمارا کیا مقابلہ کرے گا۔ ایک ایک ووٹ خریدی ہوئی ہے ہماری...... اور خدانخواستہ کہیں گڑبڑ ہو گئی تو مستری کے ڈبے کام آئیں گے۔"

فتح دین ذرا خاموش ہو کر پرے ہٹ گیا۔ اس کا تشویش بھرا چہرہ دیکھ کر نواب وزیر علی نے سوال کیا......"بات کیا ہے فتح دین یہ منہ کیوں اترا ہے تمہارا؟"

"جی سنا ہے مس اتفاق حسین بڑی سخت ہے۔ عورتوں کی طرف کچھ گڑبڑ نہ مچائے......"

خضاب بھری ڈاڑھی میں وزیر علی کی انگلیاں ڈوب گئیں اور پتھر والی آنکھ بھی جان دار ہو کر کچھ سوچنے لگی......"واقعی خطرہ ہے کیا؟......"

"ہاں جی...... میں نے ملنے کی کوشش کی تھی وہ تو جی کسی کو ملنا بھی گناہ سمجھتی ہے......"

طنز بھری مسکراہٹ کے ساتھ وزیر علی بولا......"ہوں؟...... یہ بات ہے......"

"ہاں جی یہ نہ ہو عورتوں کے حصے میں بات ہی نہ بنے......"

"تم کار نکلواؤ ذرا میری...... میں شیخ طائر کے پاس جاتا ہوں۔"

"مجھے آج دفتر میں ملے تھے......"

"اخباری دنیا کے آدمی ہیں آدھی دنیا ہاتھ میں ہے...... ایسا جان دار اخبار چلاتے ہیں بس یوں معاملہ نپٹ لوں گا......"

الیکشن سے دس دن پہلے طائر صاحب کے اخبار نوید جہاں میں مس اتفاق حسین کے خلاف جو ایجی ٹیشن شروع ہوئی تو تین برس تک ختم نہ ہوئی۔ محکمے میں ہزاروں خط ان کے اخلاق کے خلاف پہنچے۔ ان کی سیرت، بددیانتی، بدطینتی پر جو سیر حاصل مضمون لکھے گئے اُن کی نوعیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ بیچاری مس اتفاق حسین آج کل صحرا کے ایک پرائمری سکول میں سیکنڈ مسٹرس ہیں۔

اس معاملے میں نواب وزیر علی کو دخل تھا یا نہ تھا اتنی بات ضرور ہوئی کہ مس اتفاق حسین لبھن پورے میں عورتوں کی ووٹوں پر نگران نہ رہیں۔

پنڈال میں گیس جل رہے تھے۔

نگار کے سفید ہاتھوں میں پور پور مہندی رچی تھی۔ لہنگے میں اتنا پکا گوٹا ٹکا تھا کہ اُس کے کولہے پر اس کا بوجھ بری طرح محسوس ہو رہا تھا۔ ہری، پیلی سرخ ٹکڑیوں والی قناتیں نگار کی ہوک بھری آواز سے لرز رہی تھیں۔ مجمع میں آج دیہاتیوں کی منڈلی علیحدہ تھی اور افسروں کے لیے کرسیوں اور صوفوں کی قطاریں قالینوں پر سجی تھیں۔

وزیر علی ایم ایل اے ہو چکے تھے......

طبلے کی تھاپ بہت اونچی تھی...... لیکن نگار کی آواز میں آج کھنک نہ تھی۔

درت کی لے پر آگے بڑھتے ہوئے اس کی نظریں کسی کو ٹٹول رہی تھیں۔ اور وہ ٹوٹی ہوئی پتنگ کی طرح بار بار ڈولتی تھی۔ جس پتھر کی آنکھ سے نگار کی ڈور بندھی تھی وہ اس

وقت لاہور میں ایک سانولے سے چہرے پر مرکوز تھی یہ چہرہ نہ تو نگار کی طرح سفید تھا نہ نیلی آنکھوں سے آراستہ تھا۔ وزیر علی صاحب منسٹر صاحب کی لڑکی کو شاپنگ کرانے لے جا رہے تھے اور بڑا فخر محسوس کر رہے تھے۔ آج انہیں اپنی زندگی پنگ پانگ کے بال کی طرح اچھلتی کودتی نظر آ رہی تھی۔

ڈیری فارم

جون کے مہینے سے کچھ پہلے جب کہ ابھی سڑک کی کولتار پگھل کر کناروں تک نہ آئی تھی، ہماری عادت تھی کہ اپنی اپنی سائیکلیں لے کر ڈیری فارم تک گاتے ہوئے جاتے۔ لیکن ڈیری تک پہنچ کر ہم میں آگے بڑھنے کی ہمت نہ رہتی کیونکہ ہم میں سے ہر ایک غیر شعوری طور پر ڈیری سے ڈرتا تھا۔ کبھی کبھی جب ہم بہت دیدہ دلیر ہو جاتے تو سڑک سے اُتر کر ڈیری فارم کے فٹ پاتھ تک چلے جاتے۔ پھر ہم عمارت کی نکڑ پر چھپ کر سانس روک کر کھڑے ہو جاتے۔ اب گروہ کا سب سے زیادہ دلیر لڑکا ہولے ہولے گردن سرکاتا ہوا ڈیری کی جانب کنکھیوں سے دیکھتا کہ فارم میں کیا ہو رہا ہے؟

عام طور پر وہاں کی فضا خاموش ہوتی اور ڈیری کا دروازہ بند ہوتا۔ پھر ایسے میں ہم اور بھی خوفزدہ ہو جاتے اور سامنے گزرنے سے کتراتے کیونکہ ہمیں احساس تھا کہ عمارت کی دوسری طرف کوئی ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ کبھی کبھی عمارت کی بڑی کھڑکی میں ٹنگے ہوئے پردوں کا ایک سرا آہستہ آہستہ سرکتا اور ایک عورت کا چہرہ دکھائی دیتا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی ہم سب ڈر سے کانپنے لگتے۔ پھر ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھے بغیر کتنی ہی دیر وہاں کھڑے رہتے اور بالآخر پچھلی گلی میں سے پیدل چلتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔

لیکن یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ابھی تک ڈیری میں کچھ نہ ہوا تھا۔

جب پہلی بار مجھے ڈیری کی طرف جانے کا اتفاق ہوا تو میں ڈر سے کانپ گیا۔ وہ بڑی گرم صبح تھی۔ رات کو بھی شدت کی گرمی رہی تھی اس لیے میں صبح سویرے ہی

اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے چادر اتار دی اور صبح کی ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھانے لگا۔ سارا شہر سو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ صبح کی خاموشی میں شہر کے شور بیدار ہوئے۔ پاس والی گلی میں سے ایک چھوٹے بچے نے بولنا شروع کر دیا۔ ایک بوڑھا کھانستا ہوا گزر گیا۔ پھر گھر کے دروازے کھلنے کی آواز آئی۔

کچھ دیر کے بعد اماں میرے کمرے کے پاس سے گزریں۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا پھر جب نلکے چلنے لگے تو میں اماں کے پیچھے پیچھے باورچی خانے میں چلا گیا۔ اماں چوکی پر بیٹھی آگ سلگانے میں مصروف تھیں۔ باورچی خانے سے لہسن، پیاز اور باسی برتنوں کی باس آ رہی تھی مجھے دیکھتے ہی انہوں نے منہ موڑ کر کہا۔ "آج دودھ والا نہیں آیا اور تمہیں دودھ لانا پڑے گا۔" خوف کے مارے میرے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "امی ڈیری سے؟"

"نہیں تو اور کہاں سے؟" وہ غصے سے بولیں۔

میں ڈیری میں رہنے والی عورت کے متعلق سوچنے لگا۔ میرے سامنے وہ کالی سیاہ آنکھیں آ گئیں جو پردے کے پیچھے سے جھانکا کرتی تھیں۔

"امی ہم کچھ دیر انتظار نہیں کر سکتے کیا؟ میرا خیال ہے دودھ والا آ ہی رہا ہو گا۔ میں باہر جا کر دیکھوں؟"

امی نے چھوٹی بالٹی کو پانی سے ہنگال کر مجھے تھماتے ہوئے کہا۔ "دو سیر دودھ جلدی سے لے آؤ۔ میرا خیال ہے دودھ والا نہیں آئے گا۔ کل ہی وہ گرمی کی شکایت کر رہا تھا۔ جلدی آنا تمہارے ابا جی اٹھ کر چائے مانگیں گے۔"

باہر سڑک پر نکلتے ہی مجھے گرمی کا احساس ہونے لگا۔ میں ڈیری سے کچھ دور عمارت کی نکڑ پر کھڑا ہو گیا اور اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ لوگوں کی آمدورفت شروع ہو جائے تو میں فارم کی دکان پر جاؤں۔ میں کتنی ہی دیر کھڑا رہا اور جب سامنے والی کوٹھی میں سے ایک خانساماں ٹوکری لے کر نکلا تو میں قدرے دلیری سے فارم کی طرف بڑھا۔ چلتے چلتے میں یہی سوچ رہا تھا کہ اندر گھسنے کے بعد میں دروازہ کھلا رکھوں گا تاکہ بھاگنے کا راستہ کھلا رہے۔

ڈیری دراصل لبِ سڑک ایک کوٹھی نما عمارت تھی۔ سامنے کا بڑا کمرہ بطور دکان استعمال ہوتا تھا۔ اور باقی گھر میں دکان والے رہتے تھے۔ دکان کی بڑی بڑی

کھڑکیوں میں موٹی لیس کے پردے ٹنگے تھے۔

دروازہ کھولتے ہی مجھے علم ہو گیا کہ میں دروازے کے متعلق غلط اندازے لگا رہا تھا۔ جونہی میں نے پٹ کھولے گھر کے اندر گھنٹی بجنے لگی۔ کتنی ہی دیر میں کھڑا رہا اور گھنٹی بجتی رہی معاً مجھے خیال آیا کہ شاید مسلسل گھنٹی کی آواز سن کر وہ عورت ناراض نہ ہو جائے اسی لیے ایک دھماکے سے میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اور پٹ کے ساتھ پشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ہاتھوں میں پسینہ آ گیا اور حلق خشک ہو گیا۔

دکان کے اندر قدرے ٹھنڈ تھی کیونکہ دیواریں اور فرش سفید ٹائلوں سے بنی ہوئی تھیں۔ سامنے ایک لمبا سا کاؤنٹر بھی ٹائیلوں ہی کا تھا۔ گھر کے اندر سے کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔ دکان سے اندر جانے والے دروازے میں لمبے لمبے شیشے لگے ہوئے تھے میں نے ان میں سے جھانکا' کوئی بھی نہ آ رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اگر چند منٹ اور کوئی نہ آیا تو میں آرام سے گھر چلا جاؤں گا۔ اور امی کو بتا دوں گا کہ دکان پر کوئی بھی موجود نہ تھا۔

میں ابھی جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اندر کھلنے والا دروازہ کھلا اور ایک آدمی اندر آ گیا۔ میں اب تک اسی عورت کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے وہم و گمان تک میں نہ تھا کہ اس عمارت میں کوئی آدمی بھی رہ سکتا ہے۔ آدمی کو دیکھتے ہی میرا ڈر کم ہو گیا۔ وہ میرے قریب آ کر رک گیا اور بڑے مؤدب لہجے میں بولا...... "اسلام علیکم جناب۔"

اس سے پہلے آج تک مجھے کسی نے جناب کہہ کر نہ پکارا تھا۔ پہلے تو مجھے خیال آیا کہ وہ میرا مذاق اڑا رہا ہے لیکن جب میں نے اسے غور سے دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کسی کا تمسخر اڑانے والا شخص نہ تھا۔ اس کی نم آلود آنکھیں کو کرسٹیپل کی طرح شفقت سے لبریز تھیں اور آواز میں عقیدت مندی تھی۔

میں نے بالٹی بڑھا کر کہا۔ "جی دو سیر دودھ......"

اس نے غور سے مجھے دیکھا اور بالٹی لیتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ یہیں کہیں رہتے ہیں؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب دیئے بغیر کہا۔ "جی وہ دودھ والا آج نہیں آیا۔ کیا وہ بیمار ہے؟"

"سب بیمار ہیں' سب کے سب...... کسی کا دل بیمار ہے کسی کی روح......"

مجھ سے زیادہ وہ اپنے آپ سے بولا۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔ "اچھا تو کیا آپ دودھ لینے آیا کریں گے؟ کیا نام ہے آپ کا؟"

"جی میں آیا کروں گا...... اور جی مجھے شفقت کہتے ہیں۔"

"شفقت...... اچھا نام ہے شفقت......"

پھر وہ کھڑکیوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ "اگر کبھی میرے ہاں لڑکا ہوتا تو میں اس کا نام شفیق رکھتا...... شفیق!......"

"کاش میرا نام شفیق ہوتا مجھے بھی شفقت نام سے بڑی نفرت ہے۔"

اس نے میری بالٹی کو جھلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں نہیں بھئی ایسی بات نہ کہو...... میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ اگر میرے ہاں لڑکا ہوتا تو اس کا نام شفیق ہوتا۔ شفیق بڑا اچھا نام ہے...... پتہ ہے شفیق نامی لڑکے بڑے شفیق ہوتے ہیں......"

"جی...... شفقت تو لڑکیوں کا نام ہونا چاہیے' سکول میں سارے لڑکے مجھے شفقی پکارتے ہیں۔"

اس نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "شفقی بھی اچھا نام ہے شفقی شفقی......"

پچھلے دروازے کے پیچھے سے ذرا سی آواز آئی جیسے کوئی سلیپر گھسیٹ کر چل رہا ہو۔ وہ آدمی یک لخت رک گیا اور جلدی سے بولا۔ "اچھا بھئی دو سیر دودھ...... میں ابھی لایا...... ذرا مجھے پچھلے آنگن تک جانا ہو گا۔"

جب وہ چلا گیا تو میں اس کے متعلق سوچنے لگا۔ اس سے پہلے میں نے اسے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس سے باتیں کرنا آسان تھا اسی لیے وہ مجھے بہت اچھا لگا۔ اس کے بال بوڑھے آدمیوں کی طرح بالکل سفید تھے۔ لیکن اس کی باتیں ہمارے بڑوں سے بہت مختلف تھیں۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے میں کسی اپنے دوست سے بول رہا ہوں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ شاید اس کا قد بہت چھوٹا ہے اسی لیے مجھے اس سے ڈر نہیں لگا۔ وہ اباجی کے برعکس بے حد دبلا پتلا' اور نرم دل نظر آتا تھا۔ ابھی میں اس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ وہ دودھ سے بھری بالٹی لے کر واپس آ گیا۔

"کیا تم سگریٹ پیتے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"نہیں......" میں نے جلدی سے جواب دیا لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے علم ہو گیا کہ اگر میں سچ بھی کہہ دیتا تو اسے رنج نہ ہوتا۔

"ٹھیک ہے ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ تمہاری عمر کیا ہے؟"

"نو سال پورے ہو چکے ہیں دسواں جا رہا ہے۔"

"سولہویں سال میں سگریٹ نوشی شروع کرنی چاہیے لیکن اگر میرے ہاں لڑکا ہوتا تو میری تمنّا ہے کہ میرے سامنے سگریٹ پیتا۔ بھلا باپ سے چھپ کر سگریٹ کیوں پیئے جائیں؟"

میں اس بات کا جواب نہ دے سکا کیونکہ ابّا جی کا خوفناک چہرہ میری نظروں کے سامنے آ گیا تھا۔ اور میں جانتا ہوں ایسے موقعوں پر ان کا سارا غصہ ہاتھوں میں آ جاتا تھا۔ میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔"

اس نے میری بالٹی مجھے دیتے ہوئے بات کی۔ "ہاں بھئی...... کل بھی آؤ گے؟"

اس کی آواز سے مجھے احساس ہوا کہ وہ چاہتا ہے میں دوسرے دن بھی آؤں اس لیے میں نے کہا۔ "شاید!"

پھر اس نے بڑھ کر میرے لیے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو سلام علیکم شفی۔"

میں بالٹی کو چھلکنے سے بچاتا ہوا آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ عین نکڑ کے قریب پہنچ کر میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ ابھی تک دروازہ کے باہر کھڑا تھا۔

جب میں گھر پہنچا تو اماں میری تاخیر پر ناراض نہ ہوئیں بلکہ چھلکتی ہوئی بالٹی دیکھ کر بولیں...... "تو وہ گوالا روز بے ایمانی کرتا تھا نا؟ میں بھی کہتی تھی دودھ پورا نہیں لاتا...... لیکن تمہارے ابّا کبھی مانیں بھی۔"

دوسری صبح میں جلد اٹھا اور اماں کے اٹھنے سے پہلے بالٹی اٹھا کر ڈیری کی طرف چل دیا۔ جب میں برآمدے میں سے گزرا تو بیٹھک کے کلاک نے ساڑھے پانچ بجائے۔ لیکن جب میں ڈیری میں پہنچا تو اس کا دروازہ کھلا تھا اور وہی آدمی بالٹی لے کر باہر نکل رہا تھا۔

اس نے مجھے دیکھتے ہی مسکرا کر کہا۔ "آج تو بڑی صبح آئے ہو شفی؟ شاید تمہیں صبح اٹھنے کی عادت ہے؟"

اس نے چھوٹی آستین کی قمیض پہن رکھی تھی۔ گریبان کھلا تھا اور اندر کی جلد

آٹے کی طرح سفید نظر آ رہی تھی۔

"کل میں شہر سے باہر چڑیاں پکڑنے گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"پھر کچھ ملیں؟"

"چند ایک ملی تھیں لیکن......"

"لیکن؟"

"ابّا جی نے وہ سب کی سب اڑا دیں۔ وہ کہتے تھے گھر میں گند ڈالیں گی۔" میں نے آہستہ سے کہا لیکن میں نے اسے یہ نہ بتایا کہ میں رویا بھی تھا۔

اس کا چہرہ یک لخت سرخ ہو گیا' اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "کبھی مچھلیاں پکڑنے گئے ہو شفی؟"

"جی!"

"اور کبھی تلیئر مارے ہیں بندوق سے۔"

میں نے نظریں جھکا کر آہستہ سے جواب دیا۔ "جی!"

"بڑا پُر لطف شکار ہوتا ہے...... اگر میرے پاس لڑکا ہوتا تو میں اُسے شکار کرنا سکھاتا۔ میں اسے 22 کی گن لے دیتا۔ پھر اسے وہ ساری جگہیں دکھاتا جہاں تلیئر اُترتا ہے...... بڑا پُر لطف شکار ہوتا ہے تلیئر کا بھی......"

اس نے اپنی نگاہیں کھڑکی سے دُور کہیں جما لیں اور لمبی سی آہ بھری۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے میری بالٹی مجھ سے پکڑتے ہوئے پوچھا۔ "وہ دو سیر دودھ شفی؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا لیکن اس نے جانے کی کوشش نہ کی۔ اس کے بجائے اس نے میرا کندھا چھو کر پوچھا۔ "شفی بڑے ہو کر تم کیا بنو گے؟"

"مجھے ایک مجسٹریٹ کا منشی بننا ہے ابّا جی کی طرح......"

"ضروری یہی کچھ بننا ہے بھلا وہ کیوں؟"

"ابّا جی کہتے ہیں مجھے بننا ہی پڑے گا۔ میں تو نہیں چاہتا لیکن...... میں تو چاہتا ہوں کہ چچا جان کی طرح نیوی میں بھرتی ہو جاؤں...... وہ لوگ سفید وردی پہنتے ہیں۔ پہنتے ہیں نا!"

"ہاں بھئی پہنتے تو ہیں۔" پھر اس نے ایک لمبی سانس بھری اور آہستہ سے کہا۔ "ممکن ہے شفی حالات بدل جائیں اور تمہیں مجسٹریٹ کا منشی نہ بننا پڑے۔ جب تم

بڑے ہو جاؤ گے تو بہت ممکن ہے تمہارے ابّا جی اس قدر اصرار نہ کریں گے...... اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس قدر فکر نہ کرتا......"

ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ سڑک پر لوگوں نے آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ دروازوں کے کھلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کھڑکی میں سے سورج کی تیکھی کرنیں اتر کر فرش پر بکھر گئیں اسی روشنی میں مَیں نے دیکھا دروازہ ہولے سے کھلا اور ادھ کھلے پٹ میں وہی لمبی دُبلی پتلی عورت کھڑی نظر آئی۔

"تمہارے کتنے بہن بھائی ہیں شفّی؟"

بہت دیر تک میں جواب نہ دے سکا۔ میرا خیال تھا کہ وہ عورت دیر سے ہم دونوں کی باتیں سُن رہی تھی۔ اور اس کے ماتھے کی تیوریاں کہہ رہی تھیں کہ وہ ہماری گفتگو سے ناخوش تھی۔

بالآخر میں بولا۔ "جی وہاں کوئی کھڑا ہے جی۔"

اس کا چہرہ یک لخت بدل گیا مجھے ایسے لگا جیسے اس کی طبیعت کی ساری نیکی اور شفقت ختم ہو گئی۔ میرے سامنے ایک منحنی سا آدمی کھڑا تھا۔ جس کی گردن پر موٹی موٹی نیلی نسیں ابھری ہوئی تھیں۔

وہ بالٹی اٹھا کر باہر چلتے ہوئے جلدی جلدی بولا۔ "اچھا بھئی آج تو مجھے بڑی جلدی ہے...... کل پھر تم سے ملوں گا۔"

لیکن پھر دوسرے دن میں اس سے نہ مل سکا۔ کیونکہ ہمیں یک دم شہر چھوڑ کر خالہ کی شادی پر جانا پڑا۔ جب ہم واپس آئے تو اگست چڑھ چکا تھا۔ اس عرصہ میں ایک بوند بھی بارش کی نہ پڑی تھی۔ اور سارا شہر گرمی میں دھونسا ہوا تھا۔ شہر کے باسی گرمی سے مرجھائے ہوئے تھے۔ جہاں کہیں بھی وہ کھڑے ملتے اسی گرمی کی شکایت کرتے اور بار بار آسمان کی طرف دیکھتے۔

شام کا وقت تھا جب میں دوبارہ ڈیری میں گیا۔ اندر ٹھنڈک تھی۔ گھنٹی اونچے سے بجنے لگی تو میں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ کتنی ہی دیر مَیں کھڑا اندر کا دروازہ دیکھتا رہا۔

بڑی دیر کے بعد وہ آدمی اندر سے نکلا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس عرصے میں اس کے کندھے کچھ اور خمیدہ ہو گئے ہیں۔ چہرے پر جھرّیوں نے یورش کر دی ہے اور

بال تمام کے تمام راکھ آلود نظر آتے ہیں۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے مجھے اوپر سے نیچے ایسے دیکھا جیسے امّاں اس وقت دیکھا کرتی ہیں جب میں کوئی اچھا کام کرتا ہوں۔ پھر اس کے ہونٹ مسکراہٹ بن کر اوپر اٹھ گئے۔

اتنے میں دروازے کے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ اٹھی۔ پھر میں نے اس عورت کو دروازے میں کھڑے پایا۔ اس کا دُبلا پتلا چہرہ لاشے کی طرح سفید بے جان اور پُراسرار تھا۔ اس نے ماتھے سے کھینچ کر بال بنا رکھے تھے اسی لیے اس کی گالوں کی ہڈیاں اور بھی ابھری ہوئی نظر آتی تھیں۔ ہونٹوں میں لہو کا نام و نشان تک نہ تھا اسی لیے اس کا چہرہ دیکھ کر روحوں کا خیال آتا تھا۔

اس نے مجھے آنکھوں کے بڑے بڑے حلقوں سے گھور کر دیکھا' ایک دُبلا پتلا ہاتھ دوپٹے تک پہنچا۔ ہاتھ کی نسیں چھوٹے چھوٹے سنپولیوں کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔

"صرف ایک سیر......" میں نے اس سے نظریں چرا کر کہا۔

آہستہ آہستہ میں اپنی پیٹھ دروازہ کی طرف کر کے پیچھے ہٹنے لگا۔

"صرف ایک سیر......؟" آدمی نے پوچھا۔

ایک عرصہ تک میں فرش کو گھورتا رہا۔ شاید ایک قرن بیت گیا اور ابھی میں فرش کو ہی تک رہا تھا۔ لیکن وہ عورت مجھے صاف صاف نظر آ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے گھور رہی ہے لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لیتا۔ میں نے فرش کے ٹائیل گنے آدمی کے جوتے دیکھے کونے میں گرے ہوئے دودھ کے دھبے کا جائزہ لیا اور بالآخر اپنے ڈر سے گھبرا کر میں نے عورت پر نظر ڈالی۔

وہ اپنی جگہ کھڑی تھی اور مجھے گھور رہی تھی۔ دیر تک خاموشی رہی اور پھر اس کے دھنسے ہوئے گالوں میں بھینچے ہوئے بے رنگ ہونٹ ہلے' اس کی مسکراہٹ کسی تازہ کفنائی ہوئی لاش کی طرح بھیانک تھی۔ یک لخت میری گردن کے مسام کھڑے ہو گئے۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میں چیخ رہا ہوں لیکن میرا منہ بند تھا اور آواز حلق سے باہر نہ نکلتی تھی۔

چند لمحے بعد وہ آدمی میری بالٹی لے کر آگے بڑھا تو میں نے بالٹی لے کر باہر بھاگنے کی راہ لی۔

دوسرے دن جب میں باغ میں کھیل رہا تھا تو اماں نے مجھے ٹوکری تھماتے ہوئے کہا...... ”دیکھو اس میں مَیں نے چٹ لکھ کر رکھ دی ہے یہ چیزیں ڈیری سے لے آؤ۔ اور یہ ایک آنہ تمہارے لیے ہے پتنگ لے آنا۔“

میں ڈیری میں جانا نہ چاہتا تھا لیکن میں اماں سے نہ کہہ سکا کہ مجھے اس عورت سے ڈر لگتا ہے۔ کیونکہ اگر میں انہیں یہ بتا دیتا تو ابا جی مجھے رات کو وہاں بھیجتے۔ اسی لیے ٹوکری لے کر میں ڈرتے ڈرتے وہاں پہنچا۔

وہ دونوں دکان میں موجود تھے۔

جب میں داخل ہوا تو دونوں نے میری طرف دیکھا۔ پھر عورت نے لبوں کے کونے سکیڑ کر آدمی کی طرف نظر کی میرا خیال ہے وہ کچھ دیر پہلے میرے ہی متعلق باتیں کر رہے تھے۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹوکری میں سے چٹ نکالی۔ ہاتھوں پر نسیں پھول کر باہر کو ابھری ہوئی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے ناخن دانتوں سے کترے گئے ہیں۔

اس نے سنگِ مرمر ایسی ٹھنڈی اور مردہ آواز میں کہا۔ ”دو ڈبل روٹیاں‘ چار مکھن...... آدھ پونڈ بسکٹ‘ دو درجن انڈے......“

آدمی مکھن لینے کے لیے بڑھا‘ دیوار کے پاس پہنچ کر وہ رُک گیا۔ ایک کیل پر قریباً چار فٹ لمبی پتلی سی تار ٹنگی تھی۔ دونوں کناروں میں چھوٹی چھوٹی لکڑیاں بندھی تھیں۔ اس نے یہ تار اٹھالی اور جڑی ہوئی ڈبل روٹیوں کی قطار میز پر رکھ کر تار سے انہیں علیحدہ علیحدہ کر لیا۔ پھر تار کو پونچھ کر اسے اپنی جگہ لٹکا دیا اور کنکھیوں سے مجھے دیکھ کر مکھن اٹھانے کے لیے جھکا۔

”مکھن چار ٹکیاں......“ عورت نے بغیر ہلے جُلے کہا۔

ڈیری کو چھوڑتے وقت مجھے دروازے کے ساتھ بڑی دقت پیش آئی پھر گھنٹی اس زور سے بجی کہ میرا دل دَھک دَھک کرنے لگا۔ جب میں کھڑکی کے سامنے سے گزرا تو مجھے اس کا پتلا دُبلا وجود پردے کے پیچھے کھڑا نظر آیا میں جانتا ہوں وہ مجھے غور سے دیکھ رہی ہے۔

ستمبر کے وسط میں یک دم طوفانی بارشیں شروع ہو گئیں۔ سارا اگست بارش کے لیے دعائیں کرتا نکل گیا تھا۔

جب پہلی بار بادل گھرے تو لوگ گھروں میں سے نکل باہر آگئے۔ اور گردنیں اٹھا اٹھا کر بادل دیکھنے لگے۔ پڑوسیوں نے ایک دوسرے کو آوازیں دیں۔ بوڑھے چارپائیاں نکال کر سڑک پر بیٹھ گئے اور پرانے قصے لے بیٹھے۔

بادل شہر پر جم کر کھڑا ہو گیا۔ پہلے چھوٹے چھوٹے روئی کے پھاہے سے اکٹھے ہوئے پھر گدلے اندھیارے بادل سمٹ سمٹا کر ایک مٹیالی چادر بن گئے پھر کبھی بادل سرخ ہو جاتے‘ کبھی زرد‘ کبھی سیاہ اور سورج کے ڈوبتے ہی سارا شہر اندھیرے میں ڈوب گیا اور پیسے پیسے برابر بوندیں برسنے لگیں۔

یک لخت بجلی کی کڑک بند ہو گئی‘ بادل چھٹ گیا‘ بوندیں ختم ہو گئیں اور چاند گرمی کو بھگاتا ہوا بادلوں میں سے نکل آیا۔

دوسری صبح میں خوش خوش سائیکل پر چلا جا رہا تھا۔ جب ایک عورت نے مجھے اشارہ کر کے اپنی طرف بلایا۔

میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ”وہ ڈیری میں تمہیں کوئی آدمی بلا رہا ہے۔“ وہ آدمی دکان کی سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے جلدی سے دروازہ کھولا اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں ہچکچایا تو وہ بولا۔ ”ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے شفقی اب وہ یہاں نہیں ہے۔“

حیرانی سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کی کھچڑی ڈاڑھی خوف و غم سے لرز رہی تھی۔

”طوفان اس کا ذمہ دار ہے...... طوفان نے یہ سب کچھ کیا سب کچھ شفقی؟“

اس نے دو مرتبہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن بول نہ سکا۔ ایک لمبی خاموشی کے بعد وہ تھوک نگل کر بولا۔ ”تمہارا باپ مجسٹریٹ کا کلرک ہے نا؟“

”جی وہ مجسٹریٹ صاحب کے منشی ہیں۔“

”ہاں...... ہاں...... منشی منشی میں بھول گیا تھا۔“ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ بالوں میں پھیرے اور منہ ایسے رگڑنے لگا جیسے اسے دھو رہا ہو۔

ہولے ہولے مسکراتے ہوئے اس نے جیب میں سے ایک خط نکالا اور آہستہ سے کہا۔ ”یہ خط اپنے ابا جی کو دے دو گے نا؟“

جب میں خط لے کر اپنے گھر پہنچا اباّ جی باہر جا رہے تھے انہوں نے عینک کے اوپر سے مجھے ایک کڑی نظر سے بھانپا اور پھر لفافہ چاک کر کے پڑھنے لگے۔ جوں جوں تحریر ان کی نظر سے گزرتی گئی ان کا رنگ متغیر ہوتا گیا۔ پھر وہ اماّں کو بلاتے ہوئے بولے...... ”لاحول ولا۔ اس لڑکے کو باہر نہ نکلنے دینا۔ کم بخت ایک سے ایک مشکل میں پھنساتا ہے۔“

”کیا ہوا؟“ اماّں نے پوچھا۔

”ڈیری میں کچھ ہو گیا ہے۔“

میں نے انہیں لب سکوڑ کر کہتے سنا۔ ”قتل!......“

لیکن میں آنکھ بچا کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ جب میں نکڑّ پر پہنچا پولیس ڈیری کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہ بڑی دیر تک اندر رہے۔ اس اثنا میں بہت سارے لوگ سڑک پر اکٹھے ہو گئے تھے۔ میں سڑک کے دوسرے کنارے کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا۔ پھر وہ سپاہی اندر سے نکلے اور لوگوں کو ہٹانے لگے۔

سپاہیوں نے اسے ہتھکڑی نہ لگائی تھی۔ جب وہ باہر نکلا تو لمحہ بھر کے لیے سیڑھیوں پر رُکا اور لوگوں کو دیکھنے لگا۔ صاف قمیض اور شلوار پہنے وہ بے حد سنجیدہ اور معتبر لگ رہا تھا۔ مجھے رونا آ گیا۔

سڑک پر مکمل خاموشی تھی اور لوگ غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر کوئی عورت گروہ میں سے چیخی...... ”قاتل...... قاتل......“

باقی لوگوں نے اس کی چیخ کو اپنی پکار بنا لیا۔ سپاہیوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا اور جیپ کی طرف لے چلے۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر وہ لوگوں سے بولا۔ ”میں قاتل نہیں ہوں...... میں نے اسے نہیں مارا۔ وہ تو عرصہ سے مر چکی تھی ایک عرصہ سے......“

لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

وہ چیخا...... ”وہ تو مدت سے مر چکی تھی۔ وہ کبھی زندہ ہوتی تو مرتی وہ تو ہمیشہ سے مردہ تھی...... سمجھے؟ سمجھے؟...... کبھی زندہ نہ تھی ورنہ...... ورنہ...... میرے پاس بھی...... میرے پاس بھی 22 کی بندوق ہوتی...... تم نہیں سمجھتے اس نے مجھے کیا کر ڈالا تھا...... کیا کر ڈالا تھا مجھے!“

پولیس کے سپاہی اس کے بعد جیپ میں سوار ہو گئے اور گاڑی چل دی۔ نکڑّ پر جیپ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو کچھ دیر کے لیے لوگ کھڑے رہے پھر آہستہ آہستہ گروہ منتشر ہونے لگا۔ میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا جب دو آدمی گفتگو کرتے ہوئے میرے قریب سے گزرے۔ ایک نے کہا۔ ”پتہ نہیں اسے قتل کیسے کیا ہو گا نہ کوئی پستول نکلی...... نہ کوئی چُھری......؟“

کچھ دیر تک میں بھی کھڑا سوچتا رہا کہ یہ قتل کیسے ہوا ہو گا۔ پھر مجھے یاد آ گیا کہ اس نے طوفان کے متعلق کیا کہا تھا۔ تب میری نگاہوں کے سامنے سارا منظر آ گیا۔ میں اسے طوفان والی رات بجلی کی چمک میں آہستہ آہستہ بڑھتے دیکھ رہا تھا وہ اس دیوار کے پاس پہنچا جہاں چار فٹ تیکھی تار ٹنگی تھی اس نے لکڑی کے سرے ہاتھوں میں لیے پھر گربہ پائی سے عورت کی پیٹھ کی طرف بڑھا اس کے ہاتھ ہوا میں اٹھے اور...... ایک چیخ گونجی......

اس کے بعد کتنا ہی عرصہ ڈیری خالی رہی، ہم کھیلنے کے لیے کبھی اس کے قریب نہ گئے۔ جب بہار آئی تو پھر ہم سب سائیکلوں پر چڑھ کر اس سڑک پر روند کو نکلنے لگے لیکن ڈیری کے اندر جانے کی مجھ میں پھر کبھی ہمت نہ ہوئی۔

مرزا بے تکلّف بیگ

آپ چاہے کیسے ہی صبرِ ایوب کا دعویٰ کریں لیکن ادھر مرزا بے تکلّف بیگ نے آپ کی زندگی میں قدم رکھا اور ادھر آپ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کس طرح زندگی کے چور دروازے سے نکل کر ایسے بھاگیں کہ نقشِ قدم تک ساتھ نہ دینے پائے۔ مرزا صاحب کی تعریف کرنا کچھ ایسا آسان نہیں یہ وہی ہیں جنہیں دیکھ کر آپ کی سائیکل خود بخود ایک اور راستے پر مڑ جاتی ہے۔ اور اگر مڑنے کے لیے مناسب موقع نہ ہو تو آپ نظریں بچا کر سیٹی بجاتے ہوئے ان کے پاس سے گزر جانا چاہتے ہیں لیکن ان کے جیتے جی آپ کی تمنا بر نہیں آتی۔ آپ لاکھ لرزتی آواز میں سیٹی بجائیں نگاہوں کی شِست افق پر باندھ دیں۔ مرزا صاحب چار بسیں، تین کاریں اور گیارہ تانگے پھاند کر آپ تک آجائیں گے اور ان کا آنا ہمیشہ تمہید ان کے ٹھہرنے کی ہوتی ہے۔

خدا بخشے لیموں نچوڑ میں کم از کم یہ خوبی ضرور تھی کہ ایک تو لیموں پر دام لگاتے تھے پھر کھانے کے وقت وارد ہو کر نظریں نیچی کیے ایک گونہ پشیمانی کے ساتھ لقمے زہر مار کرتے تھے۔ ان پر وقت بے وقت ترس بھی آجاتا تھا اور دراصل انہیں دستر خوان پر شریک کرنے کی وجہ بھی یہی شرم ہوا کرتی تھی لیکن مرزا بے تکلّف بیگ جدید دَور کی ایک جدید ترپیدا وار ہیں۔ نہ ان کا پشیمانی کے ساتھ کوئی تعلق ہے نہ پشیمانی کا ان کے ساتھ۔

گھنٹی بجتی ہے آپ کھڑکی کا پٹ ذرا سا کھول کر دیکھتے ہیں، خواہ مخواہ آپ کے منہ سے لاحول نکل جاتی ہے۔ اشاروں ہی اشاروں میں نوکر کو سمجھایا جاتا ہے کہ

صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ نوکر (جس کم بخت کو ہر ہفتے ریہرسل کرائی جاتی ہے) انہیں پتہ نہیں کیا سمجھتا ہے کہ وہ عین راستے میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں۔ عرصہ تک یہی آس آپ کو اندر بٹھائے رکھتی ہے کہ ابھی وہ جا چکیں گے اور پھر لائین کلیر پا کر آپ پوری کھرج اور تان پلٹے کے ساتھ قوالی تک کر سکیں گے۔ لیکن مرزا صاحب کی زندگی میں گھڑی دو گھڑی کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ کلائی پر جنیوا کی واٹر پروف میگنٹ پروف، کلینڈوگراف باندھ کر بھی وقت سے ایسے ہی بے نیاز رہتے ہیں جیسے ان کے پڑدادا مرحوم پتھر اور دھات کے زمانے میں رہتے تھے۔ بالآخر آپ ہی بے حیا بن کر باہر نکلتے ہیں اور انہیں دیکھ کر حیرانی سے کہتے ہیں۔ "ہیں؟ تم یہاں کہاں؟"

اتنی شہہ پا کر وہ جواب دیتے ہیں۔ "بھئی کتنی دیر سے بیٹھا ہوں۔ نوکر نے بتایا تھا کہ صاحب باہر گئے ہیں آتے ہی ہوں گے۔"

پہلے تو آپ کا جی چاہتا ہے کہ سیدھے باورچی خانے میں پہنچ کر برتن مانجھتے نوکر کو ایک ہی بار بڑے ٹب میں ایسی ڈبکی دیں کہ عمر بھر کے لیے برتن مانجھنے کی زحمت سے چھٹی پا جائے۔ پھر بے تکلف بیگ کے متعلق بڑے خطرناک منصوبے آپ کے جی میں کلبلاتے ہیں۔ لیکن وہ آپ کو ایسی سکیموں پر زیادہ سوچنے کی مہلت نہیں دیتے۔ پھر ان کا اور آپ کا ساتھ ہے...... اگر آپ گھر پر رہیں تو وہ براجمان رہیں گے کہیں باہر جائیں گے تو ان کا ساتھ چلنا یقینی ہوگا۔

کچھ بے تکلف بیگیئے چلتے پھرتے ریڈیو ہوتے ہیں۔ انہیں کسی موضوع پر کسی وقت گفتگو کرنے کو کہیئے یا نہ کہیئے ان کا ریڈیو جاری رہتا ہے۔ ان کا مطالعہ اتنا نہیں ہوتا کہ وہ ڈھنگ کی گفتگو کر سکیں لیکن ایٹم بم بنانے کی ترکیب سے لے کر کنگرو کے بچے پالنے تک کے تمام علوم سے وہ بخوبی واقف ہوتے ہیں اور آپ کی کم علمی دور کرنے کو وہ ہر طرح کی کوشش کیے جاتے ہیں۔ ان کے برعکس وہ حضرات ہیں جن کے چہرے پر زمانے بھر کی محرومی لکھی ہوتی ہے وہ آہ بھرتے وارد ہوتے ہیں اور سسکی لے کر اٹھتے ہیں۔ ان کا چہرہ گز بھر لمبا، چال ڈھیلے پمپ کی ہتھی کی طرح کبھی دائیں، کبھی بائیں اور نگاہیں دُکھی کو کر سپینئل کی طرح نمناک، وہ محض آپ کے پاس اس لیے آتے ہیں کہ ان کی نظر میں آپ ہی زمانے بھر کے رحم دل، پرخلوص اور عیسٰے صفت درویش ہیں۔ انہیں دیکھ کر آپ کا جی چاہتا ہے کہ آپ نمرود ہوتے، ہلاکو ہوتے، جنگلوں میں آوارہ

پھرنے والے آدم خور ہوتے اور کچھ نہیں تو کم از کم ان کے ملاقاتی نہ ہوتے...... یہ وہی تو تھے جنہوں نے پچھلے سال آپ کے بچے کی سالگرہ کو ماتمی رنگ میں ڈھال دیا تھا۔ یہ وہی تو ہیں جو پکنک پر گراموفون بند کر کے دنیا کی بے ثباتی پر کافیاں الاپا کرتے ہیں۔ ذرا ذہن پر زور دے کر یاد کیجئے آپ کو وہ واقعہ بھول گیا جب مزاحیہ فلم دیکھتے دیکھتے وہ اچانک اس لیے رونے لگے تھے کہ زیادہ ہنسنا مشیت ایزدی کو منظور نہیں۔

آپ چاہے اپنی بیوی کے سامنے اس بات کا اعتراف کریں یا نہ کریں لیکن آپ اپنے اس ملاقاتی کی وجہ سے واقعی پریشان ہیں جو آپ کے گھر کو اپنا سمجھتا ہے۔ آپ کی بیوی اس کی بھابی زیادہ ہے اور آپ کی بیوی کم...... آپ صبح کا اخبار پڑھ سکیں یا نہ پڑھ سکیں وہ صبح سویرے اخبار کے ہوائی جہاز بنا کر آپ کے بچوں کا دل بہلاتا ہے۔ آپ کے برش سے شیو کر کے اسے کبھی نہیں دھوتا۔ بھرپور گرمی کے موسم میں ہمیشہ دو بجے اور سردیوں میں ہمیشہ رات کو بارہ بجے آتا ہے۔ ان کے پسینے اور آپ کے صاف تولئے میں کچھ ایسی باہمی کشش ہے کہ ادھر آپ تولیہ نکالتے ہیں ادھر ان کا پسینہ لپک کر اس میں بس جاتا ہے...... آپ کی کتابیں ان کی کتابیں ہیں۔ آپ کی ڈائری ان کی ہے جہاں مناسب سمجھتے ہیں تصحیح کر دیتے ہیں۔ اگر آپ کو سگریٹ نوشی کی عادت ہے تو سگریٹ آپ خریدتے ہیں۔ رنگ ان کی انگلیوں پر چڑھتا جاتا ہے۔ اگر حقے سے رغبت ہے تو حقے کا نیچہ اپنی طرف گھمانے کو آپ کی انگلیاں ترس جاتی ہیں اور منہ چلم سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ آپ کی سائیکل آپ کو دفتر کم لے جاتی ہے اور انہیں سینما زیادہ...... ایسی کتنی باتیں آپ کو بھی یاد ہوں گی جن کی وجہ سے آپ نے کئی بار شہر چھوڑ جانے کی ٹھانی ہو گی لیکن کیا کیا جائے اس گھر کو مرزا صاحب اپنا گھر سمجھتے ہیں اور ان کی اجازت بغیر آپ اسے بیچ نہیں سکتے۔ اگر آپ شہر چھوڑ بھی جائیں تو کون جانے وہ مستقل طور پر آپ کے پاس آ رہیں کیونکہ یہاں کی آب و ہوا انہیں بھی راس نہ آتی ہو!

ویسے تو ہر بے تکلف بیگ کی کوئی نہ کوئی خاصیت ایسی ہوتی ہے جو خالصتاً انہی کی میراث ہوتی ہے لیکن ایک خوبی تمام برادری میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے۔ ہر بے تکلف حسب توفیق بے حس ہوتا ہے۔ آپ کی نگاہ گھڑی پر ہوتی ہے لیکن حضرت مرزا کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ جمائیاں لے لے کر آپ کے جبڑے پھٹے ہوئے کیلنڈر کی طرح لٹک جاتے ہیں لیکن مرزا صاحب پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اشارے

کنائے تو در کنار آپ کے دوست صاف صاف بھی انہیں تشریف لے جانے کو کہیں تو بھی ان کا مثبت وجود منفی نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ آپ کو سمجھ نہیں آتی۔ کبھی آپ سوچتے ہیں کہ یہ آدمی دیوانہ ہے کبھی آپ جی میں کہتے ہیں کہ احمق ہے اور آخر آپ کو اس نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ عقل سے مرزا بے تکلف بیگ کا کوئی خاص تعلق نہیں۔ ہو گا بھی تو یونہی تعلقات عام سا ہو گا۔

جیتے جی آپ مرزا بے تکلف بیگ سے جان نہیں چھڑا سکتے۔ مر جائیں تو اعراف کی کوٹھڑی میں یہ آپ سے پہلے موجود ہوں گے اور متعجب ہو کر کہیں گے "حد کر دی میاں اتنی دیر حساب کتاب! میں کب سے تمہارا منتظر بیٹھا ہوں۔"

چابی

یوں تو گھر میں کئی ایسے تالے تھے جن کی چابیاں کھو گئی تھیں اور کئی ایسی چابیاں تھیں جن کے تالے عرصہ سے نہ ملتے تھے' لیکن کنجیوں کے چاندی ایسے چمکتے چھلّے میں کسی اٹیچی کیس کی ایک ایسی منہ بند چابی بھی تھی جو بڑی بڑی چابیوں میں کھسکتی' جھولتی' بجتی یونہی چلی آ رہی تھی اور سوائے سلمیٰ کے کوئی بھی نہ جانتا تھا کہ یہ چھوٹی سی چابی چھلّے میں آئی تو کیسے؟

خود سلمیٰ کو ایک عرصہ تک علم نہ ہو سکا کہ منظور کی آمد پر سارے گھر کی فضا کیسے تبدیل ہو گئی؟ وہی نصیر بھائی تھے کہ اسے ایسے سمارٹ' ایسے خوبصورت' ایسے پیارے لگتے تھے اور وہی نصیر بھائی تھے کہ بارش میں بھیگے ہوئے بازاری کتے کی طرح ان کی ساری شخصیت کان لپیٹے پھرنے لگی تھی اور تو اور سلمیٰ کو تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ گھر کی ساری دیواریں اور لمبی ہو گئی ہیں' کمرے کچھ پھیل گئے ہیں اور منڈیریں نیچے کو لٹک آئی ہیں۔

منظور کی آمد سے پہلے سلمیٰ اس دو منزلہ مکان کی شہزادی تھی۔ وہ کنگرو کے لاڈلے بچے کی طرح تھی' جسے گھر کے تمام افراد حسبِ توفیق اپنی اپنی پوٹ میں چھپائے پھرتے تھے۔ امی' ابا کی تو خیر وہ لاڈلی تھی ہی لیکن اپنے چچازاد کی آنکھ کا تارا بننا کوئی آسان کام نہ تھا۔ نصیر بھائی تو ایسے نقص بین تھے کہ صاف ستھری پلیٹ میں انگلی پھیر کر کہیں سے مٹی نکال لاتے تھے لیکن حیرانی کی بات ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ وہ نصیر بھائی کو بھی عزیز ہو گئی تھی۔ اب تو نہ انہیں میلے چیکٹ پیروں پر اعتراض رہا تھا

اور نہ اونچی ایڑی کی جوتی پہننے پر...... اتنی بڑی فتح کے بعد جب منظور صاحب اس گھر میں آئے تو سلمیٰ کو محسوس ہوا کہ ساری کائنات گھوم رہی ہے اور ابھی گھومتے گھومتے صابن کے بلبلے کی طرح پھٹ جائے گی!

منظور صاحب اس گھر میں کیوں آئے؟ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو وہ نصیر بھائی کے دوست تھے' دوسرے بڑے شہروں میں آسانی سے رہائش کو جگہ نہ ملتی تھی۔ اس کے علاوہ منظور صاحب امی کے دور سے رشتہ دار تھے اور حساب لگانے پر سلمیٰ نے اندازہ لگایا تھا کہ ایک طرح وہ اس کے نانا تھے!

سلمیٰ کو اس رشتے پر تو کوئی اعتراض نہ تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ منظور صاحب اتنی کم عمری میں بالکل ناناؤں کی سی حرکتیں کرتے تھے۔ ان کی آمد سے پہلے سلمیٰ کا خیال تھا کہ اس گھر میں سوائے اس کے کسی اور کو خود پسند ہونے کا حق نہیں پہنچتا۔ اس کی رائے اصول ہے اس کی خواہش حکم! لیکن جب منظور صاحب وارد ہوئے تو سلمیٰ کو پتہ چلا کہ اس چھوٹی سی جھیل میں کہیں سے سمندر کا مینڈک آ ٹپکا ہے۔ ہر بات پر طنزیہ مسکراہٹ ہر لمحے ماتھے پر تیوریاں!

بھلا یہ بھی کبھی کسی نے سنا تھا کہ سلمیٰ نے نیلا سوٹ پہنا ہو اور گھر کے سارے لوگ ماشاء اللہ' ماشاء اللہ نہ کرتے پھریں...... نصیر بھائی تو ہانپ ہانپ کر باتیں کریں لیکن منظور صاحب اخبار کی تصویروں کو مونچھیں لگاتے پھریں۔ اس روز تو اور بھی قیامت آ گئی تھی۔ نیلے سوٹ کے ساتھ اس نے سیاہ چوڑیاں بھی پہن رکھی تھیں لیکن اتنا چھنکانے' بجانے کے باوجود منظور نے ان کی طرف دیکھا ہی نہ تھا۔ جب کھانے کے بعد وہ ہاتھ دھونے کے لیے سلفچی پر جھکی ہوئی تھی تو منظور پاس کھڑا ہاتھوں پر صابن مل رہا تھا۔ سلمیٰ نے گیلی آنکھوں سے قمیص کی بانہہ اور اوپر کر دی تھی اور چھن چھن گرتی سیاہ چوڑیاں ایک دوسری کے ساتھ کلائی پر اتر آئی تھیں۔ لیکن نانا تیوری ڈالے صابن کی جھاگ کا گولا بناتا رہا۔ جیسے گولا بنانا ایسا ہی ضروری ہو...... اسی لیے تو سلمیٰ ہاتھ دھوتے ہی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اس کے گھر کا ماحول یکسر بدل گیا ہے۔

ماحول کے تبدیل ہونے سے وہ اس قدر پریشان نہ تھی وہ تو صرف یہ چاہتی تھی کہ کسی طرح ایک بار نانا بھی نصیر بھائی بن جائے اور اسی طرح جھوٹ موٹ کے

روٹھوں کو مناتا رہے۔ اس نے ہر ممکن جتن کر دیکھا لیکن نانا اپنی رنگین ٹائیاں اور امریکن بش شرٹ پہنے متواتر تیوری چڑھائے اپنے کام پر جاتا رہا۔ آخر جب سلمٰی کے نیلے پیلے تمام سوٹ اپنی رنگینی کھو چکے اور جھیل کی مچھلی سمندری مینڈک کے سامنے ہار مان گئی تو ایک دن سلمٰی کو اس کی امی نے اوپر والی منزل کی صفائی کرنے بھیجا۔ نصیر بھائی کے کمرے میں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ نانا اور وہ بڑے بجھے ہوئے انداز میں کسی کا ذکر کر رہے تھے۔ سلمٰی دروازے کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔ نصیر بھائی کہہ رہے تھے:

"تعجب ہے کہ وہ تم سے اس قدر مختلف ہے۔"

پھر نانا بولا...... "ہاں سبھی کہتے ہیں' اس کا رنگ بالکل صاف ہے اور میں تمہارے سامنے ہوں ویسے وہ ذرا موٹی ہے۔"

"کاش تم مجھے اس کی کوئی فوٹو دکھا سکتے۔" نصیر نے کہا۔

"میرے اٹیچی کیس میں ہے شام کو دکھاؤں گا۔"

اب نصیر بھائی نے لمبی سی سانس لی اور بڑے افسوس سے بولے: "میں تو حیران ہوں تم زندہ کیسے ہو؟"

نانا نے بڑی دیر اس بات کا جواب نہ دیا پھر قریباً اپنے آپ سے بولا: "جب پانی سر سے گزر جائے تو انسان زندہ رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

سلمٰی کو اس بات کی قطعی امید نہ تھی۔ سارا دن وہ بستر پر پڑ کر روتی رہی۔ اب تک اسے کبھی کبھی امید سی بندھ جاتی تھی کہ اب نانا نے ہتھیار ڈالے کہ ڈالے لیکن صبح کی گفتگو سن کر وہ بالکل مایوس ہو چکی تھی۔ اب اس کے جی میں اٹیچی کیس کھولنے اور تصویر دیکھنے کی تمنا کے سوا اور کچھ نہ رہا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی لیکن کبھی تو دروازہ بند ہوتا اور کبھی اٹیچی کی چابی نہ ملتی۔

اس شام بادل چھائے تھے۔ نصیر اور منظور سینما دیکھنے جا چکے تھے۔ آج سلمٰی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ نصیر سے ضرور ملے گی اور اس کی تسلی کر دے گی کہ وہ اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اتنا بڑا فیصلہ کر چکنے کے باوجود اس کی ساری توجہ اس اٹیچی کیس کی طرف تھی' جس میں کسی گوری اور موٹی لڑکی کی تصویر تھی۔ جب اندھیرا خاصا ہو گیا اور چیزوں کے ہیولے دھندلا گئے تو وہ اوپر والی منزل میں گئی۔ اس نے منظور کے سرہانے تلے' کتابوں کی میز پر' سنگھار میز کی درازوں میں ہر جگہ اٹیچی کیس

کی چابی تلاش کی لیکن اس نیم اندھیارے میں اسے چابی نہ ملی۔ ہار کر وہ اٹیچی کیس کے پاس پہنچی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے سارا دن غوطے مارتی رہی ہے اور ایک بھی سیپ ہاتھ نہیں آئی اور اب کوئی البیلی سوچ آپی آپ اس کے قدموں میں سیپوں کا ڈھیر لگا گئی ہے...... اٹیچی کیس کے تالے میں ایک منہ بند کلی ایسی چابی لگی ہوئی تھی۔

سلمٰی نے اٹیچی کیس کھولا...... اندر کئی الجھی ہوئی ٹائیاں' رنگین ریشمی رومال' رسالے' خط اور الٹی سیدھی چیزیں آپس میں گڈمڈ پڑی تھیں۔ سلمٰی کو اس اٹیچی کیس کی چیزیں سنوارنے کا کس قدر ارمان تھا۔ اس نہ پوری ہونے والی تمنا کو یاد کر کے اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ اس نے اٹیچی کے نیچے بچھائے ہوئے اخبار کو دھندلی نظروں سے دیکھ کر اٹھایا تو ایک تصویر اس کے ہاتھوں میں آ گئی...... شام کے اندھیرے میں اسے یہ لڑکی اور بھی پراسرار اور خوبصورت نظر آئی۔

ابھی وہ اچھی طرح سے تصویر دیکھ بھی نہ پائی تھی کہ سیڑھیوں پر قدموں کا شور اٹھا۔ اس نے جلدی سے تصویر اخبار تلے رکھی۔ گڈمڈ ٹائیاں اور رومال اندر ٹھونسے اور اٹیچی کا ڈھکنا بند کر دیا لیکن اٹیچی کی چابی اس کی بھیگی بھیگی' ہتھیلی میں ہی رہ گئی۔ جب منظور اور نصیر آ گئے وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور مٹھی بھینچ کر بولی...... "جی آپ نے امی کی چابیاں تو نہیں دیکھیں؟"

منظور نے کمرے کی بتی چٹک سے جلائی اور پھر تعجب سے بولا: "جی امی کی چابیاں؟"

"شام سے نہیں مل رہیں۔ امی کہتی تھیں کہ صبح وہ ادھر ہی آئی تھیں۔"

"دیکھ لیجئے۔ شاید یہیں کہیں ہوں۔"

لیکن وہ چابیاں ڈھونڈنے کے بجائے مٹھی میں سیپ کا موتی چھپائے نیچے اتر آئی۔

سلمٰی کو کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ عین اسی دن منظور ان کا گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ عین اسی دن نصیر سے اس کی منگنی طے ہو گئی۔ ہوا یوں کہ دوپہر کے وقت جب وہ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی تو منظور بغیر دستک دیئے اندر آ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ نصیر بھائی کی طرح ہانپ رہا تھا۔

"بہت بہت مبارک ہو سلمٰی۔" وہ بولا "افسوس میں رات کی تقریب پر

یہاں نہ ہوں گا ورنہ......"

"آپ جا رہے ہیں؟" سلمیٰ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی!"

"کیوں؟"

"اس لیے بھئی کہ ہم تمہارے نانا ٹھہرے اور نانا ایسی تقریبوں پر آبدیدہ ہو جایا کرتے ہیں...... اور ہاں سلمیٰ تم نے میرے اٹیچی کی چابی تو نہیں دیکھی کہیں؟"

اس کے جی میں آیا کہ تکیئے تلے سے چابی نکال کر اس کے سامنے پھینک دے لیکن وہ نفی میں سر ہلا کر بولی: "میں نے تو نہیں دیکھی' کھو گئی کیا؟"

منظور کی تمام تیوریاں جیسے آنکھوں میں آنسو بن کر پھیل گئیں اور وہ آہستہ سے بولا: "آپ چابی کو پوچھتی ہیں' یہاں پتہ نہیں کیا کیا کھو گیا ہے؟"

رعونت بھرے سمندری مینڈک کو یوں باتیں کرتا دیکھ کر سلمیٰ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"اور ہاں نصیر تو پتہ نہیں کب آئے گا۔ اسے میرا سلام اور مبارک باد دیجئے گا۔ یہ تصویر ہے اس کے پیچھے میں نے تمام تفصیلات لکھ دی ہیں۔ نصیر سے تاکید کیجئے کہ ضرور اس کا پتہ لگوائے۔"

سلمیٰ نے بڑھ کر تصویر ہاتھ میں لے لی اور اس کا چہرہ مجسم سوال بن گیا۔

منظور نے لمبی سی سانس لی اور آہستہ سے بولا: "ایک یہ دکھ ہی کیا کم تھا کہ اپنی اکلوتی بہن کو فسادات میں کہیں کھو آیا' اب نیلے سوٹ اور کالی چوڑیاں بھی چھوڑنا پڑیں۔"

سلمیٰ کے لبوں کے کنارے کانپنے لگے اور وہ بمشکل بولی: "یہ آپ کی بہن کی تصویر ہے۔"

منظور نے کندھے جھٹکے اور آہستہ سے اعتراف کیا: "جی۔"

پھر جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا: "پانی سر سے گزر جائے تو انسان زندہ رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

ایسے کئی واقعات ہر انسان کی زندگی میں سے ہو کر گزرے ہیں۔ ان ننھی ننھی موج دار وارداتوں کا گھاؤ وقت آپ ہی آپ مندمل کر دیتا ہے۔ لیکن یہ کون جانتا ہے کہ چاندی کے چمکتے چھلے میں ایک ایسی منہ بند چابی بھی ہے جسے گھماتے گھماتے

سلمیٰ کبھی بہت دور جا نکلتی ہے اور اس کا چھوٹا سا بچہ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر پوچھتا ہے۔

"کیا بات ہے امی؟"

اور وہ چابی کو مٹھی میں بھینچ کر کہتی ہے...... "کچھ بھی نہیں...... کچھ بھی تو نہیں میرے لال!"

ہزار پایہ

گاڑی دھچکا کھا کر رکی لیکن اگر گاڑی یوں نہ بھی رُکتی تو بھی میں جاگ جاتی کیونکہ بڑی دیر سے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی کنکھجورا میری گردن پر ہولے ہولے رینگ رہا ہے۔ ابھی وہ میرے منہ پر آجائے گا اور اپنے سوئیوں ایسے پاؤں میری آنکھوں میں گاڑ دے گا۔

باہر پھیکی چاندنی میں ایک کالا بد ہیئت انجن سیاہ چمک دار ناگوں ایسی لائنوں پر شنٹ کر رہا ہے۔ اندر ہمارے ڈبّے میں ایک سیٹ پر امی ایک پر بڑی باجی اور ایک پر زینب آپا ایرانی بلّیوں کی طرح سو رہی ہیں۔ غسل خانے کی بتی امی کے بڑے ٹرنک پر روشنی کا گول سفید دھبہ ڈال رہی ہے۔ ادلتے بدلتے پنکھے چھت سے چمٹے گھُوں گھُوں کرتے اِدھر اُدھر چہرے گھما رہے ہیں۔ سارے ڈبے میں باسی پانی اور تازہ سانسوں کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ وہ رسالے بھی سیٹ سے کھسک کر فرش پر پھیل گئے ہیں جن کے سہارے یہ سفر کٹ جانے کی امید تھی...... اگر مجھے باجی سے آنکھیں ملانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں بھی زینب آپا بڑی باجی اور امی کی طرح روتی روتی ہی سو جاتی۔

لیکن آج مجھے باجی ویسے ہی ڈرا رہی ہیں جیسے عرصہ دراز پہلے ایک دن انہوں نے کچھ کہے بغیر مجھے ڈرا دیا تھا۔ امی نے نعمت خانے میں ان کے لیے مٹھائی رکھ کر تالا لگایا تھا۔ پھر وہ چابیاں تخت پر رکھ کر نماز پڑھنے لگی تھیں تو میں نے چابیوں کا گچھا اٹھا لیا تھا اور دبے پاؤں نعمت خانے تک جا پہنچی تھی۔ گرمیوں کی خاموش دوپہر تھی' میرے اور امی کے سوائے سب سو رہے تھے لیکن اس کے باوجود میں ڈرتے ڈرتے نعمت خانے

کے تالے کو چابی سے چھو رہی تھی۔ جب بڑی ہمت کے بعد میں نے پلیٹ نعمت خانہ سے نکالی تو باجی آگئیں۔ میں نے پلیٹ میں سے کچھ بھی نہ اٹھایا تھا لیکن باجی نے نگاہوں ہی نگاہوں میں مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چور بنا دیا تھا۔

یہ باجی کا مقدر ہے کہ انہیں ہمیشہ اچھی چیزیں ملتی ہیں۔ امی مٹھائی کا حصہ رکھیں گی تو باجی کے لیے زیادہ رکھیں گی۔ گھر پر کپڑا آئے گا تو باجی اپنی پسند کا اٹھا لیں گی۔ پکچر جانا ہوگا تو جس فلم کا نام باجی لیں گی سبھی وہی دیکھیں گے۔ اور تو اور دولہا ملنے میں بھی باجی کا مقدر اپنی بڑی دو بہنوں پر سبقت لے گیا۔ بڑی باجی اور زینب آپا کے دولہے تو ایسے تھے...... خیر جیسے آدمی ہوتے ہیں لیکن باجی کا دولہا......

اس دن میں نے آنگن دھویا تھا' پائینچے بھیگ گئے تھے اور ہاتھوں میں خالی بالٹی تھی' سر اٹھا کر میں نے دیکھا ایئر فورس کی وردی پہنے سنہری مونچھوں والا باوا سامنے کھڑا ہے...... لمحے بھر کے لیے میرا دل دھڑکتا دھڑکتا رُک گیا۔ جیسے خواب میں سے اٹھا کر کسی نے تھپڑ مارا ہو۔ پھر سنہری مونچھوں والے باوے نے ہنس کر مجھ سے بالٹی لے لی اور پوچھا: "کہاں رکھنا ہے اسے؟" زینب باجی اور بڑی باجی کے شوہروں سے کتنی مختلف بات تھی۔ ان کے سامنے سارے گھر کی چارپائیاں اندر باہر کرتے سانس پھول جاتی' لیکن وہ ٹانگ پر ٹانگ دھرے سگریٹیں پیتے رہتے۔

جب ولایتی باوا تانگے سے اپنا سامان اتروا رہا تھا تو اندر باہر ایک طوفان سا آگیا۔ سوائے باجی کے سبھی کچھ نہ کچھ کر رہے تھے اور جس لاتعلقی سے وہ بیٹھی کشیدہ کاڑھ رہی تھیں اس سے صاف ظاہر تھا کہ دراصل باوے کا سب سے زیادہ تعلق انہی سے ہے...... پتہ نہیں کیوں اسی روز مجھے باجی سے سخت چڑ پیدا ہو گئی......

باجی کی ہمیشہ سے عادت ہے کہ خواہ مخواہ چڑانا شروع کر دیتی ہیں۔ بس چھوٹی سی بات میں ایسا الجھاؤ پیدا کر دیتی ہیں کہ رونے کو جی چاہتا ہے۔ ہم چاروں بہنیں بیٹھی نئے باوے کے متعلق باتیں کر رہی تھیں۔ زینب آپا بولیں: "سب کچھ اچھا ہے' ویسے تو یوسف کا سب کچھ اچھا ہے اک ذرا مجھے آنکھیں ناپسند ہیں۔"

مجھے پتہ نہیں ان کی بات سن کر کیوں غصہ آگیا۔ جھٹ بولی...... "کیوں ان کی آنکھوں کا رنگ تو اس قدر خوبصورت ہے جیسے نیلے نیلے کنچے۔"

باجی نے ہنس کر پوچھا: "اور تمہیں نیلے کنچے پسند ہیں کیا؟"

میری ناک پر پسینہ آگیا اور میں جھلا کر بولی: "ہاں' کیوں نہیں۔"

اب باجی کو چڑانے کی سوجھی۔ میرے کندھے پکڑ کر جھلانے لگیں پھر اپنے مخصوص انداز میں لب اٹھا کر بار بار دہراتی گئیں...... "کیوں تمہارا کروا دیں بیاہ یوسف سے؟ بولو جی تہمینہ...... بولو جی۔"

اس سے پہلے کئی بار باجی نے مجھے چڑایا تھا لیکن میں روئی نہ تھی۔ اس دن میں نے کندھے جھٹک دیئے اور رونے لگی۔ آنسو تھے کہ آپی آپ آنکھوں میں آرہے تھے اور گرتے جا رہے تھے۔ بڑی باجی نے گلے سے لگا کر کہا تھا...... "ارے رونے لگیں یہ باجی تو پگلی ہے تہمینہ...... اس کے کہنے سے کوئی تیری شادی تھوڑی ہو چلی ہے......"

پھر وہ باجی کو ڈانٹتے ہوئے بولیں: "خوشی سے لڈو اپنے دل میں پھوٹ رہے ہیں رُلا اس بے چاری کو رہی ہے۔ اس عمر میں ایسے مذاق نہیں کیا کرتے......"

باوجودیکہ سب معاملہ رفع دفع ہو گیا لیکن رات جب میں سونے لگی تو ایک بار پھر آنسو میری آنکھوں میں تیرنے لگے اور میں ہاتھ مروڑتی ہوئی کہنے لگی: "اللہ میاں کرے باجی تو مر ہی جائے...... مر ہی جائے بالکل ساری کی ساری......"

باجی میری بددعا سے مر تو نہ سکیں ہاں ہمارا گھر چھوڑ کر ضرور چلی گئیں۔ انہیں یوسف بھائی کے ساتھ کار میں بٹھا کر ہم سب واپس لوٹے تو آتے ہی میں نے دن رات بجنے والی ڈھولک کو پیر مار کر پھاڑ دیا اور بستر پر اوندھی لیٹ کر رونے لگی۔ سارے گھر میں باسی پھولوں اور پلاؤ فیرنی کی خوشبو اڑ رہی تھی۔ ہر ایک کسی نہ کسی کونے میں بیٹھا باجی کی کمی محسوس کرتا ہوا افسردہ ہو رہا تھا لیکن مجھے باجی کی عدم موجودگی کے ساتھ ساتھ ایک عجیب طرح کا غصہ بھی آ رہا تھا۔ ساری شام انہوں نے مجھے بھگا بھگا کر پیر چھلنی کر دیئے تھے۔ پھر جو کوئی تھا ان ہی کی تعریف کر رہا تھا انہیں ہی گھور رہا تھا۔ خالہ نے شام کے دوران بس ایک مرتبہ مجھ پر عنایت کی تھی جو پوچھا تھا: "اب کس جماعت میں ہو تہمینہ......"

"جی دسویں میں......"

اس پر وہ ہنس کر بولی تھیں...... "چلو اب تمہاری باری آئے گی......"

پھر جب باجی اپنے چھوٹے سے بچے کو لے کر ہمارے ہاں آئیں تو ان کا بچہ دیکھ کر سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ سنہری بال' سفید رنگت اور کنچوں ایسی نیلی نیلی

آنکھیں...... لیکن میں نے دیکھا کہ یوسف بھائی میں پہلے سے بہت فرق آچکا تھا۔ ناک کی دونوں طرف گہری لکیریں پڑ چکی تھیں اور وہ بوڑھے نظر آتے تھے۔ باجی سارا سارا دن اپنے بچے کو گود میں لیے کھیلتی رہتی اور میں کنکھیوں سے دیکھتی یوسف بھائی بے چینی سے منتظر رہتے کہ کب باجی کو فرصت ہو اور وہ ان سے بھی بات کرے۔ ایسے میں میں یوسف بھائی کے پاس جا بیٹھتی اور ان سے باتیں کرنے لگتی۔ وہ ہوائی جہازوں کی اونچی اڑانوں پر مجھے ساتھ لے جاتے' ایسے ناگہانی حادثات بیان کرتے کہ دل ہوائی جہاز کے پنکھے کی طرح چلنے لگتا...... پھر ان کی نیلی آنکھوں میں موت سے کھیلنے والے پائلٹ کا سا خوف آجاتا اور وہ اپنے بچے سے بھی کم عمر نظر آتے اور میرا جی چاہتا کہ ان کے سنہری بالوں میں انگلیاں ڈبو کر کہوں...... "موت سے کیوں ڈرتے ہو وہ تو اپنے پلنگ پر بھی آ جاتی ہے۔"

اگر یوسف بھائی کے کچھ اپنے فکر تھے تو ان میں باجی شامل نہ تھیں وہ تو ان چھوٹی موٹی جھلاہٹوں میں بھی یوسف بھائی کے ساتھ شامل نہ ہوتیں جو عموماً میاں بیوی میں خواہ مخواہ لڑائی کی شکل اختیار کر لیا کرتی ہیں۔

یوں تو روز کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا تھا لیکن اس دن یوسف بھائی غسل خانے میں گھسے ہی تھے کہ مجھے احساس ہوا کہ اندر کوئی تولیہ نہیں ہے اور ابھی وہ نہا کر تولیے کے لیے پکاریں گے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے باجی کو پکارنا شروع کر دیا۔ باجی اندر پلنگ پر بیٹھی ننھے کو پاؤڈر لگا رہی تھیں۔ انہوں نے سنی ان سنی کر دی تو میں غسل خانے کے کواڑ کے پاس جا کر بولی...... "کہیے بھائی جان......"

"بھئی ذرا تولیہ پکڑانا تہمینہ......"

میں تولیہ لے کر گئی تو وہ کھڑکی کا آدھا پٹ کھولے سر نکالے کھڑے تھے۔ دھلے دھلائے چہرے پر شہد کی بوندوں کی طرح پانی کے قطرے لڑھک رہے تھے اور نیلی کنچوں جیسی آنکھیں بالکل زمردیں لگ رہی تھیں' گیلے بازو پر تولیہ رکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا: "اور ملکہ صاحبہ کیا کر رہی ہیں؟"

گو میں جانتی تھی کہ باجی کو کوئی ایسا کام نہ تھا لیکن میں بولی...... "جی ننھے کو دودھ پلا رہی ہیں......"

وہ کواڑ بند کرتے ہوئے بولے: "اگر انہیں فرصت بھی ہوتی تو بھی وہ کب

آتی تھیں۔" پھر وہ اونچے اونچے کہنے لگے۔

"تہمینہ شادی کے بعد اپنے شوہر کا خیال ضرور رکھنا۔ اچھا؟"

ایسی کئی ننھی ننھی باتیں ان بڑے بڑے ناگوں کی طرح میرے ذہن میں اُبھر رہی ہیں جن پر ایک کالا بدہیئت انجن شنٹ کر رہا ہے اور جسے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے ہماری گاڑی چل رہی ہو۔ اس بدہیئت انجن کی طرح ایک خیال میرے دل میں آگے پیچھے چکر لگا رہا ہے...... اگر یہ خیال چند لمحے کے لیے مجھے چھوڑ دیتا تو میں بھی بڑی باجی آپا زینب اور امی کی طرح تھوڑی دیر کے لیے سو جاتی!

اور سونا تو اس رات بھی ممکن نہ تھا جب یوسف بھائی کے سر میں بلا کا درد اٹھا تھا' پہلے تو باجی کچھ دیر بیٹھی دباتی رہیں پھر جب نہارو نے لگا تو وہ اسے چپ کرانے کے لیے اٹھیں اور اسے تھپکتے تھپکتے خود بھی سو گئیں۔ یوسف بھائی کروٹیں بدلتے ہوئے کراہ رہے تھے۔ بڑی باجی نے اسپرو کھلائی مگر افاقہ نہ ہوا۔ امی نے پانی دم کر کے پلایا' درد ویسے ہی رہا۔ پھر جیسے میں خود بخود اٹھ کر ان کے سرہانے جا بیٹھی اور ان کا سر دبانے لگی۔ سنہری بالوں پر بندھا ہوا سرخ ریشمی رومال میں نے کھول دیا۔ یوسف بھائی نے میری طرف دیکھا اور تکیے پر ڈالا ہوا سر میری جانب اور کھسکا دیا۔

آہستہ آہستہ یوسف بھائی سو گئے۔ ان کا سانس میرے زانو کو چھونے لگا۔ ایسے جیسے چھوٹے چھوٹے ہاتھ دلار سے تھپک رہے ہوں...... اس رات میں نے کتنی ہی انجانی راہوں پر ڈرتے ڈرتے قدم دھرنے کے خواب دیکھے اور یہ شاید انہی خوابوں کا نتیجہ تھا کہ میں سر دباتے دباتے اونگھ گئی۔

جب باجی نے مجھے جگایا تو میرے ہاتھ یوسف بھائی کے بالوں میں تھے اور دوپٹہ کھسک کر ان کے چہرے پر پڑا تھا...... پتہ نہیں کیوں اس وقت بھی مجھے وہ دن یاد آ گیا جب میں نے تخت سے چابیاں اٹھا کر نعمت خانے سے مٹھائی نکالی تھی......!

اگر صبح ہی باجی اپنے گھر جانے کا پروگرام نہ بنا لیتیں تو شاید اتنی شدید نفرت میرے دل میں کبھی پیدا نہ ہوتی...... لیکن ادھر باجی اور یوسف بھائی اپنے گھر روانہ ہوئے اور ادھر میں غم و غصہ سے رونے لگی۔ بار بار مجھے یوں لگتا تھا جیسے باجی دل ہی دل میں مجھ پر الزام دھرتی گئی ہیں۔ جتنا میں باجی کے الزام کے متعلق سوچتی اتنا ہی مجھے اپنے بے قصور ہونے کا خیال آتا اور جب میرا بس نہ چلتا تو میں تکیے میں منہ دے کر

کہتی...... "اللہ میاں جی باجی تو مر ہی جائے' بالکل ساری کی ساری......"

لیکن اب یہی خیال بدہیئت انجن کی طرح میرے ذہن کو کوٹ رہا تھا...... مجھے پورا یقین ہے کہ میری بددعا نے باجی کی جان لی...... وہ انفلوئنزا سے نہیں اپنی بہن کی بددعا سے مر گئی ہے...... اور اب جب وہ مر گئی ہے تو میں اسے کیسے یقین دلاؤں کہ یہ بددعا میں نے جی سے نہ دی تھی...... سٹیشن کی بے رونق بتیوں کی طرح باجی کے گلے میں باسی مرجھائے ہوئے پھول ہوں گے اور وہ ڈرائے دھمکائے بغیر مجھے مل کر پوچھے گی بولو اب تو خوش ہو؟...... اب تو خوش ہو؟

گاڑی دھچکا کھا کر چلنے لگی ہے۔ بدہیئت کالا انجن ہم سے دور ناگوں ایسی لائنوں پر شنٹ کرتا پیچھے رہ گیا ہے۔ امی' بڑی باجی اور آپا زینب ایرانی بلّیوں کی طرح سیٹوں پر پڑی سو رہی ہیں...... لیکن احساسِ گناہ کا ہزار پایہ ہولے ہولے میری گردن پر رینگ رہا ہے...... ابھی وہ میرے منہ پر آ جائے گا...... اور میری آنکھوں میں سوئیوں ایسے پاؤں گاڑ دے گا۔

التجا

میجر بہزاد خاں کو آپ شاید نہیں جانتے؟

اسے سعیدہ بھی نہیں جانتی ورنہ ابھی اس اصرار سے وہ یہ کہہ کر نہ جاتی......

"میجر ہے ویسے بھی کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ شکل بھی بُری نہیں' سیرت بھی قابلِ تعریف ہے۔ پھر پتہ نہیں تم کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے اس کی بات سُنی اور میجر بہزاد کی تصویر پر نظریں گاڑ کر عجب پشیمانی کے ساتھ کہا: "سعیدہ...... راشدہ کو اس سے کہیں بہتر رشتہ مل سکتا ہے اور ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے......؟"

سعیدہ یوں جھنجلایا نہیں کرتی۔ اس نے آج تک کبھی ایسی بات نہیں کی جس سے مجھے کبھی دکھ پہنچنے کا احتمال بھی ہو لیکن آج اس کا چہرہ تمتما اٹھا اور وہ بگڑ کر بولی: "نہ سہی بہزاد' راشدہ کی قسمت بھی رابعہ کی طرح پھوڑ دو...... تم باپ ہو' تمہیں اختیار ہے۔"

جاتی ہوئی سعیدہ کا دوپٹہ پکڑ کر میں نے پوچھنا چاہا...... "سعیدہ! کیا تم بہزاد کو جانتی ہو؟ کیا جانتی ہو کہ تمہاری رابعہ کی شادی پر وہ کالا بادل کون سا چھایا رہتا ہے جس کا نہ کوئی نام ہے نہ ٹھکانا؟"

لیکن میں اُسے کیسے پوچھ لیتا' سعیدہ اور میرے درمیان آج تک کوئی راز نہیں رہا لیکن ایک ننھی سی التجا ہے جو میرے کانوں نے نہیں سنی لیکن جسے مَیں نے محسوس کیا اور پھر وہ میرے لبوں تک نہیں آسکی۔ یہ التجا اتنی نامعلوم ہے اتنی گمبھیر ہے

اتنی گہری ہے کہ اس کا ذکر میں سعیدہ سے بھی نہیں کر سکتا حالانکہ اس سے آج تک میں نے کوئی راز نہیں رکھا......

میرے سامنے بہزاد کا فوٹو ہے...... آج اس کا فوٹو مجھے اس کے باپ نے پشاور سے بھیجا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ عجب اتفاق ہے' ہر بار بہزاد کا سامنا کیا مجھ ہی سے ہونا تھا۔ کیا زندگی کسی طرح بھی مجھے اتنی مہلت نہ دے سکتی تھی کہ میں بہزاد کی جھولی میں انکار کے انگاروں کے علاوہ اور بھی کچھ ڈال سکتا!...... لیکن زندگی شاید مہلت دینا جانتی ہی نہیں ورنہ......

ورنہ رابعہ کی شادی کو جب بمشکل بیس دن باقی رہ گئے تھے ایسا واقعہ رونما نہ ہوتا!

رابعہ میرے ساتھ کچھ خرید و فروخت کے سلسلہ میں لاہور آئی تھی۔ سعیدہ نے آتی مرتبہ جو فہرست ہمارے ساتھ کی تھی اسے نپٹانے کو شاید ہفتہ درکار ہوتا لیکن رابعہ اور میں سارا دن انارکلی اور مال کی دکانیں کھنگالتے رہے اور میں جی ہی جی میں رابعہ کے جھینپ بھرے انہماک سے لطف اٹھاتا رہا۔

رابعہ نے اپنے ہونے والے شوہر کو نہ دیکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ بڑی دلچسپی سے چیزیں خرید رہی تھی۔ اس کے گالوں پر ہلکی ہلکی سرخی چھائی تھی اور ایسی چمک تھی جو سترہ برس پہلے کبھی سعیدہ کی آنکھوں میں ہوا کرتی تھی۔ کوئی مہنگی چیز اس کے ہاتھ آجاتی تو وہ جلدی سے اسے کاؤنٹر پر رکھ کر کہتی: "باپ رے باپ۔"

میں اُس کی پسند کا اندازہ نگاہوں سے لگا کر اصرار کرتا تو وہ جلدی جلدی انگریزی میں کہتی: "ذرا بھی اچھی نہیں ہے اور دام بہت زیادہ ہے ابا......"

لیکن رابعہ کی پسند بھانپ کر پھر میں وہ چیز خرید کر ہی ٹلتا...... لیکن کاش میں وہ چیز بھی اسے خرید کر دے سکتا۔ جو مہنگے داموں سے بھی نہیں ملتی۔ شاید جسے پاکر پھر اس کی آنکھوں کے جگنو کبھی نہ مرتے اور رخساروں کی سرخی ابدی ہو جاتی...... لیکن کئی بار فیاض باپ بھی اپنے بٹوے کی زنجیر کھول نہیں سکتا۔ پیسے اس کے پاس ہوتے ہیں لیکن......

خیر اس رات جب ہم انارکلی سے نکلے تو شام خاصی گہری ہو چکی تھی۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ رات اپنی بہن کے ہاں ٹھہر جاؤں لیکن میں سعیدہ کو اطلاع بھجوا چکا تھا

اور میں جانتا تھا کہ مجھ سے زیادہ سعیدہ کو عنقریب بیاہے جانے والی لڑکی کا خیال ہو گا اور ان چیزوں کے دیکھنے کا اشتیاق ہو گا جو ہم نے خریدی تھیں۔

پہلے تو کار بڑی سبک رفتاری سے چلتی رہی لیکن جب ہم گجرات سے کچھ ادھر پہنچے تو جیسے انجن کو کھانسی کا دورہ پڑا۔ پھر بانٹ نے گرمی زدہ کتے کی طرح سر ہلایا کچھ ہچکولے آئے اور کار ایک دم بند ہو گئی۔ رات کافی گہری نظر آتی تھی۔ باہر اندھیرا گھپ تھا۔ سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی گھپ رات کہرا چاروں طرف چھانے لگا۔ اور مجھے ٹھنڈا پسینہ آگیا۔ کاروں کا دستور ہے کہ موقع پر فیل ہوا ہی کرتی ہیں۔ لیکن اس وقت میرے ساتھ رابعہ تھی۔ اس کے جہیز کی بہت سی چیزیں تھیں اور ہم کیکر لگی دورویہ سڑک پر بالکل اکیلے تھے۔ میں نے بہت زور مارا لیکن انجن کا انکار اقرار میں بدل نہ سکا۔ اس اثنا میں دو تین بسیں قریب سے گزر گئیں لیکن کسی نے میرے کھڑے ہوئے ہاتھ کی التجا پر رحم نہ کیا اور کہر کی چادر کو چیرتی آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔

اور پھر جب مجھے احساس ہوا کہ قرن بیت گئے ہیں اور رابعہ کوٹ کی بانہوں میں ہاتھ دیئے سیٹ کی پشت سے سر جمائے اونگھ گئی تو ایک جیپ ہمارے پاس آکر رک گئی۔

ایک وردی والا باہر نکلا اور انگریزی میں پوچھنے لگا کہ معاملہ کیا ہے؟

میں نے کار کی بے وفائی کا ذکر کیا۔ اس نے ٹارچ نکال کر کچھ دیر تو انجن کی کنسوئی لی اور پھر بولا: ”دیکھیے اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو پنڈی پہنچا سکتا ہوں۔ میرا اردلی اچھا ڈرائیور ہے‘ ہم آپ کی کار اس کے سپرد کر سکتے ہیں۔“

سوئی ہوئی رابعہ نے منہ دوسری جانب پھیر لیا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ گھر پہنچنے کے لیے بے قرار ہے اور اس اندھیری وادی میں اُسے ڈر لگ رہا ہے...... ہم نے خالی لفافے پھوس سے بھرے ہوئے گتے کے ڈبے‘ ریڈیو کا کھوکھا اور تہہ شدہ قالین جیپ میں چڑھایا اور جب زرد کوٹ اٹھائے رابعہ پچھلی سیٹ کی جانب بڑھی تو ایک لمحے کے لیے وردی والے نے اس کی طرف دیکھا۔ یہ لمحہ شاید اس کے لیے اور میرے لیے بہت طویل تھا۔ مجھے لگا کہ اس جیپ کا سہارا نہ لینا چاہیے تھا اور وردی والے نے شاید سوچا کہ اگر وہ ہماری مدد کے لیے نہ آتا تو شاید......

اور پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی رابعہ اچانک گم سم ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا

جیسے وہ سو نہیں رہی‘ اس نے یونہی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کے ماتھے پر ایک نس اُبھری ہوئی تھی اور اس اُبھری ہوئی نس میں دوڑنے والا لہو‘ بڑے تیزی سے گردش کر رہا تھا۔

دورانِ سفر میجر بہزاد اور میں باتیں کرتے چلے آئے لیکن ایک بار بھی اس نے اشارتاً نہ تو رابعہ کا ذکر کیا نہ ہی مڑ کر دیکھا۔ صرف اس نے اپنا اوورکوٹ میری ٹانگوں پر یہ کہہ کر ڈال دیا تھا کہ اسے پہن کر جیپ چلانا آسان نہیں رہتا۔

اپنے گھر پہنچ کر جب جیپ پورچ میں کھڑی ہوئی اور بہزاد خاں نے اتر کر ہمارا سامان برآمدے میں اتارا تو پھر ہم دونوں کے لیے ایک طویل وقفہ آیا۔ رابعہ اپنا پرس لے کر اندر چلی گئی لیکن جالی کا دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے مڑ کر ایک مرتبہ میجر کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ اپنے طور پر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہو۔ میں نے نگاہیں جھکا لیں اور خدا جانے ایک ایسے کرب سے میری چھاتی بھر گئی جس کا نہ کوئی نام تھا نہ ٹھکانہ۔

اس رات کے بعد تیسرے دن کا واقعہ ہے۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ چپڑاسی نے مجھے بہزاد کا کارڈ دیا میں نے فوراً اُسے بلوایا۔ سلیوٹ کرنے کے بعد جب اس نے دونوں بازو پیچھے کیے اور لجاجت سے میری طرف دیکھنے لگا تو میرا دل چاہا کہ اٹھ کر اسے سینے سے لگا لوں...... بہزاد وہ لڑکا تھا جو میرے گھر جنم نہ لے سکا‘ اس کی چوڑی چھاتی‘ بڑے بڑے مضبوط ہاتھ تنے ہوئے جبڑے......اور معصوم دہن۔ اگر میرا کوئی لڑکا ہوتا تو بہزاد کا سا ہوتا۔ یا شاید یہ محض میری تمنا ہے......اس نے آہستہ سے کہا...... ”میں آپ کے پاس ایک عرض لے کر آیا ہوں اور اگر آپ برا نہ مانیں تو بیان کروں؟“ اور جب میں نے اپنے بچے کی تسلی کر دی تو اس نے اس چیز کا مطالبہ کیا جسے میں بیس دن کے بعد کسی اور کو دینے کا وعدہ کر چکا تھا۔ جس پشیمانی سے میں نے انکار کیا اور جس مایوسی سے بہزاد خاں میرے دفتر سے نکلا وہ نقشہ آج بھی میرے سامنے اُبھرتا ہے تو میری چھاتی ایک نامعلوم کرب سے بھر جاتی ہے۔ اس دن کے بعد میں نے شادی کی رخصتی تک پھر رابعہ کو ہنستے نہیں دیکھا۔ وہ جہاں کھڑی ہوتی کھڑی ہی رہ جاتی۔ نہ وہ شوق سے اپنے کپڑے چیزیں بٹورتی نہ کسی سے بات کرتی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں لیکن ان میں بسنے والے جگنو مر چکے تھے۔ سعیدہ سمجھتی تھی کہ اس کی حالت اس لیے

ایسی ہو گئی ہے کہ باپ سے چھوٹنے کا رنج ہے لیکن میں جانتا تھا کہ میں اسے وہ آخری
چیز لے کر نہیں دے سکا جو بچیاں اپنے ماں باپ کے گھر سے لے کر رخصت ہوا کرتی
ہیں۔ جب وہ اپنے شوہر کے ساتھ سہرا باندھے رخصت ہونے لگی تو آخری بار میرے
سینے کے ساتھ لگ کر اس نے سسکی بھری اور پھر خاموشی سے کار پر بیٹھ کر چلی گئی......
یہ سسکی کئی راتوں میرے ساتھ رہی اور جب میں اس سسکی سے پریشان ہو کر اٹھ
بیٹھتا تو سعیدہ کہتی...... "سبھی کی بچیاں بیاہی جاتی ہیں لیکن کوئی یوں دل تو چھوڑ نہیں
بیٹھتا......"

لیکن سعیدہ تو یہ بھی کہتی ہے کہ میں میجر بہزاد کا بیاہ اپنی چھوٹی بچی راشدہ
سے کر دوں......"

میں اس سے کیسے کہوں سعیدہ...... کہ تم بہزاد خاں کو نہیں جانتیں تم اس راز
کو بھی نہیں جانتیں جو بے نام سی سسکی بن کر آج بھی میرے سینے میں گونجتا رہتا ہے۔

شکرانہ

شاہ جی کے گھر میں گھستے ہی احساس ہوتا کہ ڈیوڑھی میں بچھی ہوئی بوسیدہ
چارپائی پر وہ شخص بیٹھا ہے جس کے مرنے کی سبھی دعائیں مانگتے مانگتے اب تھک چکے
ہیں، کبھی اس گھر میں شاہ جی غرّاتے پھرتے تھے جیسے شیر ببر جنگل میں گرجا کرتا ہے
لیکن وہ اتنے برس پہلے کی بات تھی کہ اب خود شاہ جی کو یقین نہ آتا تھا کہ کبھی ایسے ہوتا
تھا۔ ٹوٹی ہوئی مونج کی کھری چارپائی پر ڈھیلی ادوائن کی طرف پیر کیے وہ سارا دن
مراقبے میں پڑے رہتے اور بار بار حقے کی ٹھنڈی چلم چھو کر کہتے...... "اللہ جنت نصیب
کرے اس بہشتن کو کبھی پل بھر کو چلم ٹھنڈی نہ ہونے دیتی تھی......" پھر کبھی کبھی وہ
ہمت کر کے اٹھتے دروازے کی اوٹ میں بیٹھ کر آگ جلاتے اور بڑی نفاست سے چلم پر
پھول چن کر چارپائی پر آ بیٹھتے، لیکن اب تو ان کے لیے یہ کام بھی مشکل ہو گیا تھا۔ وہ
حسرت سے کبھی ٹھنڈی چلم اور کبھی اس کونے کی طرف دیکھ کر رہ جاتے جہاں آگ
جلنے کی وجہ سے کالا نشان پڑ چکا تھا۔

جب بھلے دن تھے اور شاہنی جی زندہ تھیں تو شاہ جی کا معمول تھا کہ صبح گجر دم
اٹھ کر گلی کا آہنی پھاٹک کھولتے ہینڈ پمپ چلا کر سلور کا لوٹا بھرتے اور اونچے اونچے درود
پڑھتے ہوئے وضو کرنے لگتے۔ نماز پڑھنے سے پہلے وہ گھر کے تمام افراد کو نام لے لے
کر جگاتے اور صوم و صلوٰۃ کی برکات پر لیکچر دیتے۔ ان دنوں کسی کی مجال نہ تھی کہ
چارپائی پر لمبی تانے سویا رہتا۔ بڑی بہو تو نلکے کا شور سنتے ہی اٹھ بیٹھتی پھر سعیدہ، صابرہ
اور زبیدہ دوپٹے سنبھالتی سلیپر ڈھونڈتی اندر چلی جاتیں، باقی بچے بھی ریں ریں رونا

شروع کر دیتے اور شاہ جی کا بڑا لڑکا دو چار کروٹیں لے کر بیدار ہو جاتا‘ لیکن ادھر شاہنی نے آنکھیں بند کیں ادھر شاہ جی کا اقتدار کم ہوتا گیا۔ وہ جگاتے جگاتے تھک جاتے لیکن بڑی بہو اور اس کے آٹھ بچّے دالان میں بچھی ہوئی چارپائی پر مُردوں سے شرط باندھے مزے سے سویا کرتے۔ رفتہ رفتہ شاہ جی نے خود ہی صبح خیزی کی تلقین چھوڑ دی اور چپ چاپ وضو کرنے کا وطیرہ اختیار کر لیا۔ جب شاہ جی کی زبان بند ہوئی تو بڑی بہو کی کترنی چل نکلی۔ کہاں تو دوہری ٹکٹل مار کر کسی بچے کے ذریعے سُسر سے بات کیا کرتی تھی اور کہاں اس نے کھلے منہ شاہ جی کے سامنے آ کر گرج کے کہہ دیا کہ رات ہی کو بدھنی بھر کر سرہانے رکھ لیا کریں‘ بچّے صبح بے آرام ہوتے ہیں۔ صحن کی زندگی سے جو گھڑی کا سا تعلق باقی تھا وہ بھی جاتا رہا۔

اب وہ سردیوں میں بھی باسی ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے۔ ٹوٹی ہوئی چٹائی پر نماز پڑھتے اور پھر کھرّی چارپائی پر کندھے جھکائے ناشتے کا انتظار کرنے لگتے‘ لیکن شاہنی کی موت کا سب سے زیادہ اثر کھانے پینے پر ہوا۔

دھوپ منڈیر پر چمکنے لگتی‘ بچے بستے سنبھال کر گلی میں سے جاتے دکھائی دیتے۔ ڈاکیہ چکر لگانے لگتا لیکن شاہ جی کے منہ میں کھیل تک نہ جاتی۔ ایک بڑھاپا دوسرے بے مصرف اجاڑ زندگی‘ بھوک بھی زیادہ لگتی تھی اور بڑی بہو کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ بے چاری ایک جان اور آٹھ بچے...... بچے بھی اس رفتار سے اس گھر میں آئے تھے جیسے ریل گاڑی کے ڈبے پلیٹ فارم میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے قطار باندھے دیکھتے ہی دیکھتے شاہ جی کا دالان کلبلاتے بچوں سے بھر گیا...... شاہ جی کا دھیان یہاں کون کرتا‘ بڑی بہو تو اپنے آخری بچے بتو کو بھی جان کا روگ سمجھتی تھی۔ بے چارہ سوکھی روٹی کا ٹکڑا لے کر ڈیوڑھی میں آ جاتا اور شاہ جی کی چارپائی سے لگ کر کھڑا ہو جاتا۔

شاہ جی پوچھتے: ”کیوں بھائی اندر سب ناشتہ کر چکے؟“

”ناشتہ؟“ بتو پیٹ کھجلا کر سوال کرتا۔

”تم نے دودھ پی لیا؟“

”نہیں۔“

”بی بی نے روٹی پکائی؟“

”پکا لئی اے دادو جی......“ بتو ہی ایسا فرد تھا جو شاہ جی کو دادو پکارتا تھا ورنہ اس گھر میں جو اسے مخاطب کرتا اپنی مرضی کے مطابق نام لے کر پکارتا۔

بس بتو اور شاہ جی کا ساتھ تھا۔ شاہ جی کو پنشن کے جو پندرہ روپے ملتے تھے ان میں سے وہ تین روپے اپنی تہمد کی ڈب میں باندھ کر رکھ چھوڑتے۔ ”کھیل تماشے“ والا آتا تو شاہ جی کچھ نہ کچھ خرید کر بتو کو دیتے۔ وہ گلی میں چھپ کر سب کچھ کھاتا۔ پھر منہ پونچھ کر آتا تاکہ بی بی کو پتہ نہ چلے...... ”پھر ملائی کی کلفی والا گزرتا تو بھی وہی بتو کی کفالت کرتے۔ بتو بھی ماں سے مانگنے کے بجائے ہمیشہ ڈیوڑھی میں آ کر چارپائی کے پائے سے لگ کر کھڑا ہو جاتا اور حریص نگاہوں سے دیکھ کر کہتا: ”دادو غبارے والا آیا ہے جی۔“ شاہ جی اپنی مربعوں والی سبز تہمد کا ڈب لرزتی انگلیوں سے کھولتے اور کہتے:

”لے اکنی لے جا اور دیکھ کسی کو بتانا مت۔“

”میں تو کہوں گا زبیدہ آپا نے لے کر دیئے ہیں وہ کبھی کچھ نہیں کہتیں دادو جی......“

لیکن پتہ نہیں ایک دن بڑی بہو سے کسی نے جا کر یہ پرچہ لگایا کہ مونگ پھلی والا شاہ جی کی ڈیوڑھی میں بیٹھا باتیں کر رہا ہے اور شاہ جی بیٹھے مونگ پھلیاں چبا رہے ہیں۔ ابھی تک بڑی بہو نے کبھی بوڑھے سسر سے یوں کھلے بندوں جھگڑا نہ کیا تھا لیکن آج وہ ادب گئی۔ گھر کے اتنے سارے خرچ‘ چھوٹے شاہ کی اتنی قلیل آمدنی اور بڈھے کو یہ چٹخارے سوجھے ہیں۔ دودھ بلو رہی تھی وہیں مکھن‘ لسّی کا جھنجٹ زبیدہ کے سپرد کیا اور ڈیوڑھی میں پہنچی۔ ”اے شاہ جی تمہیں جو پنشن کے پندرہ ملتے ہیں تو تین کیا تم اسی کارستانی کے لیے رکھتے ہو؟“

بڑی بہو سے آج تک شاہ جی نے کبھی ٹکر نہ لی تھی جی ہی جی میں لرز گئے اور سوچنے لگے کہ اگر میں اپنی بیٹی کے گھر چلا جاتا تو شاید یہ نوبت کبھی نہ آتی۔ بیٹیاں ہمیشہ ماں باپ کی عزت کرتی ہیں‘ بارہ روپے اگر گاؤں میں بیٹی کو ملتے رہتے تو شاید میں اتنا بڑا بوجھ نہ بنتا۔

بڑی بہو نے جواب نہ پایا تو چلّا کر بولی...... مونگ پھلیاں کھاؤ اور میرے سینے پر مونگ دلو لیکن یہ یاد رکھو کہ اگلے مہینے سے مجھے پورے پندرہ نہ ملے تو اس

گھر سے سوکھی روٹی بھی نہ ملے گی۔ قہر خدا کا...... اتنی روحیں بھلا میں کہاں سے پالوں؟ ایک آدمی کو بارہ روپے میں سے کیا کھلاؤں اپنا سر......!"

شاہ جی نے منہ سے ایک لفظ نہ کہا بلکہ مراقبے میں اور بھی جھک گئے...... بڑی بہو کو اس رویے پر اس قدر جھلاہٹ ہوئی کہ نتھنے پھلاتی دوہتڑ پیٹتی وہ اندر چلی گئی۔ راہ میں اسے نالی کے پاس بتّو نظر آ گیا۔ بو آرام سے بیٹھا مونگ پھلی کے دانے نکال کر چبا رہا تھا۔ ایک دانہ تھڑک کر نالی کے گندے پانی میں جا گرا تھا اور وہ اسے انگلی سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب بڑی بہو نے اسے جا دبوچا...... بو نے کچھ ایسی پٹخنی کھائی کہ ساری مونگ پھلیاں یک بارگی نالی میں جا گریں۔ طمانچے اس زور سے پڑے کہ گال چقندر کی طرح سرخ ہو گئے اور آنکھیں بیر بہوٹیاں بن گئیں۔

شاہ جی نے جب بو کی ایسی درگت دیکھی تو ان کا دل دہل گیا۔ آج تک انہوں نے کسی سے اونچی نیچی بات نہ کی تھی۔ مرے ہوئے کتے ایسی زندگی بسر کیے جا رہے تھے لیکن بو کا سوجا ہوا چہرہ دیکھ کر ان سے رہا نہ گیا' لاٹھی ٹیکتے زنانے میں گئے...... بڑی بہو چنگیر میں روٹیاں دھرے دہی کے ساتھ بچوں کو کھلا رہی تھی۔ شاہ جی کھنکارے اور آہستہ سے بولے: "بڑی بہو' میں زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا لیکن اگر تم نے دوبارہ بو پر ہاتھ اٹھایا تو اس کا نتیجہ اچھا نہ ہو گا۔"

"کیوں شاہ جی کیا اپنی اولاد کو بھی سیدھی راہ پر لانے کا ماں کو حق نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ بڑا ہو کر چٹورا بنے۔"

"کچھ بھی ہو بہو...... یہ بات دوبارہ نہ ہو۔" شاہ جی تو یہ کہہ کر واپس چل دیئے لیکن انہوں نے بڑی بہو کی آواز سن لی۔ وہ زبیدہ سے کہہ رہی تھی: "ہمارے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں اور اوپر سے گھمنڈ دیکھو۔ زیادہ سے زیادہ اپنی بیٹی کے پاس ہی چلا جائے گا نا' خس کم جہاں پاک۔ میں تو دو نفلیں پڑھوں گی شکرانے کی۔"

شاہ جی کا جیب خرچ بند ہوا تو سب سے زیادہ مشکل بتّو کو پڑی۔ کھیل بتاشے والے نے دو دن تو ترس کھایا اور پھر ادھار دینے سے صاف انکار کر دیا۔ غبارے والا اب جھڑکنے لگا تھا اور وہی مونگ پھلی والا جو یوں شاہ جی سے گھل مل کر باتیں کیا کرتا تھا' اب چپکے سے ڈیوڑھی کے آگے سے گزر جاتا۔ کچھ دن تو بتّو نے شاہ جی سے تقاضا کیا لیکن جب شاہ جی نظریں جھکاتے ہاتھ مل کر رہ گئے تو بتّو نے اِدھر اُدھر سے پیسے

کھسکانے شروع کر دیئے۔ کبھی اماں کے دوپٹے سے دونی کھول لی' کبھی زبیدہ آپا کی تلے دانی میں سے اکنّی نکال لی۔

بو کی چوریاں کبھی نہ کھلتیں اگر وہ ایک دن عین موقع پر نہ پکڑا جاتا' ہاتھ میں اٹھنی تھی۔ سعیدہ آپا کا صندوق کھلا تھا کہ اماں آ گئیں۔ بتّو کا چہرہ مارے خوف کے زرد ہو گیا اور لب کانپنے لگے۔ اماں بھانپ گئی بڑھ کر زبردستی مٹھی کھولی تو ٹھنٹھناتی اٹھنی پکے فرش پر گری۔ اماں نے پورے ہاتھ کا دھپّا بتّو کے سر پر مارا تو وہ انجانے میں کھلے صندوق میں گرا۔ سر سے لہو کا فوارہ چھوٹا۔ بڑی بہو کے چھکّے چھوٹ گئے۔ جلدی سے بو کو گود میں اٹھا کر باورچی خانے کی طرف بھاگی۔ گھر بھر میں زلزلہ سا آ گیا۔ کوئی دوپٹے کی پٹیاں بنانے لگا' کوئی گرم دودھ کا کٹورا لے کر بھاگا۔ صرف شاہ جی لاٹھی کے سہارے کھڑے چُپ چاپ دیکھتے رہے۔ ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا لیکن جب بتّو نے شاہ جی کے پاس جانے کی ضد کی تو بڑی بہو بھی لاچار ہو گئی اور ڈیوڑھی میں کھری چارپائی پر پہلی بار کھیس بچھا کر بتّو کو اس پر لٹا دیا گیا۔ شاہ جی رات گئے تک چلم گرم کیے اپنی پگڑی کے کونے سے سینک دیتے رہے اور جب بتّو سو گیا تو نہ جانے کیا کیا پڑھ کر اس پر دم پھونکتے رہے۔

صبح جب بڑی بہو کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ ادھر ادھر سب آپس میں مشورے کرتے پھر رہے ہیں' کبھی دو مل کر کچھ کہتے ہیں' آوازیں اُبھرتی ہیں اور پھر ڈوب جاتی ہیں۔ ایک سازش سی ہوا میں پھر رہی تھی۔ بڑی بہو نے تصدیق کی تو پتہ چلا کہ ڈیوڑھی خالی ہے۔ بھاگی بھاگی ادھر پہنچی تو کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ڈھیلی ادوائن کی چارپائی دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ جا بجا بجھی ہوئی راکھ کی ڈھیریاں پڑی تھیں۔ بدھنی اور چھوٹا صندوق جس میں شاہ جی اپنے دوچار بوسیدہ کپڑے رکھتے تھے غائب تھا' شاہ جی اور بتّو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بڑی بہو نے ماتھا پیٹ لیا اور وہیں ڈھیر ہو کر رونے لگی۔ سارے بچے سہمے سہمے دروازے میں سے جھانکنے لگے اور زبیدہ نے آہستہ سے سعیدہ کے کان میں کہا: "تب تو اماں کہتی تھیں دو نفلیں شکرانے کی پڑھوں گی اب کیوں نہیں پڑھتیں' شاہ جی تو خود ہی دفع ہو گئے۔"

تجدیدِ وفا

لمبی سی انگڑائی لے کر اختر نے کھڑکی پر نظر ڈالی۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ رات بھر کیف گزر گئی اور وہ رات بھر سویا بھی رہا۔

باہر پہاڑی گھروں کی چھتیں نکھری ہوئی دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ عین کھڑکی کے سامنے سرخ ٹین والی چھت کی کوٹھی تھی اور اس کوٹھی سے پرے نیلے آسمان میں ایک دوپٹہ بھر بادل لہرا رہا تھا۔ اختر اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ لال چمکدار چھت پر سورج کی تیکھی کرنیں سیدھی پڑ رہی تھیں اور ان کرنوں میں ایک سفید بلی پشم کی گیند بنی بیٹھی تھی۔ رہ رہ کر وہ اپنی دُم اور پنجے چاٹتی اور پھر لمبی سی انگڑائی لے کر اون کا گولا سا بن جاتی۔

اختر نے محسوس کیا کہ یہ وہی سفید بلی تھی جسے وہ پچھلے سال یہیں کھڑکی میں سے بیٹھ کر دیکھا کرتے تھے۔ اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ پہلے دن جب وہ اس ننھی سی کاٹیج میں اُترے تھے تو شام گہری ہو چکی تھی۔ بانو بہت تھکی ہوئی تھی اور وہ دونوں سٹوو پر انڈے اور کافی بنا کر جلدی جلدی کھانے کے بعد ہی سو گئے تھے۔ جب وہ صبح اٹھا تو بانو کھڑکی میں کھڑی تھی۔ اس کے لمبے بال کھلے تھے اور ڈریسنگ گاؤن کے اوپر پھیلے تھے۔ اسے دیکھتے ہی اختر نے آنکھ مار کر بازو پھیلا دیئے تھے اور کسلمندی سے آنکھیں میچ لی تھیں لیکن بانو اُس کی طرف نہ آئی۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے کہا تھا: ”اکھو ادھر آؤ نا...... یہ دیکھو......؟“

لیکن جب اس نے اٹھنے میں تساہل برتا تو بانو اس کے قریب آ گئی اور بازو

سے کھینچتے ہوئے بولی: ”ہائے اللہ دیکھو تو سہی اگر وہ چلی گئی تو بخدا میں رو دوں گی۔“

اختر اسے اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے بولا:

”اب کوئی اور مجھے دکھاؤ گی تو میں بے وفائی کا ذمہ دار نہ ہوں گا ہاں......“

بانو کے قہقہے کھڑکی کے سامنے لگے ہوئے دیودار کے قرصوں سے لٹک گئے۔

جب وہ دونوں کھڑکی میں پہنچے تو بلی سرخ ٹین کی چھت پر ننھے ننھے قدم جماتی جا رہی تھی۔ مایوسی سے بانو نے سر جھکا لیا اور آہستہ سے بولی: ”ہائے اللہ یہ تو جا رہی ہے......“

بانو کی مایوسی کس طرح اختر کے بازوؤں میں گھر کر قہقہوں میں بدل گئی تھی۔ ان قہقہوں کی صدائے بازگشت اب بھی اُسے اس بدلی سے آ رہی تھی جو سفید دوپٹہ بنی نیلے آسمان میں لہرا رہی تھی......

سٹوو پر چائے کا پانی دھرتے ہوئے اختر نے سوچا بھلا یہ کیا تک تھی کہ میں پھر یہاں آ گیا ہوں؟“ بھلا اس سے بڑی اور حماقت کیا ہو گی؟ اس نے سوچا کہ آج ہی پنڈی جانے والی بس سے واپس چلا جائے لیکن اس کمرے کی ہر چیز جیسے بازو پھیلائے اسے روک رہی تھی۔ بھلا یہاں آنا کیا ضرور تھا اگر وہ یہاں آ ہی گیا تھا تو اسی گھر میں رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہاں کی تو ایک ایک چیز سے یادیں وابستہ تھیں گہری گھمبیر اور نہایت تکلیف دہ!

وہ نائٹ سوٹ میں ہی کاٹیج کے باہر آ گیا اور پہاڑی پتھروں سے بنی ہوئی پگڈنڈی پر ہولے ہولے چلنے لگا۔ کمرے کے اندر سٹوو پر پانی سوں سوں کرنے لگا تھا اور سامنے والی کوٹھی کی چھت سے بلّی جا چکی تھی۔ یہ پتھریلی پگڈنڈی اس چھوٹی سی کاٹیج کو اوپر پکی سڑک سے ملاتی تھی اور بتدریج چڑھائی کی طرف مائل تھی۔ اس کے اردگرد سونت اور آکھے کی جھاڑیاں پھلوں سے لدی ہوئی نظر آ رہی تھیں اور اس جگہ جہاں خشک برساتی نالے پر چھوٹا سا لکڑیوں کا ٹیڑھا پل تھا' ڈھلوان کی جانب پھچیوں سے بنے ہوئے جنگلے پر دونوں کہنیاں ٹکائے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ عین اسی جگہ اسی جنگلے پر کئی مرتبہ سہارا لے کر بانو نے اپنی تھکن دور کی تھی اس جنگلے کے قریب پہنچ کر وہ ہمیشہ کہا کرتی تھی۔ ”لو اب تو گھر آ گیا ہے۔“

ان آڑی ترچھی پچھیوں میں ایک پیر اٹکا کر سوکھے برساتی نالے میں پتیاں پھینکتے ہوئے وہ گنگنانے لگتی اور پھر اختر کو نیلی نیلی فضا میں چھپے ہوئے پہاڑوں اور بادلوں سے بھی عشق ہو جاتا!

لڑکی نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور پھر مسکرا دی۔ اختر اخلاقاً مسکرا کر پلٹنے ہی والا تھا جب اس لڑکی نے دوپٹہ کندھوں پر درست کرتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کب آئے اختر بھائی؟“

”رات......!“

کہنے کو تو وہ کہہ گیا لیکن یہ لڑکی کون تھی اور اسے کس طرح جانتی تھی بھلا؟“

پیارا سا گول چہرہ۔ چھوٹے چھوٹے بال خوب کس کر پیچھے ربن سے بندھے تھے اور گہرے سبز رنگ کی سوئٹر میں اس کا جسم نہایت متناسب لگ رہا تھا۔

لیکن اسے اختر بھائی کہنے والی یہ لڑکی آخر تھی کون؟

”آپ اختر بھائی ہی ہیں نا؟ کالٹیکس والے؟“ اور معاً اسے یہ آواز یاد آ گئی۔ یہ تو بانو کی سہیلی تھی۔ پچھلے سال مری کی مال پر اس کے ساتھ ایک لمبا سا لڑکا بھی ہوا کرتا تھا جو ہمیشہ رنگین چکوں والی قمیصوں میں ملبوس ہوتا اور سر پر سٹراہیٹ ہوتی! اختر اور اس لڑکے کی علیک سلیک تو نہ بڑھ سکی لیکن بانو اور تسنیم جہاں کہیں ملتیں ان دونوں سے ہٹ کر باتیں کرنے لگتیں کبھی کبھار تو اختر کو بھی کوئی لاہور کا ملاقاتی یا دوست مل جاتا لیکن اگر اسے تنہا کھڑے ہو کر انتظار کرنا پڑتا تو اس کے کئی سگریٹ ختم ہو جاتے۔ تسنیم کا ساتھی ہمیشہ ہولے ہولے چلتے ہوئے آگے بڑھ جاتا اور پھر اس وقت تک چلتا رہتا جب تک تسنیم بھاگ کر اس کے ساتھ شامل نہ ہو جاتی۔ اختر اور بانو نے کئی بار اس انوکھے سٹراہیٹ والے آدمی کے متعلق کچھ جاننے کی کوشش کی تھی لیکن تسنیم ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال جاتی تھی...... ”منگیتر ہے میرا بڑا جھینپو ہے سچ!“

اختر کی نظریں اپنے نائٹ سوٹ پر گئیں اور اس نے جی ہی جی میں کڑھتے ہوئے سوچا کیا مجھے مری آنا ضرور تھا اور اگر میں مری اپنی حماقت کے باعث آ ہی گیا ہوں تو اس لڑکی سے ملاقات کیا لازمی تھی۔ لاہور سے چلتے ہوئے اس نے ایک لمحہ کے لیے بھی نہ سوچا تھا کہ اگر وہاں کوئی ملاقاتی مل گیا تو، تو کیا ہوگا؟

تسنیم نے پھر پوچھا: ”آپ ہی اختر بھائی ہیں نا؟“

”مجھے دیکھ کر اس قدر حیران کیوں ہو رہی ہو تسنیم؟“

وہ مسکرا دی۔ نہایت سادگی کے ساتھ۔

”پچھلے سال تو آپ اور بانو ہمیشہ اکٹھے ہوتے تھے...... اس سال آپ اسے ساتھ نہیں لائے شاید؟“ اختر نے نظریں جھکا لیں۔ تسنیم نے یہ سوال پوچھ کر اس کے دل پر بھالے کی تیز نوک دھر دی تھی۔ اس لمحے اس سادگی سے چکرانے والی لڑکی سے اختر کو شدید نفرت ہو گئی۔ یہ کھڑی مجھ سے باتیں کیوں کر رہی ہے؟ آج اس کا جھینپو منگیتر کہاں چلا گیا؟ وہ اس کے ساتھ کیوں نہیں آیا؟

”بانو؟...... بانو کیسی ہے؟“...... ہرے سوئٹر والی نے نہایت آہستگی سے پوچھا اور اس کے دانتوں سے ٹکراتے لبوں سے بجتے یہ الفاظ ادا ہوئے...... ”بانو مر گئی ہے۔“......

تسنیم کا چہرہ یکدم ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔ اس نے لبوں پر زبان پھیری اور مُردہ سی آواز میں بولی: ”معاف کیجئے گا مجھے علم نہ تھا کہ......“

تسنیم کا چہرہ دیکھ کر اختر کو احساس ہوا جیسے وہ بانو کی موت کا سارا الزام اپنے سر لے رہی ہو۔ اس کی افسردگی دیکھ کر اختر کو اس پر ترس سا آ گیا اور اس نے آہستہ سے کہا:

”بھلا معافی کی کیا بات ہے؟“

پھر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ قریب سے ایک گوالن سر پر چمکتے پیتل کی گاگر اٹھائے ان کی طرف دیکھتی ہوئی گزر گئی۔ تسنیم ٹیل کے جنگلے پر جھک گئی اور آہستہ آہستہ رسونت کی پتیاں توڑ توڑ کر خشک برساتی نالے میں پھینکنے لگی۔

بہت دیر بعد اس نے پھر کہا: ”واقعی مجھے علم نہ تھا۔“

معاً اختر کو خیال آیا کہ یہاں سے بیس قدم کے فاصلے پر کھڑکی کے سامنے چھوٹی میز پر کیتلی کا پانی کھول رہا ہو گا۔ اس نے بڑی بے دلی سے پوچھا: ”میں چائے پینے والا تھا، آپ کا جی چاہے تو میرے ساتھ چلیے۔“

اسے پوری امید تھی کہ معاشرے کے عام اصولوں کے مطابق تسنیم کسی بڑے مہذب انداز میں اس دعوت سے انکار کر دے گی لیکن وہ اس کے ساتھ چلنے

ہوئے بولی......

"شکریہ! چلئے۔ نیچی چھت کے ساتھ ساتھ لٹکے ہوئے گملوں کے پاس پہنچ کر اس نے پھر کہا: "یقین نہیں آتا۔"

اختر کے حلق میں ریت پھنس گئی۔ اس نے سرخ چھت والی کوٹھی پر نظر جما کر جواب دیا: "مجھے بھی نہیں آتا اس لیے تو میں یہاں آ گیا ہوں...... میرا خیال تھا کہ وہ لاہور میں مجھ سے بچھڑ کر یہاں آ گئی ہو گی!"

تسنیم نے نظریں جھکا لیں۔ اس کا رنگ یکدم پھیکا پڑ گیا تھا۔

بڑی مدت کے بعد جیسے صدیوں کے بعد وہ آرام سے سگریٹ سلگا کر پلنگ پر بیٹھ گیا اور تسنیم چائے بنانے لگی۔ اس کے ہاتھوں میں بڑی نفاست تھی اور ہر کام وہ بڑے ڈھب اور سلیقے سے کر رہی تھی۔ اختر کو اپنے کمرے میں ایک نئی عورت کے وجود سے تھوڑا سا سکون اور بہت زیادہ الجھن سی محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ اس وقت اپنے جذبات کا تجزیہ نہ کرنا چاہتا تھا۔

"لیجیے......"

چائے کا پیالہ تسنیم کے ہاتھ سے لے کر اختر نے تکیے پر ٹکا لیا۔

تسنیم اپنا پیالہ لے کر کھڑکی میں اس کی جانب پشت کر کے کھڑی ہو گئی۔

دوپٹہ بھر بادل خدا جانے کہاں سرک گیا تھا اور اب نتھرے ہوئے آسمان پر دور تک نیلاہٹوں کے رنگ برنگے پردے پھیلے ہوئے تھے۔

"پچھلے سال بھی آپ اسی روز کاٹیج میں اترے تھے کیا؟"

"ہاں......" اس نے چائے سے حلق تر کر کے جواب دیا۔ "اور اس سال آپ اپنی یادوں سے تجدیدِ وفا کرنے آئے ہیں؟"

"ہاں......"

"یادوں کے سہارے جینا بہت مشکل ہوتا ہے......" وہ کہیں دور سے بولی۔

وہ خاموش ہو گیا۔

اس کے لیے یہاں آنا ناگزیر تھا۔ اسے یادوں کا سہارا ہی نہ لینا تھا بلکہ اسے بانو کی ابھی تک تلاش تھی۔ جب پچھلے سال اسی ماہ میں اپنا ماہِ عسل منانے وہ یہاں آیا تھا تو کاٹیج کے سامنے لگی ہوئی بیل میں گلاب کے پھول لگے ہوئے تھے۔ بانو نے زرد ساڑھی

پہن رکھی تھی اور وہ نئی بیاہی ہوئی نہیں لگتی تھی...... ایک ماہ بھر کے وقفے میں اس گھر کی ہر ایک چیز پر کیوں کر اپنی مہریں ثبت کر دی تھیں اس کا بھلا تسنیم کو کیا علم تھا؟

اس دنیا میں بانو کا اور رہ بھی کیا گیا تھا۔ یہی تو ایک جگہ تھی جس سے بانو نے عشق کیا تھا۔ پھر بھلا وہ ایک ہی سال میں اس کے وجود سے بے خبر کیوں کر ہو جاتا؟

جس روز اس جہاں سے بانو رخصت ہوئی لاہور والا مکان تو اس نے اسی دن بیچ دیا تھا لیکن روز کاٹیج کو وہ کیوں کر بیچ سکتا تھا؟ اس کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر تو اس نے ان بچوں کے خواب دیکھے تھے جن کو پہلی مرتبہ چھونے کی کوشش میں بانو جاں بحق ہو گئی تھی۔ بانو کو بچوں سے محبت تھی اسے اس کاٹیج سے پیار تھا اور اسے اختر سے عشق تھا۔ اختر نے ان تینوں چیزوں کو جن سے بانو کو پیار تھا اکٹھا کرنے کی خاطر اتنا سفر کیا تھا اور اب اسے منطق سمجھ آ رہی تھی کہ یہ سفر اس نے محض اپنے وجود کو تکلیف دینے کے لیے اپنے وجود کو اذیت پہنچانے کے لیے طے کیا ہے۔

وہ بانو کو بھلانا نہ چاہتا تھا لیکن اس کی تمنا تھی کہ بانو کی یادیں بھالے کی طرح ہر بار اس کے دل میں پیوست ہو جایا کرے۔ ہر قدم جو وہ یہاں اٹھاتا جس چیز پر اس کی نظر پڑتی نئے ڈھنگ سے اسے بانو کی غیر موجودگی کا احساس دلاتی......

اس نے اپنے خیالات سے پیچھا چھڑا کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔ تسنیم اس کی جانب پشت کیے کھڑی تھی۔ پھر یک لخت اس نے مڑ کر اختر سے کہا۔

"ذرا ادھر آئیے وہ دیکھئے۔"

اختر تکیے پر پیالہ چھوڑ کر کھڑکی کی جانب بڑھا۔

"وہ دیکھئے سامنے۔"

سامنے سرخ ٹین کی چھت پر سفید اون کا گولا پڑا تھا۔

"مجھے بلیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔" تسنیم آہستہ سے بولی۔ "دیکھئے نا کیسے اپنے پنجے صاف کر رہی ہے۔"

اختر نے نظر جھکا لیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"معاف کیجیے گا...... شاید...... آپ کو بلیاں اچھی نہیں لگتیں۔"

"بہت زیادہ لگتی ہیں۔" اختر نے ہونٹ کاٹ کر کہا۔

"شاید میں نے کوئی بہت غلط بات کہہ دی ہے۔"

اختر نے پھر تسنیم کی جانب نظر کی' اس کا چہرہ بے رنگ تھا۔ یہ لڑکی کس قدر جلدی پریشان ہو جاتی ہے۔ اس کی پریشانی مٹانے کی خاطر وہ جلدی سے بولا۔

"معاف کرنا تسنیم میں طبعاً نہایت خاموش ہوں۔ تم بور تو نہیں ہو رہیں۔"

"جی نہیں...... آپ کی چائے بہت مزیدار ہے اور اس کے ساتھ باتوں کی کوئی ایسی خاص ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔"

چائے کا پیالہ ختم کر چکنے کے بعد وہ آہستہ سے میز تک بڑھی بغیر برتنوں کا شور بلند کیے اس نے پیالہ میز پر رکھا اور پھر اس کی طرف دیکھے بغیر بولی: "میں بھی اس پگڈنڈی پر تجدیدِ وفا کی خاطر آئی تھی۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ کی طرح میری کوشش بھی فضول تھی۔ بالکل فضول۔"

وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی تو اختر نے غیر شعوری طور پر بڑی دلچسپی سے پوچھا: "تم کہاں رہتی ہو تسنیم۔"

"کشمیر پوائنٹ کی طرف...... وہاں میری خالہ رہتی ہیں۔"

اور اختر نے نظریں جھکا کر بمشکل تمام کہا: "اور وہ لڑکا کہاں ہے وہ جھینپو سا لڑکا جو بھڑکیلے چیکوں والی قمیصیں پہنتا تھا۔"

وہ ہنس دی اور سوئٹر کو درست کرنے کے بعد کتنی ہی دیر چپ رہی۔ جب اس نے نظریں اٹھائیں تو اختر کو احساس ہوا کہ یہ آنکھیں بہت کشادہ تھیں۔ ان میں ایسی گہرائی تھی جو بڑے دکھ جھیل کر نصیب ہوتی ہے...... ایسی انسان دوستی تھی جو ہر نظر میں نہیں ہوتی۔

"ہر بے وفا کا ربط ہے اک بے وفا کے ساتھ ......" وہ بولی: "ساجد کو تو جانا ہی جانا تھا...... وہ میرا منگیتر تھا...... یعنی ماضی بعید کی بات ہے......"

"معاف کرنا...... مجھے علم نہ تھا......"

اس بار وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"بھلا آپ کا اس میں کیا قصور ہے؟ منگنیاں چھوٹ جایا کرتی ہیں اور کبھی کبھی جانبین میں سے ایک اس دکھ کو یوں اپنا لیتا ہے گویا......"

"آپ جانتے ہیں نا ایسے دکھ کو؟"

اختر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسے اپنے وجود کے تھوتھے پن کا احساس

شدت سے ہو رہا تھا۔ بانو کے ساتھ یہ زندگی کس قدر بامعنی تھی۔ صبح آنکھ کھولنے سے لے کر رات کے اس آخری لمحے تک جب آنکھیں خود بخود نیند سے بند نہ ہو جاتیں اور اب زندگی ایک خلاء تھی جس میں وہ ایک ہلکے پھلکے پر کی مانند تیرتا پھر رہا تھا...... نامعلوم راہوں پر بے ارادہ...... بے مصرف۔

کبھی کبھی وہ سوچتا کہ آخر تیس برس کی زندگی میں اس نے بانو کے ساتھ ایک ہی سال تو گزارا تھا۔ پھر یہ ایک سال اس کے سارے ماضی کو اس کے مستقبل کے ارادوں کو کیوں کر نگل گیا۔ ایک سال کی کیا بساط تھی کہ کسی کی ساری زندگی پر مایوسی اور الم ناکی کی مہر ثبت کر سکتا؟ شروع دن سے اسے علم تھا کہ بانو بچے کا بوجھ برداشت نہ کر سکے گی۔ اس کا جسم پھول کی طرح نازک تھا جو بھنورے کے قرب سے جھولنے لگتا ہے...... لیکن اسے بچوں سے کتنی محبت تھی...... کس قدر! اور بچے کی آمد کا جان کر وہ کتنی خوش رہنے لگی تھی؟ جب وہ بڑھتے ہوئے پیٹ پر چادر ڈال کر اس کے قریب دو زانو ہو کر بیٹھ جاتی تو اختر کے دل میں خوف کے پہاڑ جنم لیتے۔ بانو کے گالوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں سفید چہرے پر چھائیوں کے نشان اور ہاتھوں کی پھولی ہوئی رگیں اسے نہ جانے کیا کیا سوچنے پر مجبور کر دیتیں۔

...... یہ خوف دور کرنے کی وہ بہت کوشش کرتا۔

...... وہ ڈاکٹروں کے مشورے بھول جانے پر بضد ہو جاتا اور جی ہی جی میں کہتا: "اس سے بھی کمزور عورتوں نے صحت مند بچوں کو جنم دیا ہے تو بھلا یہ خوشی اس کے مقدر میں کیوں نہیں ہو سکتی۔"

لیکن اس وقت بھی اُسے احساس رہتا کہ پھول پھول رہتا ہے ...... اور بھنورے کا قرب بھی برداشت نہیں کر تا تو یہ نئی زندگی کی تخلیق کیوں کر کر سکے گا؟ یہ پھول زندگی کے اتنے بڑے تقاضے کو کیوں کر پورا کر سکے گا......؟

"مجھے اب اجازت دیجئے......" تسنیم نے آہستہ سے کہا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور ڈریسنگ گاؤن پہنتے ہوئے بولا۔

"تمہیں سڑک تک پہنچا آؤں؟"

"اگر آپ کا جی چاہے تو؟"

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ سبز سوئٹر والی کا جسم کتنا مضبوط کس قدر

تندرست اور توانا تھا۔ جب وہ چلتی تو پیچھے ربن سے بندھے ہوئے چھوٹے چھوٹے بال اس کی پشت پر ہلنے لگتے......

"آپ کیا کرتی ہیں تسنیم...... یعنی......"

"لاہور میں پڑھاتی ہوں ایک سکول میں۔"

اس نے مڑ کر دیکھا اور پھر لاتعلقی سے بولی۔

"......اور اب شاید ساری زندگی پڑھاؤں گی۔"

اس کی آنکھیں بہت گہری تھیں اور ان میں صدیوں کا دکھ کروٹیں لے رہا تھا۔

چلتے چلتے تسنیم نے بہت آہستہ سے پوچھا: "بھلا آپ یہاں کیوں چلے آئے؟"

"مجھے آنا تھا تسنیم...... بہر صورت؟"

"تجدیدِ وفا کے لیے......؟"

"ہاں......"

"آپ بانو کے متعلق باتیں کرنا نہیں چاہتے نا؟"

"نہیں...... مجھ میں اس کے متعلق باتیں کرنے کی قوت باقی نہیں رہی۔"

وہ خاموش ہو گئی اختر کو لگا جیسے وہ اپنے ہٹیلے غم کو لوری سنا کر سلانے میں مشغول ہو گئی ہو۔

بانو سے آخری ملاقات کتنی مختصر تھی؟

ہسپتال کے بیڈ پر سفید چادر میں وہ چادر سے بھی زیادہ بے رنگ نظر آ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بانو نے کہا تھا: "بچہ آپ نے دیکھا ہے؟"

"ہاں بہت پیارا ہے۔"

بانو کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ آہستہ سے بولی...... "پتہ نہیں مجھے کیوں نہیں دکھاتے یہ ہسپتال والے......؟"

اس نے اپنے جی میں کہا...... تمہیں کہاں سے بچہ لا کر دکھائیں بانو؟ وہ تو سفید چادر میں لپیٹ کر کل شام ہی میں گھر لے گیا تھا۔ وہ تمام کپڑے جو تم نے مدتوں بیٹھ کر سیئے تھے...... میں نے اس کے ساتھ اس لیے دفنا دیئے کہ اس چھوٹی سی جان کو

مٹی تلے بغیر کسی ساز و سامان کے چھوڑنا میں نے گوارا نہ کیا۔

بانو کے ماتھے پر تیوری پڑ گئی تھی...... وہ بمشکل تمام بولی: "کاش میں تندرست ہو جاؤں۔ اختر تو پھر ہم بچے کو لے کر روز کاٹیج جائیں گے۔"

نرس نے اندر آ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اختر نے اس کے ماتھے کو چھو کر کہا: "......ہاں ہاں کیوں نہیں ہم تینوں جائیں گے تینوں۔"

"میں اسے وہ بلی دکھاؤں گی...... اختر......"

"اب آپ جائیں...... مریض پر نقاہت کا دورہ پڑ رہا ہے۔"

سفید ٹوپی والی نے اسے باہر نکال دیا۔ اور جاتے وقت اس میں اتنی ہمت بھی باقی نہ رہی تھی کہ آخری بار بانو کو دیکھ لیتا......

بانو کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ پھر بھلا وہ اپنے بچے کو چھوڑ کر یہاں کیوں رہ جاتی؟ لیکن وہ ان دونوں کے بغیر ہی روز کاٹیج آ گیا تھا۔ سرخ چھت پر بلی کو دیکھنے...... پل کے کنارے پتیاں مسل مسل کر خشک نالے میں پھینکنے کے لیے...... وہ تمام ننھی ننھی یادیں دوہرانے کے لیے جو تیز استرے کی طرح اس کے دل میں اتر جاتی تھیں۔

جہاں پگڈنڈی شاہراہ سے ملتی تھی۔ وہاں جا کر وہ دونوں رک گئے۔ تسنیم نے مسکرانے کی کوشش کی اور پھر بھیگی آنکھیں جھکا کر بولی......

"میرا خیال ہے بانو جیسی خوبصورت لڑکی میں نے کبھی نہیں دیکھی......"

اختر خاموش رہا......

"خدا حافظ......" تسنیم بولی......

اور خدا جانے وہ کیوں چلّا اٹھا...... "میں اسے بھلانا نہیں چاہتا...... تسنیم میں اسے بھلانا نہیں چاہتا۔"

"بھلانا نہیں چاہتے؟ لیکن آپ اسے بھلا ہی کیسے سکتے ہیں......؟ ویسی لڑکیاں کبھی نہیں بھولتیں، صرف انسان زندہ رہ جاتا ہے...... یہی تو زندگی ہے......"

بہت دیر کے بعد خاموشی سے وہ ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے......

مری اور پنڈی جانے والی پہلی بس کا انجن چل رہا تھا اور پہاڑوں میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔ جب اختر اپنا سامان باندھ کر روز کاٹیج سے نکلا تو سرخ ٹین کی چھت پر ابھی صبح کی دھوپ نکلی ہی تھی اور پہلی کرنوں میں سفید اون کا گولا دھوپ سینکنے آ بیٹھا تھا۔

پتھریلی پگڈنڈی پر چلتے چلتے وہ پُل پر رک گیا۔ اردگرد رسونت اور آکھے کی جھاڑیاں پھیلی تھیں اور پل کے جنگلے پر رات کی نمی باقی تھی۔ اس نے اس جنگلے کو جھک کر بوسہ دیا...... لیکن اس بوسے میں مردہ لاش کی ہمک تھی...... اس میں برف کا لمس تھا موت کی ٹھنڈک تھی......

بس تمام کی تمام پُر ہو چکی تھی اور وہ جگہ تلاش کرتا سیٹوں میں آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر اس کی نظر بائیں جانب پڑی۔ پشت کی جانب اونچے بندھے ہوئے بال سبز سویٹر پر پھیلے ہوئے تھے اور وہ کھڑکی سے باہر ڈھلوان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس نے رسالہ گول کر کے اس کے کندھے کو چھوا تو وہ بدک کر پلٹی......

تسنیم کی آنکھیں تازہ آنسوؤں سے سرخ تھیں اور اس کی پھنک پر اب بھی ایک آنسو جھلملا رہا تھا۔

"یہاں بیٹھ جاؤں تمہارے پاس......؟"

وہ مسکرا دی...... نہایت سادگی کے ساتھ بس چل دی، لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی نہ بولا۔

تسنیم کے لچک دار ہاتھ اس کی گود میں پڑے تھے اور بار بار وہ اپنی انگلیاں الجھا رہی تھی۔

اختر نے جی میں سوچا...... یہ بھی میری طرح خوفزدہ ہے...... زندگی کی بے انصافیوں سے گھبرائی ہوئی ہے اسے ڈر لگ رہا ہے کہ پھر کہیں کچھ مل کر نہ کھو جائے...... شاید یہی ایک چیز ہے جو ہم دونوں میں مشترک ہے۔ یہی ایک جذبہ یہی ایک احساس...... سامنے مڑتی گھومتی سڑک نیچے وادیوں کی طرف جا رہی تھی...... مری کے پہاڑ بادلوں میں لپٹے ہوئے ایک خواب سا لگتے تھے اور ایک نئی راہ میدان کی طرف جا رہی تھی۔

بہت دیر بعد اختر نے آہستہ سے کہا: "تسنیم لاہور میں مجھ سے ملو گی نا؟"......

تسنیم نے بغیر اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا: "جی اگر آپ چاہیں گے تو......!"